Nov - Dec 2022

خصوصی اشاعت
ماہنامہ
پیام عرفات
رائے بریلی

ذکرِ محمود

مجموعۂ مضامین بیادِ مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ

مرکز الإمام أبی الحسن الندوي
دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ پیام عرفات رائے بریلی

خصوصی اشاعت

ذکرِ محمود

جلد: ۱۴ — نومبر–دسمبر ۲۰۲۲ء/ ربیع الثانی–جمادی الاول ۱۴۴۴ھ — شمارہ: ۱۱–۱۲

سرپرست: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہٗ (صدر، دارعرفات)

ذکر الٰہی کے فوائد وثمرات

”اللہ کی یاد وہ دولت ہے جس کے آگے ساری دولتیں ہیچ ہیں، جسے یہ دولت مل جاتی ہے پھر وہ کسی اور دولت کا حریص نہیں ہوتا، اس کا صحیح حق تو ادا ہی نہیں ہوسکتا، سانسیں اس کے تابع ہوجائیں، دل کی حرکتیں اسی کے مطابق ہونے لگیں اور جسم کا رواں رواں اسی میں مست ہوجائے، دماغ پر وہی چیز طاری ہوجائے، ہاتھ پیر اسی کے موافق چلنے لگیں، نگاہیں اسی حساب سے پڑنے لگیں، زبان اسی میں تر ہوجائے۔ زبان کی تراوٹ سے پورا جسم جنبش میں آتا ہے، اس کا اثر پورے جسم پر پڑتا ہے، ہومیو پتھ دوا زبان پر رکھی جاتی ہے اور بڑے سے بڑے مرض کا علاج کردیتی ہے، اسی طرح جب زبان اللہ کے ذکر سے تر ہوتی ہے تو بڑے سے بڑے گناہ کے ازالہ اور معافی کا سبب بن جاتی ہے۔“

— مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کراکر دفتر ”پیام عرفات“ مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

E-Mail: markazulimam@gmail.com

Special Issue: Rs. 350/-

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

خصوصی اشاعت

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

ذکرِ محمود

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست

دعائیہ کلمات..۱۲
..........مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
اے خدا! محمود کو تو حامد و محمود کر...............................۱۳
..........حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ
شان خط..۱۶
چند سوانحی جھلکیاں ۱۷
..........مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ
عزیزی مولوی سید محمود حسن حسنی ندویؒ ۲۲
..........حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
خانوادۂ حسنی کا ایک گراں مایہ فرد...............................۲۶
..........مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی مدظلہ العالی
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ۳۱
..........مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی

سلسلہ علم و عرفان کی روایات کے امین ۳۵
.... مولانا مفتی ابو القاسم نعمانی دامت برکاتہم
خاطرات شیریں ۳۶
.... مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری مدظلہ
خانوادۂ حسنی کا گل سر سبد ۳۸
.... مولانا عبد العلیم فاروقی
تعزیتی مکتوب ۴۲
.... مولانا محمد سعد صاحب کاندھلوی
ایک صالح و باکمال شخصیت کی وفات ۴۶
.... مولانا عبد الستار مفتاحی بوڑیوی
ایک علم دوست ہستی کی رحلت ۴۸
.... مولانا احمد بزرگ صاحب
فقید المثال داعی و مصنف ۵۲
.... مولانا محمد شریف صاحب بارہ بنکوی
مولوی محمود حسنی چل بسے ۵۶
.... مولانا سید ہاشم نظام الدین بھٹکلی ندوی
ایک منفرد اور ممتاز شخصیت ۵۸
.... ڈاکٹر سلیم الرحمن خان ندوی
عصر حاضر کے جواں سال بزرگ ۶۱
.... ڈاکٹر خلیل الدین شجاع الدین تماندار

محمود صفات شخصیت ۶۷
.... پروفیسر محسن عثمانی ندوی
آزادِ غبارِ آرزو ۷۲
.... مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را ۷۸
.... ڈاکٹر محمد اکرم ندوی
مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی اور علمائے امت کی سوانح نگاری................ ۸۳
.... ڈاکٹر ولی الدین ندوی
نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا.. ۸۹
.... مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی
مولانا محمود حسن حسنی ندوی اور سوانحی ادب ۱۰۰
.... مولانا وزیر احمد اعظمی ندوی
ممتاز عالم دین.. ۱۱۰
.... مولانا آفتاب ندوی
سید محمود حسنی آہ سوئے خلد رفت ۱۱۴
.... مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی
خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود ۱۱۵
.... بلال عبد الحی حسنی ندوی
با کردار شخصیت ۱۲۶
.... مولانا عبد المتین منیری بھٹکلی

آئینہ ذات وصفات ۱۳۱
.... مولانا ضیاء الدین قاسمی ندوی
ایک سورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اٹھا ۱۳۹
.... ڈاکٹر تابش مہدی
ایک صوفی صفت انسان ۱۴۷
.... مولانا محمد وسیم صدیقی ندوی
رفیق محترم مولانا محمود حسنی - چند یادیں ۱۵۰
.... مفتی راشد حسین ندوی
خانوادۂ حسنی کا ایک چراغ بجھ گیا ۱۵۴
.... مولانا محمد ناصر سعید اکرمی
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر ۱۶۶
.... مولانا بدیع الزماں ندوی قاسمی
خوشبوان کی یادوں کی ۱۶۹
.... مولانا رضوان احمد ندوی
مردِ قلندر ۱۷۳
.... مولانا سعود الحسن ندوی
دنیائے علم واخلاق کا ایک بڑا حادثہ ۱۸۰
.... مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی
مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کی چند نوازشات ۱۸۴
.... مولانا عبدالسلام خطیب بھٹکلی ندوی

ایک چراغ اور بجھا ۱۸۹

.... مولانا محمد نصر اللہ ندوی

علم وتحقیق کا ماہتاب ۱۹۲

.... ڈاکٹر عبید الرحمن ندوی

درویش خدامست ۱۹۸

.... مولانا محمد سمعان خلیفہ ندوی

میرے ہم دم وہم راز ۲۰۰

.... مولانا طارق شفیق ندوی

پیکر اخلاص وعمل ۲۰۳

.... مولانا سید ہاشم نظام الدین ندوی

میرے ایک مخلص دوست ۲۱۰

.... مولانا عبید اللہ اسحاقی ندوی

ایک خادم دین وعلم نہ رہا ۲۱۴

.... ڈاکٹر محمد وقار الدین لطیفی ندوی

جسے آشناؤں کا پاس تھا وہ وفا شعار چلا گیا ۲۲۰

.... مولانا ناصر الدین مظاہری

ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں ۲۲۴

.... ڈاکٹر آصف لئیق ندوی

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے ۲۲۶

.... مولانا نیاز احمد سجاد ندوی

دل سے خیال اُن کا بھلایا نہ جائے گا ۲۳۰
.... مفتی محمد جابر بن عمر پالن پوری
قافلۂ علم الٰہی کا مسافر ۲۴۵
.... مولانا محمد سمعان خلیفہ ندوی
ضمیر پاک ونگاہ بلند ومستی شوق ۲۴۹
.... مولانا محمد اعظم ندوی
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل ۲۵۷
.... مولانا عبدالباری فاروقی
ایک محسن کی یاد میں ۲۵۹
.... مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی
جہد مسلسل اور عمل پیہم کی حامل عظیم شخصیت ۲۶۹
.... مولانا محمد کلام الدین ندوی
سانحہ ارتحال ۲۷۷
.... مولانا خطیب الرحمٰن ندوی
کیوں نہ یاد آئے مجھے رہ رہ کر شفقت تیری ۲۸۱
.... مولانا یحییٰ وحید ندوی
ایسا کہاں سے لائیں کہ تم سا کہیں جسے ۲۸۸
.... مولانا محمد صغیر ندوی
خراج عقیدت ۲۹۰
.... مولانا محمد زاہد حسین زاہدؔ ندوی

سوانحی ادب کا خورشید جہاں تاب ۲۹۲
........................مولانا فتح محمد ندوی
بلند اوصاف شخصیت ۲۹۸
........................مولانا محمد یوسف بیگ ندوی قاسمی
میکدہ سے اٹھ گیا وہ ساقی مینا بدوش ۳۰۰
........................مولانا محمد طاہر ندوی
حق مغفرت کرے عجب مرد آزاد تھا ۳۰۵
.... مولانا ابو صالح ندوی
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم ۳۱۰
........................مولانا محمد فصیح الدین ندوی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا ۳۱۵
........................مولانا محمد عمر عابدین
گلستان دین کے برگ وثمر محمود تھے ۳۱۸
........................حیدر میواتی ندوی
جانے کیوں اک خیال سا آیا ۳۲۰
........................مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی
چمنستان حسنی کا ایک چہکتا بلبل ۳۲۷
........................مولانا محمد عمران صدیق
ایک گمنام مگر بلند مقام ولی ۳۳۰
........................مولانا طالب بشیر ندوی

مولانا مرحوم اپنے شاگردوں کی نظر میں ۳۳۲
...........مولانا محمد زاہد حسین ندوی
خانوادۂ علم اللہ کی ایک گراں مایہ شخصیت ۳۴۶
...........مولانا محمد سلمان ندوی بجنوری
قصیدہ ان کی یادوں کا ۳۶۱
...........مولانا مبین احمد اعظمی ندوی
خانوادۂ حسنی کی روایتوں کا محافظ ۳۶۳
...........مولانا سید محمد ریاض ندوی ک□جناوری
علم ودانش کا ایک روشن تارہ جو غروب ہو گیا ۳۶۸
...........ڈاکٹر غیاث الاسلام صدیقی ندوی
بزرگی بعقل است نہ بسال ۳۹۳
...........مولانا شاہ ارشد علی ندوی
گوہر آب دار ۳۹۸
...........مولانا عبدالہادی ندوی
خانوادۂ حسنی کے بدر منیر ۴۰۲
...........مولانا منہاج الدین ندوی
حادثہ دل دوز ہے مغموم قلب ناتواں ۴۰۶
...........سید ابوالحسن علی حسنی
ہمارے بھائی صاحب-اپنی خصوصیات کے آئینے میں ۴۰۸
...........مولانا مسعود حسن حسنی ندوی

محمود بھائی - چند یادیں چند باتیں ۴۲۵
.... سید محمد مکی حسنی ندوی
بھائی صاحب کی شخصیت کے امتیازی پہلو ۴۳۱
.... مولانا سید منصور حسن حسنی ندوی
بھائی صاحب مشاہدات کے آئینہ میں ۴۴۳
.... خلیل احمد حسنی ندوی
بھائی صاحب امتیازات وخصوصیات کے آئینہ میں ۴۵۶
.... مولانا سید رشید احمد حسنی ندوی
بھائی صاحب - مشاہدات وتاثرات ۴۶۶
.... محمد امین حسنی ندوی
ہمارے بھائی صاحب! ۴۷۱
.... سید عبد العلی حسنی ندوی
ماموں صاحبؒ - کچھ مشاہدات، کچھ یادیں ۴۷۴
.... ابوالحسن علی فاروقی
پاؤ گے نغمہ ریز چمن در چمن مجھے ۴۷۸
.... محمد نجم الدین ندوی
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں ۴۸۸
.... محمد ارمغان بدایونی ندوی
نقوش تاباں ۴۹۳
.... محمد نفیس خاں ندوی
تعزیت نامے ۵۱۳

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دعائیہ کلمات

از: مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

''کتاب [کاروان زندگی] کی تصنیف وطباعت واشاعت میں جن احباب ومعاونین نے مدد کی، مصنف ان سب کا شکر گذار ہے۔ جہاں تک اس جلد (کاروان زندگی جلد ہفتم) کا تعلق ہے، عزیز القدر سید محمود حسن حسنی ندوی سلمہ کے لیے خاص طور پر دعا گو ہے، جنہوں نے اس کتاب کی تصحیح، نگرانی وتاکید میں مدد کی۔'' ''بَارَكَ اللهُ فِيهِ وَوَفَّقَهُ لِمَا يُحِبُّ وَيَرْضَى''

(کاروان زندگی: ۷/۷)

اے خدا! محمود کو تو حامد و محمود کر

نتیجہ فکر:- حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ

اے خدا! محمود پر تو فضل کر انعام کر
اے خدا! محمود پر تو رحم صبح وشام کر

اے خدا! محمود کو دے زندگی تابندگی
اے خدا! محمود کو دے ہر نفس فرخندگی

اے خدا! محمود کو تو صحت وایمان دے
اے خدا! محمود کو تو علم دے عرفان دے

اے خدا! محمود کو دے عقل وتدبیر وعمل
اے خدا! محمود کو کر صاحب علم وعمل

اے خدا! محمود کو کر خندہ رو شیریں سخن
اے خدا! محمود کو دے مرد حق کا بانکپن

اے خدا! محمود کو تو صاحب ایمان کر
اے خدا! محمود کو تو حافظ ایمان کر

اے خدا! محمود کو دے دین و دنیا کا جمال
اے خدا! محمود کو کر صاحب اقبال و مال

اے خدا! محمود پر تو بارش انوار کر
اے خدا! محمود کو حق کا علم بردار کر

اے خدا! محمود کو اللہ کی تلوار کر
اے خدا! محمود سے آتش کدے گلزار کر

اے خدا! محمود کو کر تو گل رشک چمن
اے خدا! محمود کو کر فخر دیں فخر وطن

اے خدا! محمود ہو باد نسیم گلستاں
اے خدا! محمود سے آئے بہار بے خزاں

اے خدا! محمود کو دے حسن دیں حسن شیم
اے خدا! محمود کو کر اہل دیں میں محترم

اے خدا! محمود کو دے حسن رو حسن سیر
اے خدا! محمود ہو میخانہ اہل نظر

اے خدا! محمود کو کر خوش نصیب و کامراں
اے خدا! محمود کو رکھ ہر نفس تو شادماں

اے خدا! محمود ہو روح گلستان حسن
اے خدا! محمود سے مہکے امامہ کا چمن

اے خدا! محمود کو کر راحت جان پدر
اے خدا! محمود اپنی ماں کا ہو نور نظر

اے خدا! محمود پر ماں باپ کا سایہ رہے
اے خدا! گھر پہ گراں مایہ رہے

اے خدا! محمود سے مسلم کا دل ہو باغ باغ
اے خدا! محمود ہو اسلاف کا چشم و چراغ

اے خدا! محمود کو مرد حق آگاہ کر
اے خدا! محمود کو تابندہ مہر وماہ کر

اے خدا! محمود کو تو صاحب احوال کر
اے خدا! محمود کو تو صاحب اموال کر

اے خدا! محمود پر انعام لامحدود کر
اے خدا! محمود کو تو حامد ومحمود کر

شانِ خط

مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ

یہ میری خوش نصیبی رہی ہے کہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی
نسبت تعلق عالم اسلام کی ممتاز شخصیات و مفکرین و مصنفین و شیوخ، علماء و مرشد
اور مشائخ طریقت کی توجہ حاصل ہوئی، ان میں ایک ممتاز شخصیت سابق وزیر حج جنرل
[illegible] یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر خلیق احمد نظامی کی بھی ہے جن کا نسخہ ان کی کتب کا یہ
کسی ادارے کے کتب خانے سے گزر نہیں ہے میں نے پیش کیا، نوادر مخطوطات کے
رسالہ کی زینت میں وہ بھی دیکھا، ان کے مطالعے و تحقیق کا انداز کتب خانہ ندوۃ العلماء
موسوم بہ شبلی نعمانی لائبریری میں بھی دیکھا اور ایسا تو پہلا اور جب پڑھنے لگے تو
مجھے شعور ہوا تو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذاتی لائبریری میں ابتدائی میں
ان کی مشہور کتاب تاریخ مشائخ چشت مطبوعہ ندوۃ المصنفین
نئی دہلی دیکھی جس کا بڑا چرچا علمی و دینی حلقوں میں بڑی پذیرائی تھی اور حضرت
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی پسندیدہ کتابوں میں ایک تھی تاریخ بار بار پڑھی اور
بار بار لطف علمی تحقیق کی چاشنی تھی، اور ان کی راہ سے کچھ شناسائی بھی ہو گیا۔
لطیفہ کے طور پر یہ ذکر بھی میں ضرور پیش سمجھتا ہوں کہ ان سے ایسی رواداری کا [illegible]
ہو گئی کہ وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو خط لکھتے تو ایک میں میرے حوالے
دیتے کہ ان کے ذریعہ معلوم ہوا اور وہ بات لکھی، تو حضرت اس خط کو بھی لکھیں
میں ملاحظہ فرما رہے تھے فرمانے لگے محمود بھی وسیع التعلقات ہو گئے، میں نے
پھر جیسا کہ تشریح کر دی کہ یہیں تو حیرت طلب ایک بات ہے یہ جیز اثر انداز ہو
عالم اسلام کی کے مصنفین و مفکرین و مشاہیر کی فہرست کے مختصر فہرست بھی بنا کا ہے
تو علامہ یوسف القرضاوی عمدہ علم، حکمت، کثرت تصانیف جوش و جولاں
صحافت، فصاحت، بلاغت، تحقیق میں سر فہرست ہیں، ستمبر ۱۹۷۶ء کی
دوسری سہ ماہی ہے اور تمام عرصہ سے دوحہ قطر میں ہیں، دارالسلام ۱۹۸۰ء
۱۹۸۳ء، ۱۹۹۶ء میں آئے اور آخری ایک ہفتہ تھا، ان کی کتاب انہیں اتنی
پسند ہو گئی تھی کہ ان کی ایک کتاب مجھے اس کے درست رفیق مولانا وحید احمد ندوی
کو مشورہ دی کہ ترجمہ اردو میں کر کے اور کیا آدھی آدھی کر کے ناشر کو عرض کیا ایک
عکس رکھے گا اور ایک اصل رکھے گا جو اصل رکھے گا وہ عکس کی قیمت ادا
کرے گا، مولانا وحید احمد ندوی نے اصل رکھی اور عکس لاکر مجھ کو دیا اس پر
دیکھئے قرضاوی ... (میں نے فرزند حسین جیسے الفاظ رکھ کر دعائیہ کلمات لکھے تھے۔

چند سوانحی جھلکیاں

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ نے ۵۱ رسال کی عمر پائی، تصنیف وتالیف اور ذکر وشغل سے انہیں طبعی دلچسپی تھی، بزرگوں کی خدمت اوران کی شفقتیں حاصل کرنا ان کی طبیعت میں شامل تھا اور متعدد مشائخ وقت سے ان کو اجازت بیعت وارشاد بھی حاصل تھی۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے خانوادہ کی نانیہالی وداد یہالی دونوں نسبتیں عطا کی تھیں، نامور شاعر اسلام حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ ان کے نانا تھے، جو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے خلیفہ ومجاز بیعت اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہ کے رشتہ میں بھانجے تھے۔

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کے دادا الحاج سید محمد مسلم حسنی مرحوم تھے، جو مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ کے بڑے داماد تھے اور حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی خالہ زاد بہن کے بیٹے تھے۔ الحاج سید محمد مسلم صاحب کے مقام ومرتبہ کا کچھ اندازہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ کے اس جملہ سے لگایا جاسکتا ہے، جو انہوں نے فرمایا تھا کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں ان کی حاضری ہوگی تو بڑے بڑے اولیاء اللہ ان پر رشک کر رہے ہوں گے۔

ولادت

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کی ولادت لکھنؤ میں ۲۸ / جمادیٰ الاولیٰ ۱۳۹۱ھ – ۲۲ / جولائی ۱۹۷۱ء کو ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ کے مکان میں ہوئی، ساتویں دن عقیقہ کی سنت ادا ہوئی اور حضرت شیخ الہند کے نام کی مناسبت سے ''محمود حسن'' نام رکھا گیا، چار سال کی عمر میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بسم اللہ کرائی اور سات سال کی عمر میں حضرت مولاناؒ نے ہی ناظرۂ قرآن مجید کی تکمیل پر دعا کرائی۔

تعلیم اور بیعت

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ نے ۱۴۱۰ھ میں دار العلوم ندوۃ العلماء سے عالمیت اور ۱۴۱۲ھ میں حدیث میں فضیلت کی اور اسی سال رمضان المبارک کے مہینہ میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے ہاتھ پر بیعت بھی کی، حضرت مولاناؒ نے ان کو چاروں سلسلوں (چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ) اور بالخصوص حضرت سید احمد شہید کے طریقہ محمدیہ میں داخل سلسلہ فرمایا اور تسبیحات تلقین کیں، پھر تدریجاً ذکر نفی واثبات اور ذکر اسم ذات تلقین فرمایا، مولانا مرحوم ہی کا بیان ہے کہ حضرت مولاناؒ نے ازراہِ شفقت ایک مرتبہ اپنی موجودگی وسرپرستی میں مسجد دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں میں ذکر کی ایک مجلس بھی انہی سے کرائی۔

اجازت بیعت وارشاد

۱۴۳۱ھ میں رائے پوری سلسلہ کے عظیم المرتبت شیخ حضرت سید شاہ نفیس الحسینی لاہوریؒ نے لاہور کے ایک سفر میں مولانا محمود حسن حسنی مرحوم کو چاروں سلسلوں اور خصوصاً حضرت سید احمد شہید کے سلسلہ میں اجازت بیعت سے سرفراز فرمایا۔

• ١٤٣٠ھ میں مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی نے تحریری طور پر مولانا مرحوم کو اجازتِ بیعت دی۔

١٤٣٣ھ میں مولانا محمود حسنی ندوی مرحوم کا جب حضرت مولانا دامت برکاتہم کے ساتھ سفرِ حجاز ہوا، تو وہاں انہیں حضرت مولانا دامت برکاتہم سے مطاف میں ملتزم کی سمت تجدید بیعت کا شرف بھی حاصل ہوا۔

• ١٤٤٠ھ میں حرم مکی میں مقیم سلسلہ تھانوی کے بڑے بزرگ حضرۃ الحاج انجینئر عبدالمنان صاحب پشاوری مدظلہ نے مولانا محمود حسنی مرحوم کو تحریری طور پر بیعت وارشاد کا اجازت نامہ ارسال کیا، جس کو انہوں نے اپنے پیرو مرشد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کی اجازت سے قبول کیا۔

مولانا محمد یونس جونپوریؒ کی عنایات

مولانا محمود حسنی ندویؒ کو بفضلہٖ تعالیٰ محدث عصر حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ کی شفقت پہلی زیارت وملاقات سے ہی حاصل رہی، ان کی دعائیں وتوجہات، ہدایات ونصائح سے فائدہ اٹھانے کی توفیق بھی ملتی رہی، وہ کہتے ہیں: ''خط اور خواب کے ذریعہ اور ان کی قوتِ کشف وادراک سے بھی میری تعلیم وتربیت ہوتی رہی۔''

حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ کی مولانا مرحوم پر عنایات خوب تھیں، مولانا کہتے ہیں کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کبھی مجھے عطر کا ہدیہ دیتے، کبھی کھجوریں اور آب زمزم کا تبرک دیتے، ایک مرتبہ بڑی شفقت کے ساتھ قلم عنایت فرمایا، ایک بار ایک ہزار روپئے کی رقم یہ کہہ کر عنایت فرمائی کہ اس کو کتابوں کی اشاعت کے کام میں لانا، ایک موقع پر اپنی استعمال شدہ لنگی بھی عنایت کی اور ایک بار شفقت کا یہ انداز بھی سامنے آیا کہ اپنی گود میں لے کر بیٹھے، خوب ہاتھ پھیرا اور دعائیں دیں۔

اجازت حدیث شریف

۱۴۱۲ھ مطابق ۱۹۹۲ء میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے سامنے ایک مجلس میں مولانا محمود حسنی ندویؒ نے صحاح ستہ اور مؤطا امام مالک و مسند امام احمد کے اوائل پڑھے اور اجازتِ حدیث حاصل کی۔

۲۶/ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ کو حرم مدنی میں مسجد نبوی کے پیچھے ایک فندق میں محدث عصر حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ سے مولانا محمود حسنی مرحوم نے حدیث شریف کی سند حاصل کی، اس موقع پر حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی مرحوم اور مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ بھی ساتھ تھے، مولانا کا بیان ہے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحبؒ نے ہمیں اجازت حدیث دیتے ہوئے خاص والہانہ کیفیت سے حدیث پاک سنائی، اپنی سند کا ذکر کیا اور اسم ذات کا نعرہ بلند فرمایا۔

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کو ہند و بیرون ہند کے دیگر جلیل القدر مشائخ حدیث سے بھی اجازت حدیث حاصل تھی، جن کے نام حسب ذیل ہیں:

☆ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ
☆ مولانا محمد برہان الدین سنبھلی مرحوم
☆ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ
☆ مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مدظلہ
☆ مولانا محمد عاقل سہارنپوری مدظلہ
☆ مولانا احمد شفیع صاحب ہزاروی (بنگلہ دیش)
☆ مولانا عبدالحلیم چشتی مدظلہ (کراچی)

اساتذۂ حدیث

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں جن اساتذہ کرام کے سامنے حدیث شریف پڑھنے کے لیے زانوئے تلمذ تہ کیا، ان کی بھی ایک مختصر فہرست درج ذیل ہے:

☆حضرت مولانا ناصر علی ندوی مرحوم

(بخاری شریف)

☆حضرت مولانا شہباز احمد اصلاحی مرحوم

(مسلم جلد ثانی، وابواب ابن ماجہ ونسائی، وموطا امام مالک)

☆حضرت مولانا محمد زکریا سنبھلی مدظلہ (ترمذی شریف)

☆حضرت مولانا سلمان حسینی ندوی صاحب

(ابواب ترمذی، ومشکوۃ جلد اول، وکتاب الایمان مسلم شریف)

☆حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ (مشکوۃ جلد ثانی وآخر جلد اول)

☆حضرت مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری مدظلہ (مسلم شریف جلد اول)

☆حضرت مولانا محمد برہان الدین سنبھلی مرحوم

(کتاب الایمان والعلم بخاری شریف، وسنن أبوداؤد جلد اول)

☆حضرت مولانا عبدالقادر ندوی گجراتی مدظلہ (ابوداؤد شریف جلد ثانی)

☆حضرت مولانا محمد رضوان ندوی مرحوم (ریاض الصالحین)

☆حضرت مولانا مظہر کریمی ندوی مدظلہ (تہذیب الاخلاق)

☆حضرت مولانا محمد عارف ندوی مرحوم (تہذیب الاخلاق)

عزیزی مولوی سید محمود حسن حسنی ندویؒ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(ناظم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ)

عزیزی مولوی سید محمود حسن حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ۵۱ر سال کی عمر میں اس دار فانی سے دار بقا کی طرف رحلت کر گئے، گذشتہ سالوں سے انہیں کئی بیماریاں لاحق تھیں جن کا علاج جاری تھا، مگر انہیں لکھنے پڑھنے کے کاموں سے ایسا انہماک تھا کہ اپنی صحت وغیرہ کا بھی زیادہ خیال نہ رکھ سکے، بیماری بڑھتی گئی اور آخر کار وہ صاحب فراش ہوگئے، علاج ومعالجہ کی جو کوشش ہونی چاہیے اس میں کوئی کمی نہیں کی گئی، ہندوستان کے مشہور اسپتالوں میں وہ زیر علاج رہے، چنڈی گڑھ کا علاج بھی چلا، پھر وفات سے چند روز قبل لکھنؤ کے میٹرو سٹی ہسپتال میں داخل کرائے گئے، لیکن موت وحیات کا جو وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں مقدر ہے اس سے آگے پیچھے نہیں ہوسکتا، چاہے بیماری ہو یا نہ ہو، چنانچہ وہ ۱۲ر اگست ۲۰۲۲ء کو جمعہ کے دن اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔اناللہ وانا الیہ راجعون!

عزیز مرحوم کی یہ عمر تقریباً ان کے نامور نانا مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کی عمر کے مطابق رہی، عمریں اللہ کی طرف سے مقرر ہوتی ہیں اور وہ جس سے جتنا کام لینا چاہتا

ہے، اسی کے مطابق اس کو عمر دیتا ہے، اس لحاظ سے گرچہ عزیزی محمود کی عمر عمومی عمروں کے مقابلہ میں کم ہوئی، لیکن انہوں نے اپنی کم عمری کے باوجود جو اہم کام انجام دیے ان کاموں کو دیکھا جائے تو یقیناً وہ بھی بڑی شخصیتوں میں شمار کیے جائیں گے۔

ان کی خصوصیات میں یہ بات کھلے طریقہ سے نظر آتی ہے کہ علوم دینیہ کی خدمت کے ساتھ جو انہوں نے درس وتدریس کے طور پر انجام دی، انہوں نے تصنیف وتالیف کے میدان میں بڑے اہم کام کیے، بزرگان دین کی سیر وسوانح لکھنا ان کا خاص ذوق تھا، ان کی وفات کو انہی خصوصیات کی بنا پر اہل علم وفضل کے مختلف حلقوں میں محسوس کیا گیا اور مذکورہ کاموں میں خسارہ واقع ہونے کا احساس ہوا، بلاشبہ میرے لیے بھی یہ ایک بڑا خاندانی حادثہ ہے۔

عزیزی محمود حسنی کا نشو ونما اپنے دادیہالی اور نانیہالی سرپرستوں کی خصوصی توجہ اور شفقت کے ساتھ علمی اور دعوتی ماحول میں ہوا، ان کے دادا سید مسلم حسنیؒ تھے اور ان کے والد سید حسن حسنیؒ تھے جو مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ کے حقیقی نواسے تھے، بڑے غریب پرور، نیک، دین دار، خوش اخلاق، سادگی پسند اور اعلیٰ اوصاف وکردار کے حامل تھے۔ ان کی والدہ سیدہ امامہ حسنی مرحومہ کو دنیاوی منافع پر دینی فلاح وصلاح کو ترجیح دینے کا جو خاندانی طریقہ ورثہ میں ملا تھا، انہوں نے اسی نہج پر اپنے بچوں کو بھی تعلیم وتربیت دی۔ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کے وہ نواسے تھے اور پوتے بھی، مرحوم کو ان کی توجہات اور دعائیں ہمیشہ حاصل رہیں۔ وہ رشتہ میں میرے بھی نواسے تھے اور حضرت مولاناؒ کی وفات کے بعد سے ان کا تعلق مجھ سے مزید بڑھ گیا تھا۔ دار العلوم ندوۃ العلماء میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی میں درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے اور ساتھ ہی ادارہ دار عرفات سے بھی متعلق ہوگئے، جہاں اداروں کے ذمہ داروں نے انہیں تصنیف وتالیف کے اہم کام

سپرد کیے اور وہاں انہوں نے اچھی صلاحیت کا ثبوت دیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مرحوم کو ایمان ویقین، خدمتِ دین، تصنیف وتالیف کی خصوصیات سے نوازا تھا، ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے بڑوں کے مشورہ سے ہر کام شروع کیا، الحمد للہ انہیں اپنی معلومات پیش کرنے کا بڑا سلیقہ تھا، وہ بہت احتیاط وتحقیق سے تصنیفی مواد اکٹھا کرتے تھے، تاریخ کے موضوع پر ''تاریخ اصلاح وتربیت'' کے عنوان سے انہوں نے بڑی اہم کتاب لکھی، جس میں تاریخ اسلام کے مختلف ادوار کی شخصیتوں میں مرکزی شخصیتوں کو نمونہ کے طور پر لیا اور ان کے اصلاح وتربیت کے منہج کو پیش کیا، اس طرح انہوں نے ایک تسلسل دکھانے کی کوشش کی کہ اسلام کا درخت اپنے موسم میں برابر پھل دیتا رہا ہے، اس تاریخی کام میں انہوں نے حضرت مولاناؒ کی فکر وتصنیفات سے خصوصی طور پر فائدہ اٹھایا ہے۔

بزرگان دین سے ربط وتعلق اور ان کی خدمت میں حاضری کا انہیں بہت شوق تھا، محی السنہ حضرت مولانا ابرار الحق حقی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں وہ کئی بار میرے ساتھ حاضر ہوئے اور میرے بغیر بھی حاضر ہوئے، ان کے علاوہ بھی مشائخ عصر سے ان کا گہرا تعلق رہا ہے، وہ بزرگوں کی شخصیت اور خصوصیات اور اصلاح وارشاد کے سلسلہ میں ان کے طریقہ کار اور ان کے معمولات جاننے کی دلچسپی رکھتے تھے اور ان کو سمجھنے کا اہتمام کرتے تھے، پھر ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنے مشاہدات وتجربات کے ذریعہ ان عظیم شخصیات کا تعارف کرائیں، تاکہ اس طرح اس شخصیت کی وفات کے بعد مختلف پہلو زیادہ بہتر طریقہ سے سامنے آسکیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم سے کئی اصحابِ فضل وکمال اور اہل علم ودین شخصیات پر کتابیں منظر عام پر آئیں اور پسند کی گئیں، انہیں یہ جذبہ اور حوصلہ اپنے نانا اور میرے بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ

سے کسی حد تک موروثی طور پر بھی ملا تھا، جو انہیں اپنے نانا حضرت مولانا سید عبد الحی حسنیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) - والد ماجد حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ - سے تذکرہ وسوانح نگاری اور تاریخ نویسی کا ملا تھا۔

مجھے ان کا علمی و عملی دونوں پہلوؤں میں خاصا تعاون حاصل رہا، لکھنے کے لیے حوالوں کو جمع کرنے میں مجھے ان سے بڑی مدد ملتی اور وہ کدوکاوش کا بھرپور ثبوت دیتے، مضامین کی ترتیب وتنسیق کے کام میں بھی ان کی خاصی مدد حاصل رہتی تھی، جس کے سبب میرے لیے ذاتی طور پر یہ سانحہ بہت رنج دہ ہے، لیکن "للہ ما أعطی و له ما أخذ، و کل شئ عنده لأجل مسمی" (اللہ نے جو دیا وہ بھی اللہ کا ہے اور جو واپس لیا وہ بھی اسی کا ہے اور اس کے یہاں سے ہر شے کی مدت مقرر ہے۔)

اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، اپنے قرب خاص میں جگہ عطا کرے، رفع درجات کے انعامات سے بیش از بیش نوازے اور ان کی نیکیوں کا اضعافاً مضاعفہ صلہ عطا فرمائے اور لغزشوں کو معاف کرے۔ آمین!

خانوادۂ حسنی کا ایک گراں مایہ فرد

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی مدظلہ العالی
(مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

اس دنیائے فانی میں انسانی وجود متنوع سرگرمیوں کا مجموعہ ہے اور انسان اپنی فعالیت اور نشاط کے ذریعہ اس کو عوام وخواص کی توجہ کا مرکز بنا دیتا ہے، خاص طور سے امت مسلمہ جس کو اللہ تعالیٰ نے منصب دعوت اور منصب قیادت سے سرفراز فرمایا اور اس کی رہنمائی کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا ہے، یہ حقیقت اس کائنات میں اپنا ایک تاریخی وجود رکھتی ہے، اس امت کو پوری دنیا کی اصلاح اصلاح ودعوت کے لیے برپا کیا گیا ہے اور اس کو ایسا جامع دستور دیا گیا ہے، جس کے مماثل کوئی قانون اور آئین نہیں ہوسکتا، اب امت کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کرے اور اپنے دنیا میں بھیجے جانے کے مقصد سے واقف ہو۔

بلاشبہ دنیا کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ جو عقیدہ اور نظام زندگی ملا ہے، اس کو اپنائے اور اس ذمہ داری کو اپنی بنیادی ذمہ داری تصور کرے، اللہ تعالیٰ نے سورۂ بینہ میں واضح کیا ہے:

﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاء وَيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذٰلِکَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ﴾

(البینة: ۵)

(اورانہیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اس کے لیے دین کوخالص کر کے اور تمام چیزوں سے یکسو ہو کر اور زکوٰۃ دیں اور یہی سیدھا دین ہے۔)

خانوادۂ علم اللٰہی کے عالم ومصنف مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ اسی عقیدہ اور پیغام کے حامل تھے، وہ نوجوان علماء میں اپنی ایک شان رکھتے تھے، خانوادہ علم اللٰہی کے نمایاں علماء اور مشائخ سے انہوں نے کسب فیض کیا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تربیت میں رہے اور ان سے استفادہ کیا اور انکی کتابوں کو پڑھا اور انکی فکر کو اپنے اندر منتقل کیا، حضرت مولاناؒ کے بعد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے معاون علمی کے طور پر کام کرتے رہے اور اسی کے ساتھ اپنے علمی اور تصنیفی کام کو بھی آگے بڑھاتے رہے، یہاں تک کہ متعدد موضوعات پر ان کی کئی کتابیں آگئیں۔

مرحوم محمود حسنی ندوی کا تعلق حضرت سید احمد شہیدؒ کے خانوادہ سے تھا، حضرت سید احمد شہید کے مجاہدات اور کارناموں سے وہ واقف تھے، حضرت سید احمد شہید نے ایمان ویقین کی باد بہاری چلادی، ان کے ذریعہ متروک فریضہ حج زندہ ہوا، جہاد وشوق شہادت کا جذبہ لوگوں میں پیدا ہوا، انہوں نے خود اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کردی، لیکن اپنے پیچھے خلفاء اور مشائخ کی بڑی تعداد چھوڑی، جو ان کے مشن کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے، یہی وجہ ہے کہ بعض علماء کی زبانی سنا گیا کہ ہم حضرت سید احمد شہید کی تجدید کے سایہ میں جی رہے ہیں، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی

ندویؒ نے ان کی دعوت، فکر اور عمل کو اپنے اندر منتقل کیا اور ان کی سوانح پر ایک جامع کتاب دو جلدوں میں لکھی جو "سیرت حضرت سید احمد شہید" کے نام سے ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے پوری زندگی اسی مشن اور دعوت کو زندہ رکھا، جو انہوں نے اپنے بزرگوں سے لیا تھا، وہ عام علماء اور دعاۃ کی طرح نہیں تھے، بلکہ مجددین کی فہرست میں شامل ہیں، انہوں نے معرکۃ الآراء کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" لکھ کر عالم اسلام میں ایک انقلاب برپا کیا اور مسلمانوں کو ایک زندہ اور متحرک قوم کی حیثیت سے پیش کیا اور ان کے اوپر چھائی ہوئی کمزوری کو دور کیا، بلاشبہ عالم اسلام کی تحریکات پر اس کتاب کا اثر پڑا اور وہ بعض تحریکات کے نصاب میں شامل ہوئی۔

مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ اسی سنہری تاریخ کی ایک کڑی تھے، انہوں نے اپنے اسلاف کے کارناموں کا تذکرہ اپنے گھر میں سنا بھی تھا اور کتابوں میں پڑھا بھی تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کو اس پوری تاریخ کا استحضار تھا، وہ کھلی کتاب کی طرح اس سے واقف تھے، ان کے اسی کمال فن کی وجہ سے حضرت مولانا عبداللہ عباس ندویؒ نے ان کو پندرہ روزہ تعمیر حیات ندوۃ العلماء کا معاون مدیر بنایا، وہ ایک اچھے قلم کار، کامیاب مصنف اور کہنہ مشق صحافی تھے، مولانا کی ولادت ۲۲/جولائی ۱۹۷۱ء کو لکھنؤ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم انہوں نے ندوۃ العلماء کے ایک مکتب میں حاصل کی، ابتدائی عربی درجات مدرسہ ضیاء العلوم-رائے بریلی میں حاصل کرنے کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور ثانویہ اور عالیہ کی تکمیل کی اور حدیث شریف میں تخصص کیا، ۱۹۹۲ء میں سند فراغت حاصل کی اور ایک سال مزید دعوہ وفکر اسلامی میں ڈپلومہ کیا، اس کے بعد مدرسہ ضیاء العلوم میں تدریسی عمل سے وابستہ ہو گئے اور دار عرفات

رائے بریلی میں تحقیق وتصنیف سے بھی ان کی وابستگی رہی۔

مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کی خصوصی تربیت میں تھے، ان کے اسفار کی روداد ''رفتار کارواں'' کے نام سے قسطوں میں تعمیر حیات میں شائع کی، لاک ڈاؤن کے زمانہ میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی آپ بیتی بڑے اچھے انداز میں مرتب کی جو ''اوراق زندگی'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

۲۰۰۱ء میں پندرہ روزہ تعمیر حیات کے باضابطہ معاون مدیر منتخب کیے گئے، کچھ سالوں کے بعد نائب مدیر مقرر کیے گئے، انہوں نے قیمتی مضامین اور مقالات سپرد قلم کیے، جو عوام وخواص کے لیے استفادہ کا ذریعہ ہے، ان کی تصنیفات میں تاریخ اصلاح وتربیت (دو جلدیں)، سوانح حضرت مولانا ابرار الحق، ایک فرشتہ صفت انسان، حیات عبدالباری، سوانح مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی، مولانا محمد یونس جونپوری شخصیت اور خدمات، مولانا محمد زبیر کاندھلوی وغیرہ ہیں۔

خانوادۂ علم اللہی کی کئی کتابوں کو انہوں نے ایڈٹ کیا، جو ان کی تحقیق وتعلیق سے شائع ہوئیں، جن میں میزاب رحمت، خانوادہ علم اللہی مؤلفہ مولانا سید محمد ثانی حسنی وغیرہ ہیں۔

مولانا محمود حسنی ندوی ایک سال سے بیمار تھے، کئی جگہوں سے ان کا علاج ہوا، لیکن افاقہ نہیں ہوا، آخر میں ان کو لکھنؤ کے میٹرو اسپتال میں داخل کیا گیا، میں نے اسپتال جاکر ان کی عیادت کی، طبیعت میں کچھ افاقہ کی خبریں مل رہی تھیں کہ ان کی وفات بروز جمعہ ۱۳؍اگست ۲۰۲۲ء میں ہوگئی، اسپتال سے جنازہ ندوہ لایا گیا، ندوۃ العلماء کے احاطہ میں ان کی نماز جنازہ ہوئی، جس کی امامت راقم الحروف نے کی،

ایک بڑے مجمع نے جمعہ کی نماز کے بعد ان کی نماز ادا کی اور دوسری نماز جنازہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں بعد نماز عصر ہوئی، جس کی امامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) نے کی۔

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ نے اپنے پیچھے ایک صاحبزادی اور اہلیہ اور دو بھائی: مولانا مفتی مسعود حسن حسنی ندوی، مولانا منصور حسن حسنی ندوی کو چھوڑا۔ اللہ ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

واضح رہے کہ مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ حضرت مولانا محمد ثانی حسنی (برادر اکبر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی) کے حقیقی نواسے تھے، ان کے والد سید حسن حسنی اور والدہ سیدہ امامہ حسنی کا کئی سال پہلے انتقال ہو گیا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی
(معتمد تعلیم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

حضرت مولانا محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے عزیز گرامی مولانا سید محمود حسنی ندوی جو اپنے خانوادے میں بھی محبوب اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور تعلق رکھنے والوں کے نزدیک بھی محبوبیت کی شان رکھتے تھے، اپنے اخلاص ودین داری، تقویٰ وزہد میں ممتاز تھے، اپنے خاندان کے بزرگوں کی صحبت خاص طور پر حضرت مولانا علی میاں نور اللہ مرقدہ اور حضرت مولانا محمد رابع صاحب دامت برکاتہم اوران کے بھائی مرحوم کی تربیت اور صحبت نے ان میں ایک خاص محبوبیت کی شان پیدا کردی تھی، قرآن کریم میں ہے: ﴿الا من أتی اللہ بقلب سلیم﴾ (الشعراء: ۸۹) ان کا قلب بالکل نروگا تھا، یہ سب ان کے بزرگوں کی صحبت اور نورانیت کا اثر تھا۔

وہ ندوۃ العلماء میں فضیلت اور کلیۃ الدعوہ کا کورس مکمل کرکے مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور جس کے مؤسس ان کے نانا حضرت مولانا محمد ثانی صاحب تھے، اس

میں مدرس ہو گئے تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے اندر تصنیف وتالیف کا ذوق پیدا ہو گیا تھا، تاریخی واقعات اور خاندانی معلومات پر پوری طرح وہ مطلع تھے اور اس پر سب سے بڑی دلیل ان کی وہ کتابیں ہیں جو ان کے قلم سے تصنیف میں آئیں جس میں انہوں نے اگر سیرت کی کتاب ہے تو اس میں صاحب سیرت کی زندگی کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے، اس سلسلہ میں ان کی کتاب سلاسل اربعہ، تاریخ اصلاح وتربیت اور تذکرہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ شامل ہیں۔

انہوں نے اپنے نانا مولانا محمد ثانی صاحبؒ کی سیرت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کی زندگی کی پوری تصویر قاری کے سامنے آجاتی ہے، ان کی کتاب تاریخ اصلاح وتربیت کے پہلے حصہ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس ناچیز کا یہ تاثر ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں حضرت مولانا علی میاں نور اللہ مرقدہ، حضرت مولانا محمد رابع حسنی صاحب کی تحریروں کو اور ان کی تحریر کے مزاج کو اور کیفیت کو پوری طرح جذب کر لیا ہے، خلفائے راشدین کی حیات اور عہد عثمانی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور کے اختلافات کی وہ معتدل رائے پیش کی ہے جس کو حضرت مولانا علی میاں نور اللہ مرقدہ بیان فرماتے تھے، اسی طریقہ سے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما میں سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مصالحت کر کے اپنے دعوت وتربیت اور اصلاح میں مشغول کرنے کے لیے اپنے کو فارغ کرنا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا جام شہادت نوش کرنا اور ایک ظالم وجابر طاقت کا مقابلہ کرنا اور اس میں جو اسرار وحکم ہیں وہ سب انہوں نے بیان کر دیا۔ ؎

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ان کی حیات اور اخلاق کریمانہ پر کئی مقالات آچکے ہیں، بہرحال ان کا انتقال حسنی خاندان اور خود دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لیے ایک بڑا حادثہ ہے، اس نا چیز سے وہ بہت محبت کرتے تھے اور اس ناچیز کو بھی ان سے غیر معمولی محبت تھی، لکھنؤ اور ندوہ کے قیام میں اکثر وہ جائے قیام پر آتے تھے، مرحوم اخیر میں بار بار مجھ سے یہ کہتے رہے کہ انشاء اللہ میں آپ کی سوانح لکھوں گا، لیکن مقدرات کو کوئی نہیں جانتا اور آج مجھے ان کے بارے میں تحریر لکھنی پڑ رہی ہے۔

حضرت مولانا محمد رابع صاحب دامت برکاتہم کے پروگرام وغیرہ کی تفصیلات وغیرہ سے مطلع کرتے رہتے تھے، میرا انہیں کے ذریعہ سے فون سے حضرت مولانا دامت برکاتہم سے رابطہ رہتا تھا، ان کی علالت کی خبریں سنتا رہا، اخیر میں معلوم ہوا کہ الحمد للہ طبیعت بہتر ہے، جس سے بہت خوشی ہوئی، لیکن یہ ناچیز ۱۱؍اگست کو عزیزی ڈاکٹر فریدالدین ندوی سلمہ کو لے کر ملیشیا کے سفر پر گیا تھا اور وہاں جانے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ میرے تین دن کے قیام میں تقریباً اجازت حدیث اور بخاری شریف کا تقریباً چھ محاضرہ ہے، ان میں سب سے اہم جامعہ اسلامیہ عالمیہ کی مسجد میں وہاں کے ڈائریکٹر نے یہ پروگرام رکھا تھا اور اس کا اعلان نٹ وغیرہ پر ہو چکا تھا اور ۱۲؍تاریخ کی مغرب سے پہلے مجھے وہاں جانا تھا کہ اچانک فون کے ذریعہ مولانا کے انتقال کے حادثہ کی خبر معلوم ہو کر بہت رنج ہوا، مجھے شبہ تھا کہ شاید مجھ سے بیان نہ ہو سکے، بہت ہی مشکل سے وہاں کا پروگرام میں نے مکمل کیا، اس کا سلسلہ مغرب سے عشا کی اذان تک جاری رہا، اس میں دعا کرائی اور مرحوم کے لیے ایصال ثواب کیا، اس پروگرام میں کئی حضرات ایسے ملے جو دارالعلوم ندوۃ العلماء اور حضرت مولانا کے متعلقین میں سے تھے وہ خصوصی دعا میں شریک ہوئے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ مولانا محمود حسنیؒ کو جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام میں جگہ عطا فرمائے اور حسنی خاندان اور حضرت مولانا محمد رابع صاحب دامت برکاتہم کو اس حادثہ سے جو صدمہ پہنچا ہے اس کے تحمل کی طاقت عطا فرمائے، گرچہ مرحوم کے حادثہ پر صبر وبرداشت کرنے کے لیے غیر معمولی عزیمت اور ہمت درکار ہے اور خاصان خدان کے سوا عام انسانوں کے لیے اس طرح کے حادثوں کا برداشت کرنا آسان نہیں۔ ع

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا دامت برکاتہم اور ان کے پورے گھرانے کو صبر جمیل کی قوت عطا فرمائے۔ آمین!

اخیر میں ناظرین سے مرحوم کے لیے ایصال ثواب کی درخواست کر رہا ہوں، ان شاء اللہ ہمیشہ وہ اپنے کارناموں اور کتابوں سے زندہ رہیں گے۔ ع

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

سلسلہ علم و عرفان کی روایات کے امین

مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی دامت برکاتہم
(مہتمم دارالعلوم دیوبند)

''مرکز الامام اَبی الحسن الندوی دارعرفات'' کے ماہنامہ ترجمان ''پیام عرفات'' کا معروف عالم دین مولانا محمود حسن حسنی ندوی علیہ الرحمہ کی حیات وخدمات کے تذکرہ وتعارف پر مشتمل خصوصی شمارہ کی اشاعت کرنا یقیناً یہ ایک مستحسن اقدام ہے۔

مولانا محمود حسن حسنی ندوی خاندان سادات حسنی کے ایک نمایاں فرد اور خاندانی شرافت ونجابت کے ساتھ اس سلسلہ علم وعرفان کی روایات کے امین تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بہترین علمی صلاحیتوں سے نوازا تھا، وہ بیک وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ایک ہر دل عزیز استاد تھے اور متعدد مجلّات ورسائل کی مجلس ادارت سے وابستہ رہ کر اپنے تصنیفی اور صحافتی جوہر سے ملت کو نوازتے رہے، سوانح نگاری سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ اگرچہ مولانا محمود حسن حسنی صاحب ندوی علیہ الرحمہ نے بہت لمبی عمر نہیں پائی، لیکن اپنی خدمات اور خصوصیات کی بنا پر دیر تک یاد آتے رہیں گے۔ امید ہے کہ ''پیام عرفات'' کا یہ خصوصی شمارہ مولانا مرحوم کی تابناک زندگی کے مختلف گوشوں سے قارئین کو روشناس کرانے کا ایک ذریعہ بنے گا اور کام کرنے والوں کے لیے ان کے کارنامے سفر حیات میں رہنما ثابت ہوں گے۔

خاطراتِ شیریں

مفتی احمد صاحب خانپوری مدظلہ
(سرپرست جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین-ڈابھیل)

مولانا سید محمود حسن حسنی مرحوم کی وفات سے قلق ہوا، وفات کی اطلاع ملنے پر ان کے لیے دعا وایصال ثواب کا اہتمام کیا تھا۔ موصوفؒ احقر سے قلبی تعلق رکھتے تھے،ان کے اس تعلق کی بنا پر احقر کو بھی ان سے محبت تھی۔

حضرت اقدس مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی خاندانی میراث ''بزرگوں کی سوانح'' سے انہیں خاص لگاؤ اور تعلق خاطر تھا۔ متعدد اہل علم ومرحومین کے متعلق ان کے سیال قلم سے کئی مضامین منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔

دوسال قبل جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے معین مفتیؒ مفتی عبدالقیوم راج کوٹی سلمہ نے علامہ، فقیہ، محدث، ادیب، مسند، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ حلبی نور اللہ مرقدہ کے سوانحی نقوش جمع کرنے شروع کیے، تو احقر کے توجہ دلانے سے سوانح کا قیمتی مواد مولانا محمود حسن صاحب نے ارسال فرمایا اور اس خدمت کو وہ اپنی سعادت خیال فرماتے تھے، چنانچہ ''شیخ عبدالفتاح ابوغدہ-حیات وخدمات'' نامی مطبوعہ کتاب میں

متعدد جگہ مراسلہ مواد ان کے شکریہ کے ساتھ مذکور ہے۔

حضرت اقدس مولانا علی میاں ندویؒ کی کتاب ’’پرانے چراغ‘‘ جلد سوم کو منظر عام پر لانے میں ان کا بڑا کردار رہا، اسی طرح ’’کاروان زندگی‘‘ کی جلد ہفتم کی تصحیح و نگرانی میں ان کا وافر حصہ رہا۔ ایسا لگتا ہے کہ حضرت نے مولانا محمود حسن صاحب کو جو دلی دعا دی تھی، وہ شرفِ قبولیت پا چکی تھی، حضرت اقدس مولانا علی میاںؒ نے موصوف مرحوم کے بارے میں تحریر فرمایا:

’’(مصنف) عزیز القدر سید محمود حسن حسنی ندوی سلمہ کے لیے خاص طور پر دعا گو ہے، جنھوں نے اس کتاب [’’کاروان زندگی‘‘ حصہ ہفتم] کی تصحیح نگرانی و تاکید میں مدد کی: بارك الله فيه و وفقه بما يحب و يرضى.‘‘ (پیش لفظ، ص:۷)

احقر دل سے دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، ان کے کارناموں کو زندہ رکھے، ان کی تصنیفات و مضامین سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے، پس ماندگان کو صبر جمیل و اجر جزیل نصیب فرمائے۔ آمین!

اللهم أكرم نزله، ووسع مدخله، وأبدله دارا خيرا من داره، وأهلا خيرا من أهله، ونقه من الخطايا كما نقيت الثوب الأبيض من الدنس، وباعد بينه وبين خطاياه كما باعدت بين المشرق والمغرب.

خانوادۂ حسنی کا گل سر سبد

مولانا عبدالعلیم فاروقی
(مہتمم دارالمبلغین۔لکھنؤ)

۱۳ر محرم ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۲ر اگست ۲۰۲۲ء یوم جمعہ بوقت صبح خاندان حسنی کے چشم و چراغ، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی کے لخت جگر مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ طویل بیماری کے بعد رحلت فرما گئے۔ اللہ پاک رحمت ومغفرت کا معاملہ فرمائے اور درجات بلند کرے۔ موت ایک یقینی چیز ہے جس کا انکار ممکن نہیں اور جب اس کا وقت آجاتا ہے تو اس میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ”فاذاجاء أجلهم لايستأخرون ساعة ولايستقدمون“ ہر فرد بشر کی تقدیر میں موت کا جام لکھ دیا گیا ہے ؎

لوكان في الدنيا بقاء لساكن
لكان رسول الله فيها مخلدا
وما أحد ينجو من الموت سالما
وسهم المنايا قد أصاب محمدا

مولانا سید محمود حسنی ایک عالی مرتبت خاندان کے ہونہار فرد تھے، ان کی پرورش

قابل رشک تھی، ان کے بزرگوں میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ اوران کے حقیقی نانا عارف باللہ حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی علیہ الرحمہ تھے اورچھوٹے نانا حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی دامت برکاتہم ہیں۔

(آخرالذکر مرشد الامت ہم سب کے مخدوم ومطاع ہیں، حق تعالیٰ صحت و عافیت کے ساتھ ان کوسلامت رکھے۔)

ایسے پارسااور پاک باز اللہ والوں کی آغوش میں جس بچے نے تربیت حاصل کی ہووہ انشاءاللہ ضرور ''محمود العاقبہ'' ہوگا۔

مجھ راقم الحروف جیسا قریبی تعلق رکھنے والا اگر اپنا مشاہدہ پیش کرے تو بے جانہ ہوگا اوراس کوکسی مبالغہ پر بھی محمول نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا محمود حسنی سن شعور تک پہنچے توعام نوجوانوں جیسا ہم نے ان کونہیں دیکھا، ہمیشہ اچھی باتوں کی فکر میں رہنا ان کا مزاج تھا، اچھے لوگوں کے تذکرہ سے ان کوایمانی مسرت حاصل ہوتی تھی اور بری باتوں سے ان کو بہت زیادہ الجھن اورکبیدگی پیدا ہوتی تھی، گویا کہ ان کی طبیعت اورمزاج میں شریعت کا عنصر غالب تھا جس کی عام طور پر صوفیائے کرام تعلیم دیتے ہیں کہ شریعت جب تک طبیعت نہ بن جائے اس وقت تک کمال حاصل نہیں ہوسکتا۔

میرے اپنے خیال میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے بے شمار محاسن میں یہ بات شامل ہے کہ حضرتؒ نے اپنے زمانہ کے بزرگوں سے اس درجہ قربت حاصل کی اوران کا عطر کشید کیا جوان کی خصوصیت میں شمار ہوتا ہے، اسی طرح مولانا سید محمود حسنی نے اکابر سے تعلق قائم کیا، اہتمام سے ان کے پاس جاکر کسب فیض کرنا ان کے معمول میں داخل تھا۔

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق علیہ الرحمہ جو حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے انتہائی

بافیض خلفاء میں تھے، جنھوں نے احیاء سنت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا، عام اجتماع یا خصوصی مجلس ہو، گھریلو ماحول ہو یا مدرسہ کی چہار دیواری سنتوں کا بھرپور خیال فرماتے تھے۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ لوگ سنت کی بات تو کرتے ہیں مگر خود سنتوں کا اتنا خیال نہیں کرتے جیسا کرنا چاہیے، مگر حضرت مولانا ابرارالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں خود بھی سنتوں کا پورا پورا خیال رہتا تھا۔ میرے عزیز مولانا محمود حسنی حضرت والا سے بہت زیادہ تعلق رکھتے تھے اوران کے گرویدہ تھے، ان کی گرویدگی اور محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت علیہ الرحمہ کی سوانح بڑے والہانہ انداز میں مرتب فرمائی، جس کو علمائے کرام اور دین سے تعلق رکھنے والوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اسی طرح وقت کے دیگر اکابر سے بھی ان کا غیر معمولی تعلق رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے مخلصین سے اس تعلق کے بہتر اثرات قائم فرمائے اور مولانا کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔

مولانا مرحوم میرے پاس بھی اکثر آیا کرتے تھے، بزرگوں کے حالات اور واقعات معلوم کرتے اور خاص طور پر میرے اساتذہ کے بارے میں پوچھتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مولانا اسعد اللہ صاحب) کے احوال سن کر اتنا متاثر ہوئے کہ حیرت کے آثار ان کے چہرے پر صاف محسوس ہو رہے تھے، برصغیر کا شاید ہی کوئی ایسا علمی و دینی گھرانہ ہو جس سے وہ ناواقف ہوں، جن بزرگ کا بھی تذکرہ ہوتا ان کے احوال پورے استحضار کے ساتھ اور بعض اوقات تاریخی ترتیب سے سنا دیتے تھے۔

مولانا بڑے خوش نصیب لوگوں میں سے تھے، انھوں نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو صلحاء سے معمور گھرانہ دیکھا، عبادت و ریاضت، خلوص وللّٰہیت اور زہد و

تقویٰ کا ماحول، علم و عمل، خاکساری اور انسانیت نوازی کے نمونے سب ان کے اردگرد موجود تھے۔ایسے پاکیزہ ماحول اور صاف ستھرے معاشرہ کے اثرات مرحوم کی زندگی میں پورے طور پر پائے جاتے تھے،طبیعت میں نیکی وملنساری اور خندہ جبینی اور گفتگو میں حلاوت ان کی اعلیٰ صفات تھیں، نفع رسانی اور خیر خواہی کا جذبہ دینی بنیادوں پر ان کی ذات میں موجود تھا، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ بہتر سے بہتر معاملہ فرمائے اور صلحاء کے ساتھ ان کا حشر فرمائے۔آمین!

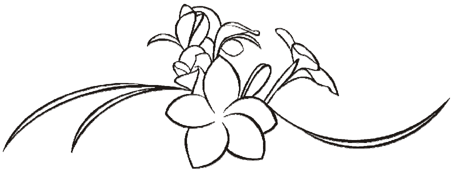

تعزیتی مکتوب

مولانا محمد سعد صاحب کاندھلوی
(مرکز نظام الدین-دہلی)

سلالۃ النبوۃ العظمیٰ مخدومی مکرم گرامی قدر وعالی مرتبت حضرت مولانا محمد الرابع الحسنی أطال اللہ بقاءلہ ومد اللہ ظلالہ للإسلام والمسلمین ومتعنا اللہ إیانا وجمیع أمۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بفیوضہ العلمیۃ والعملیۃ.

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۳؍محرم الحرام ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۲؍اگست ۲۰۲۲ء بروز جمعہ، حضرت مولانا سید محمد الثانی الحسنی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ کے نواسے، خانوادۂ علم اللہ کے نیر تاباں، چمکتا ستارہ اور اپنے اسلاف کے روحانی اور حقیقی سرمایہ میراث کے امین: حضرت مولانا سید محمود حسن الحسنی نور اللہ مرقدہ اپنی حقیقی اور آخری منزل سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

إنا للہ وانا الیہ راجعون، أعظم اللہ لنا ولکم الأجر، وألھمنا وإیاکم السلوان والصبر، إنہ من المواھب الإلٰھیۃ وعواریہ المستودعۃ، متعنا اللہ بہ إلی أجل معدود وقبضہ لوقت معلوم بأجر عظیم إن شاء اللہ تعالیٰ.

مولانا مرحوم کی رحلت کسی مخصوص علاقہ، شعبہ یا ادارہ کے لیے نہیں، بلکہ پوری ملت اسلامیہ کے لیے بڑا خسارہ ہے، جس کو حدیث پاک میں ”ثلمة لا تسد“ فرمایا گیا، علی الاخص آنجناب عالی کے لیے بڑی آزمائش اور ایک صبر آزما امتحان ہے، کیونکہ اس نوعیت کی ہمہ جہت شخصیات ہی کسی تحریک اور اس کے فائدہ کے لیے دست وبازو ہوتی ہیں، جن کے باعث وہ منازل ارتقاء طے کرتی اور اپنے اہداف ومقاصد کو سر کرتی ہیں، مولانا مرحوم بھی اس عظیم جماعت کے رکن وطید اور اس چمن پر بہار کے شجرۂ مثمرہ تھے، جس کی تعمیر وآبیاری مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمائی تھی:

نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اسی عظیم صحبت وتربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ مولانا مرحوم اک ایسی ہمہ جہت شخصیت بن کر عالم اسلام کے افق پر نمودار ہوئے، جس نے حضرت مولانا رحمہ اللہ کی حیات ہی میں مولانا کا اعتماد حاصل کر کے امت مسلمہ کے قلوب میں انمٹ نقوش پیدا کر دیے تھے اور پھر اللہ جل جلالہ نے مولانا مرحوم سے تقریر وتحریر، درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور دعوت وتبلیغ وغیرہ کے تمام شعبوں میں کام لیا اور خوب لیا، بالخصوص تصنیف وتالیف اور تذکرہ نگاری سے مولانا مرحوم کو بڑی مناسبت اور اس کا خاص وہبی ذوق تھا، مولانا دسیوں مشہور کتابوں کے مصنف تھے، جن کو علمی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہے، جن میں متعدد اہل اللہ اور مشائخ کی حیات، خدمات، صفات اور ان کے پر اثر واقعات کا خاصا اور وافر ذخیرہ موجود ہے، جو اس بات کا غماز ہے کہ مولانا مرحوم کو اپنے اسلاف سے کتنا قلبی تعلق تھا اور مولانا مرحوم تصنیف وتالیف اور اپنی گراں قدر تحریر کے ذریعہ اسلاف کی اس روحانی میراث کو محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو

امت مسلمہ مرحومہ کے اندر منتقل کرنا چاہتے تھے، کیونکہ مولانا خود اسلاف کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور ان کے اخلاق وسیرت، ایمان باللہ والرسول، مغیبات پر یقین، عالی اخلاق، تواضع وانکساری اور اخلاص وللّٰہیت وغیرہ کی حلاوت اور اس کا ذائقہ چکھ چکے تھے۔

ان تمام مصروفیات کے باوجود دعوت وتبلیغ سے محبت اور شغف مزید برآں، اس کے لیے اسفار، تقریراً تحریراً اور عملاً تمام احوال عسر ویسر اور موافق ونا موافق میں اس کی تائید وترغیب مولانا مرحوم کا جزو حیات تھی، بنگلہ والی مسجد مرکز نظام الدین بالخصوص خانوادۂ الیاسی سے مولانا مرحوم کا تعلق، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ کے تعلق کا عکاس وترجمان تھا۔

واللہ یجزیہ الخیر عن جمیع أمة محمد صلی اللہ علیہ وسلم وأکرم نزلہ وبرد مضجعہ ووسع مدخلہ وأبدلہ دارا خیرا من دارہ وأھلا خیرا من أھلہ، اللھم لا تحرمنا أجرہ ولا تفتنا بعدہ. آمین!

یقیناً کسی عزیز کی رحلت ووفات سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی شئ صبر آزما نہیں ہوسکتی، آنجناب محترم دامت برکاتہ العالیہ کے لیے مولانا مرحوم کی رحلت بڑے غم کا باعث ہے، تاہم اللہ جل جلالہ وعم نوالہ نے اس مبارک خانوادہ علم اللہ کو پانچ صدیوں سے زائد عرصہ سے اس ملک کے ظلمت کدوں میں علم وہدایت کے چراغوں کو روشن کرنے کے لیے منتخب فرمایا ہوا ہے، مستقبل میں بھی ہم اللہ رب العزت کی ذات عالی سے امیدوار ہیں کہ اللہ رب العزت اس سلسلہ خیر کو جاری رکھے گا اور پیہم رجال کار کے اس مبارک سلسلہ کو تا قیام قیامت امت مسلمہ کے لیے بے لوث خدام دین کے مہیا ہونے کا ذریعہ فرمائے گا، نیز جس طرح دار العلوم ندوۃ العلماء نے امت کو

امتیازی خصوصیات اور اسلاف کی روحانی میراث کے حاملین خدام، مصلحین، دعاۃ ومبلغین باذن اللہ فراہم کیے ہیں، اس پرفتن دور میں اللہ اس کی حفاظت بھی فرمائے، اسی طرح اس رجال ساز مینارے کو ہمیشہ سربلند وزرخیز بنائے۔آمین!

مولانا مرحوم کی رحلت پر بندہ اور جملہ احباب بنگلہ والی مسجد آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور اللہ رب العزت سے دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت مولانا مرحوم کو اپنی رحمتوں میں ڈھانپ کر ابدی راحتیں نصیب فرمائے، اعلیٰ علیین میں پیہم ترقی درجات سے نوازے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔آمین!

والسلام مع الاحترام

بندہ محمد سعد غفرلہ

ایک صالح و باکمال شخصیت کی وفات

مولانا عبدالستار مفتاحی بوڑیوی
(مدیر مدرسہ ضیاء القرآن خانقاہ بوڑیہ۔ ہریانہ)

۱۳/ محرم الحرام ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۲ / اگست ۲۰۲۲ء جمعہ کی صبح یہ دل خراش خبر پردۂ سماعت سے ٹکرائی کہ خانوادہ حسنی کے گل سرسبد، قلم وکتاب سے وابستگی رکھنے والے مخلص عالم دین، نائب مدیر پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' اور استاد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ عزیزی مولانا سید محمود حسن حسنی رحمہ اللہ طویل علالت کے بعد منزل فردوس کو سدھار گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

یہ سنتے ہی بے ساختہ زبان پر استرجاعی کلمات جاری ہوگئے، چنانچہ حسب توفیق ایصال ثواب کر کے دعائے مغفرت کی گئی اور ہنوز بھی یہی دعا ہے کہ حق جل مجدہ بال بال آپ کی مغفرت فرمائے، اپنے قرب خاص سے نوازے، اپنے شایان شان مرحوم کی خدمات کو مقبول فرمائے اور افراد خانہ و متعلقین کو صبر وسکون میسر فرمائے!

برادر گرامی مولانا سید محمود حسنی ندوی مرحوم اپنی صفات وسیرت کے لحاظ سے پرکشش شخصیت کے مالک تھے، ان سے قریب کے زمانہ میں تو یہاں مدرسہ ضیاء

القرآن خانقاہ بوڑیہ میں کوئی قابل تذکرہ ملاقات یاد نہیں پڑتی، لیکن بعض متعارفین واہل تعلق کی زبانی آپ کا پیام وسلام ضرور پہنچتا جس سے آپ کی بڑی قدر محسوس ہوتی نیز اکابر ومشائخ علماء کی سیرت وسوانح پر لکھنے لکھانے کے حوالے سے بھی ان کا نام وکام ہمیشہ تازہ رہتا، بلکہ میرے پوتے عزیزی مولوی عبدالسبحان سلمہ نے ابھی قریب کے مہینوں میں آپ کا تحریر کردہ وہ مضمون بھی دکھایا جس میں مولانا مرحوم نے اس خاکسار کی یہاں ہریانہ پنجاب وہماچل اور اتراکھنڈ کے بعض علاقوں میں کچھ چھوٹی موٹی خدمات کا تذکرہ بڑی محبت سے کیا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نوراللہ مرقدہ کے ہریانہ کے اس دینی و دعوتی سفر کا بطور خاص تذکرہ کیا ہے جو آپ نے ۱۹۷۸ء میں اپنے بعض رفقاء کی معیت میں فرمایا تھا اور بندہ بھی بطور رہبر اس قافلہ کا ایک حصہ تھا، اس سفر میں حضرت مولانا نے جگادھری کے بعض مضافات کا بھی دورہ کیا تھا، مرشدی حضرت مولانا جلال آبادیؒ سے انتساب کی وجہ سے حضرت مولانا علی میاںؒ کی محبتیں بھی ناچیز کو حاصل رہیں تھیں۔

مولانا محمود حسنی اس نوع کی معلومات کے امین اور دین وملت سے جڑے افراد کے بڑے قدردان معلوم ہوتے تھے۔ آپ کی تحریر وقلم میں پختگی اور خلوص واحسان کی چاشنی محسوس ہوتی تھی، تعمیر حیات کے صفحات پر بھی وہ سیرت وسوانح جیسے موضوعات پر خوب لکھتے اور داد تحسین پاتے تھے، یقیناً ایسے صالح اور باکمال شخص کا بچھڑنا موجب رنج وحرمان ہے، جب کہ حسنی خانوادہ کے لیے تو یہ حادثہ دوہرے صدمات کا باعث ہے، کسے خبر تھی کہ محض پچاس اکیاون برس کی عمر میں ہی وہ اس فانی دنیا سے منھ موڑ لیں گے۔ خداوند قدوس سے دعا ہے کہ اس حادثہ کی تلافی کے اسباب پیدا فرمائے اور ہم سبھوں کو ان کا بہتر بدل نصیب فرمائے۔ آمین!

ایک علم دوست ہستی کی رحلت

مولانا احمد بزرگ صاحب
(مہتمم جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین-ڈابھیل)

پچھلے دنوں مولانا محمود حسن حسنی ندوی برد اللہ مضجعہ کی وفات کی خبر سنی تھی، اسی وقت ان کے لیے دعا و ایصالِ ثواب کر دیا تھا، موصوف خانوادۂ حسنی کے ممتاز فرد ہونے کے ساتھ ندوۃ العلما کے اہم ترین شخص تھے، ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا اس کا پُر ہونا بہ ظاہر مشکل ہے۔

موصوف کو حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خاندانی میراث ''بزرگوں کی سوانح'' سے خصوصی شغف تھا، ان کے سیال قلم سے متعدد بزرگوں کے متعلق مضامین منصۂ شہود پر آئے، ہمارے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے استاذ مفتی عبد القیوم راج کوٹی زیدت خدماتہ نے جب شیخ عبد الفتاح ابو غدہ کی سوانح حیات پر قلم اٹھایا تو موصوف مرحوم نے خوب حوصلہ افزائی فرمائی اور شیخ کی سوانح کا خاصہ مواد فراہم کیا، یہ سوانح ''شیخ عبد الفتاح ابو غدہ حیات وخدمات'' کے نام سے ۱۴۴۲ھ میں آب وتاب کے ساتھ منظر عام پر آچکی ہے، اس کتاب کا بہت اہم حصہ مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا عنایت فرمودہ ہے، مثلاً:

(۱)عارف باللہ شیخ عیسیٰ بیانونی رحمۃ اللہ علیہ سے شیخ عبد الفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ کے شرفِ استرشاد وارادت کے تعلق پر موصوف کے قلم سے مستقل مضمون ہے۔

(ملاحظہ کریں، ص: ۱۴۵ تا ۱۴۹)

(۲)۱۹۷۵ء کو ندوۃ العلما لکھنؤ کا پچاسی سالہ اجلاس منعقد ہوا جو ہندوستان کی طویل اسلامی ملی تاریخ میں ایک نقشِ تابندہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس اجلاس میں شیخ عبد الفتاح رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی فصیح وبلیغ عربی زبان میں تقریر فرمائی تھی، یہ تقریر بھی موصوف کی نشان دہی سے مولانا سلمان صاحب بجنوری مدظلہ (استاذ ادب دار العلوم ندوۃ العلماء) نے ارسال فرمائی تھی۔ (ملاحظہ کریں، ص: ۲۴۴ تا ۲۴۷)

(۳)۱۹۷۹ء میں شیخ ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا ابو الحسن علی صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی دعوت پر استاذِ زائر (وزٹنگ پروفیسر) کی حیثیت سے ندوۃ العلما لکھنؤ تشریف لائے، اس موقع پر مولانا ڈاکٹر محمد صدر الحسن ندوی (حال مقیم اورنگ آباد زید مجدھم) نے الوداعی جلسہ میں شیخ کی شان میں ایک جامع عربی قصیدہ دل کش اور مترنم آواز سے پڑھا تھا۔

تینتالیس سال کا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود مولانا محمود صاحب کو قصیدہ خواں اور ان کا نام یاد تھا، انہوں نے اس کی نشان دہی فرمائی، مرتب کتاب نے رابطہ کیا، مثل مشہور ہے: ’’جوئندہ یابندہ‘‘ بالآخر کامیابی حاصل ہوئی، اس طرح یہ نادر قصیدہ اور اس کا معنی خیز ترجمہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے قلم اشہاب سے بہ عنوان ’’قصیدۂ مدحیہ‘‘ کتاب کی زینت بنا۔ (ملاحظہ کریں، ص: ۲۶۱ تا ۲۶۷)

(۴)۱۹۹۲ء میں شیخ ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان کے متعدد شہروں کے اسفار کیے، من جملہ ان کے لکھنؤ سے باندہ کا سفر ہے، اس سفر میں مولانا محمود صاحب کو بھی شیخ

کی معیت کا شرف حاصل ہوا، اس سفر کی دلچسپ روداد انہوں نے ''بیہقی وقت، شافعی زمانہ، خرخانی عصر: حضرت باندوی کی خدمت میں'' کے نام سے سپرد قلم کی تھی، یہ پورا مضمون بھی مرحوم نے ارسال فرما کر ممنون کرم کیا تھا۔

(۵) مذکورہ کتاب کے بارہویں باب میں شیخ ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد گرامی نامے مندرج ہیں، اس میں چار اہم گرامی نامے مولانا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وساطت سے موصول ہوئے، اس سلسلہ میں ایک عجیب غیبی مدد کا ظہور ہوا جس کا ذکر فائدے سے خالی نہیں:

مولانا موصوف رحمۃ اللہ علیہ نے بتلایا کہ شیخ ابو غدہ کے گرامی نامہ کی جستجو کے لیے ماہ نامہ ''تعمیر حیات'' کی قدیم فائلوں کو کھولا تو قدیم فائل کھولتے ہی شیخ کا مترجم گرامی نامہ نکل آیا، انہوں نے اس حیرت انگیز امر کو بتلانے کے لیے مرتب کتاب کو فون کیا اور اس پر بہت تعجب اور خوشی کا اظہار کیا۔

ہمارا خیال ہے کہ اِس طرح غیر مظان سے کسی موضوع کا مسالہ دستیاب ہو جانے میں طلب صادق کو بڑا دخل ہے، مولانا مرحوم اس وصف سے متصف تھے۔

الغرض شیخ ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح میں مولانا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کافی حصہ ہے، مولانا مرحوم کی ذہنی وتحریری صلاحیتوں اور'' ندوۃ العلماء'' کی دعوت و مقاصد کی ترجمانی کے سلیقہ کا اندازہ اس کے ترجمان ''تعمیر حیات'' اور'' مرکز الامام ابوالحسن الندوی دارعرفات'' کے ماہ نامہ ترجمان'' پیام عرفات'' سے لگایا جاسکتا ہے۔

ہم اربابِ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (گجرات) صاحبِ کمال مصنف، معروف قلم کار اور باتوفیق ہستی کے انتقال اور اس سے پیدا ہونے والے خلا کے خیال سے رنجور ہیں، علمی دنیا میں ان کی کمی کا احساس کیا جائے گا۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

أللھم أکرم نزلہ ووسِّع مدخلہ وأبدلہ خیراً من دارہ وأھلاً خیراً من أھلہ ونقِّہ من الخطایا کما نقَّیتَ الثوب الأبیض من الدنس وباعِد بینہ وبین خطایاہ کما باعدْتَ بین المشرق والمغرب۔ آمین!

اللہ تبارک وتعالیٰ مرحوم کی تمام مساعی جمیلہ کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین!
ان شاء اللہ حسب موقع یہاں ان کے لیے ایصالِ ثواب کا انتظام کیا جائے گا۔

فقید المثال داعی و مصنف

مولانا محمد شریف صاحب بارہ بنکوی
(بنگلہ والی مسجد بستی حضرت نظام الدین- دہلی)

میرے انتہائی ہردل عزیز مولانا محمود حسنی ندویؒ کے سانحہ ارتحال کی خبر بنگلہ والی مسجد بستی حضرت نظام الدین دہلی میں ملی، انا للہ وانا الیہ راجعون! نا قابل بیان صدمہ ہوا۔ چونکہ ان کی بیماری سے متعلق بندہ کو مستقل تشویش رہتی تھی اور صبح وشام خیریت معلوم کرنا اور بارگاہِ ایزدی میں دست بدعا ہونا معمول زندگی تھا۔ خیر موت ایسی یقینی شے ہے جس سے کسی کو مفر نہیں۔

مولانا موصوف کا بندہ سے گہرا تعلق تھا، جب بھی ندوۃ العلماء یا تکیہ آنے کا ارادہ ہوتا، سب سے پہلے محمود حسنی کا نمبر سامنے آتا، پورے سفر کی ترتیب مولانا خود طے کرتے، تکیہ پہنچتے ہی مولانا موصوف جس خلوص اور خندہ پیشانی اور بشاشت قلب سے استقبال کرتے، سارا تکان تازگی میں بدل جاتا۔

مولانا موصوف کے جنازہ میں حاضری کے لیے طبیعت بے قرار تھی، مگر ایک بڑے عالمی مرکز سے بلا اذن ہٹنا بھی معصیت سے کم نہیں، چنانچہ مشورہ میں حضرت

جی حضرت مولانا سعد صاحب نے انتقال کی خبر پاتے ہی گہرے دکھ اور رنج کا اظہار فرماتے ہوئے مولانا کی شخصیت اور اپنے ذاتی تعلق کا اظہار کرتے ہوئے بندہ کے ہمراہ ایک جماعت تشکیل دی جس میں حضرت مولانا عبید اللہ بلیاویؒ کے صاحبزادے مولوی عبد العلیم صاحب، پوتے مولوی زید صاحب سلمہ، مدرسہ کاشف العلوم کے استاذ مفتی سلیم صاحب، بلند شہر کے ذمہ دار حافظ مسعود صاحب کی حاضری ہوئی۔

مولانا موصوف ماشاء اللہ ایک معروف عالم دین، سرگرم داعی ومبلغ، سیرت وسوانح کے عاشق، قلم انتہائی رواں، مزاج میں تدین پسندی، منکسر المزاج، ہر وقت چہرے پر گہری فکر کے اثرات، کسی بات کو انتہائی اہمیت کے ساتھ لینا، اوقات کی حفاظت، قلب ولسان کے ذاکر، حضرت مولانا محمد ثانی حسنیؒ کا خلوص، علی میاں ندوی مفکر اسلامؒ کی آہ سحر گاہی کا سوز وساز، حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی کی باکمال تربیت کا نتیجہ تھے۔

مولانا موصوف نے مختصر سی زندگی میں جو نقوش چھوڑے ہیں، حیات مستعار میں جو تحریری سرمایہ تیار ہوا ہے، رہتی دنیا تک انہیں یاد رکھا جائے گا اور مولانا کے لیے وہ صدقہ جاریہ بنے گا، اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔

حضرت مولانا محمود حسنی رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت کے کام سے تعلق ورثہ میں ملا تھا، حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحبؒ اور حضرت مولانا علی میاںؒ کا تبلیغ کے ابتدائی زمانہ سے جو تعلق تھا، خواہ وہ مولانا شاہ محمد الیاس صاحبؒ کا لکھنؤ کا سفر ہو، حجاز مقدس میں کام کا تعارف، مولانا علی میاں ندویؒ کی سعی پیہم اور طویل مدت تک وہاں کا قیام ہو، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی والدہ کی حضرت مولانا الیاس صاحبؒ سے بیعت ہو، دار العلوم ندوۃ العلماء بلڈنگ پر حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کا کھڑے

ہوکر دعا کرنا ہو، ان سب واقعات کو جس عقیدت ومحبت کے ساغر میں ڈوب کر مولانا موصوف بیان کرتے تھے، جیسے آنکھوں دیکھا حال ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جس طرح ندوۃ العلماء نے تبلیغ کا روز اول سے شاندار استقبال کیا، مولانا موصوف نے قلم اور قدم دونوں سے تائید اور دفاع میں کوئی کسر نہ چھوڑی، ماضی قریب میں جو حال آیا، مولانا موصوف نے حقیقتِ حال سے واقفیت کے ساتھ جو کردار ادا کیا ہے، یہ ان کی ذکاوت، معاملہ فہمی کے علاوہ دعوت وتبلیغ اور اس کے مرکز سے ایک خاص تعلق کا اثر تھا۔

اسی درمیان مولانا موصوف مرکز تشریف لے گئے، غالباً مولانا فرمان ندوی بھی ساتھ تھے، پورے مرکز کا معائنہ کیا، مولانا عبد الستار صاحب نے مولانا محمود حسنی کا علماء میں بیان کرایا۔ بلند شہر کا تاریخی اجتماع ہوا، ہندوستان کا بڑا مجمع تھا، بیرون کے مہمان کئی ہزار تھے، عرب بھی کافی تعداد میں شریک ہوئے، مولانا محمود حسنی کا حضرت جی مولانا سعد صاحب نے عربوں میں بیان طے فرمایا، مولانا موصوف نے ایسی دل پذیر تقریر فرمائی کہ خوش اور مطمئن ہی نہیں بلکہ مولانا کے گرویدہ اور شیدائی بن گئے۔

بندہ برابر مولانا کی تشکیل کرتا رہتا تھا، چونکہ یہ صلاحیت بھی امت کی امانت ہے، میں یہی چاہتا تھا کہ ایسا فقید المثال، اکابرین کا تربیت یافتہ، روحانیت سے بھرپور، دنیا کی محبت سے سینہ خالی، فکر آخرت سے وافر حصہ ملا ہوا، غم مصطفی کو لے کر امت کو سیراب کرے، مجھ سے وعدہ کرتے کہ سال تو لگانا ہے، مگر مرشد الامۃ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کی خدمت ِ باسعادت اور ان بزرگوں کے علمی ورثہ کی خوشہ چینی میں تادم آخر مصروف عمل رہے۔

فجزاہ اللہ خیر أحسن الجزاء!

اس کے باوجود نظام الدین مرکز میں ملکی جوڑ کا موقع ہوتا، یا لکھنؤ مرکز میں یوپی والوں کا جوڑ ہوتا، حضرت سے اجازت لے کر تشریف لاتے اور سارے عمل میں شریک رہتے، کبھی اہل لکھنؤ جمعرات کے اجتماع میں بیان کے لیے تقاضا کرتے تو بڑی بشاشت سے قبول کرتے۔

بندہ نے ندوۃ العلماء کے الحاق کے ساتھ خصوصی درجات کا ایک مدرسہ بنانے کا ارادہ کیا، تو بڑی خوشی کا اظہار فرمایا اور حضرت مہتمم صاحب مولانا سعید الرحمن اعظمی کے ہمراہ تشریف لائے اور ابتداءً خود تقریر فرمائی، جس کا سامعین پر غیر معمولی اثر ہوا، حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب اور حضرت مولانا سید محمد واضح صاحب کے ہمراہ ختم بخاری شریف کے جلسہ میں مولانا کئی مرتبہ تشریف لائے۔

اللہ رب العزت مولانا محمود حسنی کی مغفرت فرمائے، درجات بلند فرمائے اور پسماندگان میں اہلیہ، بیٹی، داماد، بھائیوں کو صبر وسکون کے ساتھ ان جیسی صفات سے اپنے فضل سے آراستہ فرمائے۔ وما توفیقی إلا باللہ علیہ توکلت وإلیہ أنیب!

مولوی محمود حسنی چل بسے

سید ہاشم نظام الدین بھٹکلی ندوی
(ڈائریکٹر مکتبۃ الشباب العلمیۃ۔لکھنؤ)

مولوی محمود حسنی چل بسے راہِ جناں
آپ کی فرقت سے ہر سو چھا گیا غم کا سماں
اے دل محزون تجھ کو ہے جدائی کا الم
چل پڑی ہے یک بیک ہر سمت سے بادِ خزاں
روز جمعہ کی مبارک ساعتوں میں چل بسے
خاتمہ بالخیر کے آثار ان پر تھے عیاں
خانوادہ آپ کا ہے افضل وباعز وشاں
سید الکونینؐ سے تھی آپ کی نسبت عیاں
خانداں ہے آپ کا معروف ومقبول جہاں
سید احمد بریلی جس کے تھے روح رواں
بو الحسنؒ ندوی کا لطف خاص حاصل تھا انہیں
حضرت رابعؒ کی صحبت سے تھے شاد وکامراں

آپ کو فہم وفراست بھی وراثت میں ملی
حضرت حسنینؓ کی نسبت سے بھی تھے شادماں

روز روشن کی طرح ہیں خدمتیں سب آپ کی
اور تھے تعمیر میں ندوے کے بن کر ترجماں

دعوتِ فکر وعمل دیتے وہ ہر تحریر میں
نعمت حق کا نشاں تھا خامہ گوہر فشاں

مشغلہ تصنیف اور تالیف کا تھا عمر بھر
فن تاریخ وسیر میں ان کا سا پائیں اب کہاں

وقف کردی نصرت علم وعمل میں زندگی
اور ہمیشہ اہل علم وفن کے تھے وہ قدر داں

تھیں دعائیں اہل باطن کی بھی ان کے ساتھ ساتھ
زندگی میں صاف ظاہر تھے تصوف کے نشاں

آپ کےاخلاق کا تھا معترف ہر اک بشر
ہے یہ وصف خاص ان کے گھر کا ظاہر اور عیاں

آخری ایام بیماری میں گذرے آپ کے
جس کی حکمت جانتا ہے خالق وربِّ جہاں

کرتا ہے تیرا محب ہاشمؔ یہ خالق سے دعا
بخش دے یا رب! سبھی تقصیر اور کوتاہیاں

ایک منفرد اور ممتاز شخصیت

ڈاکٹر سلیم الرحمن خان ندوی
(ٹوکیو-جاپان)

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی غفر اللہ لہ ''تعمیر حیات'' کے سب ایڈیٹر، دار عرفات کے نائب مدیر، ایک اچھے سوانح نگار، بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے اور حضرت ناظم صاحب دامت برکاتہم کے بہت قریب تھے، مولانا کی گفتگو بھی سننے کا کئی بار ملتقی کی زوم کی میٹنگوں میں شرف حاصل رہا، گفتگو میں اثر اور درد ہوتا تھا۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس انتظامیہ میں مارچ ۲۰۲۲ء میں حاضری ہوئی تھی اور مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی نظر نہیں آرہے تھے، تو معلوم کرنے پر کسی نے بتایا کہ مولانا بیمار ہیں، لیکن کوئی ایسی فکر کی بات نہیں ہے، انشاء اللہ جلد ہی صحت یاب ہو کر تشریف لے آئیں گے، اس کے کئی مہینوں کے بعد معلوم ہوا کہ طبیعت زیادہ ناسازہ ہے، شوگر اور گردوں کے کام نہ کرنے کی شکایت ہے، دعا کرتا رہا کہ اللہ تعالیٰ مولانا محمود صاحب کو شفائے کامل وعاجل عطا فرمائے اور جب ملتقی سے معلوم ہوا کہ طبیعت بہت ناساز ہے اور وینٹی لیٹر پر ہیں، دعا کے ساتھ یہ تحریر کیا تھا کہ مولانا کے

قریب اگر کوئی ہوتو میری بات ضرور کرادیں، لیکن بات نہیں ہوسکی اور مولانا محمود حسن حسنی ندوی ایک طویل علالت کے بعد بروز جمعہ مبارک ۱۲/اگست ۲۰۲۲ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! (ہم تو خود اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔)

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی غفر اللہ لہ کی وفات یقیناً ندوۃ العلماء اور ندوی حضرات کے لیے بہت بڑا خسارہ ہے۔ جب بھی ندوۃ العلماء لکھنؤ حاضری ہوتی تو مولانا سید محمود ندوی سے ملاقات ہوتی اور جس وقت مجلس انتظامیہ کے مہمانوں کا جلسہ مہمان خانہ کے سامنے ہوتا تو مولانا بہت آگے آگے ہوتے اور مہمانوں کی خدمت اور گفتگو میں مشغول رہتے، مولانا بڑی صفات حسنہ کے مالک تھے۔

واٹس ایپ سے معلوم ہوا تھا کہ مولانا کی نماز جنازہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہوگی اور دوسری نماز جنازہ تکیہ پر ہوگی، کسی نے مولانا کے جنازہ کا منظر بھی واٹس ایپ پر ڈالا تھا، صالح ونیک لوگوں کا نماز جنازہ اور تدفین میں کثرت سے شریک ہونا مولانا کی عنداللہ مقبولیت کی علامت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی غفر اللہ لہ کو نفوس مطمئنہ میں شامل فرما، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ☆ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ☆ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ☆ وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ (الفجر: ۳۰-۲۹)

(اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کی طرف لوٹ چل اس طرح کہ تو اس سے راضی، وہ تجھ سے خوش، پس میرے خاص بندوں میں داخل ہوجا اور میری جنت میں چلی جا۔)

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی غفر اللہ لہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرما، ان کی قبر کو روضۃ من ریاض الجنۃ بنا دے، ان کے تمام نیک اعمال کو قبول فرما، ان کی لغزشوں کو معاف فرما، ان کے تمام رشتہ داروں اور تعلق والوں اور خاص طور سے محترم ومکرم حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم ناظم ندوۃ العلماء کو صبر جمیل عطا فرما، ندوۃ العلماء کو نعم البدل عطا فرما۔ آمین!

عصر حاضر کے جواں سال بزرگ

ڈاکٹر خلیل الدین شجاع الدین تماندار
(سابق فزیشین حرم مکی شریف - مکہ مکرمہ)

برادر مرحوم سید محمود حسن حسنی کے ساتھ اب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ کا اضافہ کرتے ہوئے قلب وذہن بوجھل سے ہیں، لیکن خالق کل کائنات رب العالمین کے فیصلے کو صبر و شکیب کے ساتھ برداشت کرنا اہل ایمان کا ہمیشہ سے شیوہ رہا ہے، مرحوم عمر میں ناچیز سے تقریباً ''بارہ برس چھوٹے تھے، لیکن علم وکمال میں اللہ سبحانہ قدوس نے انہیں بہت بلند مقام ودرجات سے نوازا تھا، مرحوم سے پہلی ملاقات ستمبر ۱۹۹۶ء کی ہے، جب راقم کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی موجودگی میں نہ صرف دیکھنے کا شرف حاصل ہوا، بلکہ برادر مرحوم امین الدین شجاع الدین سابق رئیس التحریر ''تعمیر حیات'' فکری ترجمان دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ایماء پر ایک ہفتہ قیام کی سعادت بھی نصیب ہوئی تھی، اسی سفر کے دوران رائے بریلی میں تاریخی مقام دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں میں برادر سید محمود حسن حسنی سے گھنٹوں کی ملاقات کا ایک ایک لمحہ آج بھی نگاہوں کے سامنے ہے، بعد ازیں ۱۹۹۷ء تا ۲۰۱۴ء تک حرم مکی

شریف مکہ مکرمہ میں طبی خدمات کی نسبت پر سترہ برس کے اس طویل قیام کے دوران مرحوم کے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کے ہم راہ کئی اسفار بھی ہوئے اور الحمدللہ ہر سفر میں راقم کو آپ سے مستفیض ہونے کی سعادت بھی نصیب ہوتی رہی۔

حرم مکی شریف کے قیام کی برکت سے نہ صرف مرحوم سے روابط مضبوط ہوئے، بلکہ آپ کے خاندان کے تقریباً ہر فرد سے ناچیز کا تعارف بھی ہوتا چلا گیا، لہٰذا آپ کے دادا مرحوم سید مسلم حسنیؒ، آپ کے والد مرحوم سید حسن حسنیؒ، آپ کے چچا عم مرحوم ڈاکٹر احمد حسنیؒ، آپ کی والدہ ماجدہ سیدہ امامہ حسنی رحمۃ اللہ علیہا، آپ کے دو چھوٹے بھائی سید مسعود حسنی اور سید منصور حسنی، اس طرح تمام اہل خاندان اس فقیر سے بھی اچھی طرح متعارف تھے، برسبیل تذکرہ وہ واقعہ عرض کرتا چلوں کہ ایام حج میں جب مرحوم کے والدین حج پر تشریف لائے تھے، دوران گفتگو ناچیز نے انہیں حفظ ماتقدم محض ایک جملہ کہہ دیا تھا کہ حج کے ایام میں حرم شریف کے اطراف لاکھوں کا ہجوم ہوتا ہے، اگر بالفرض آپ میں سے کوئی بچھڑ جائے تو پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں، بلا تردد ایسے موقع پر حرم شریف میں موجود میرے مطب پر آجایئے گا، انشاءاللہ دیگر معاملات اللہ کے فضل سے قابو میں آجائیں گے اور ایک دن واقعی ایسا ہی ہوا، کیا دیکھتا ہوں کہ نماز ظہر سے قبل حرم شریف میں باب ملک فہد کے دور اول پر ناچیز اپنے مطب میں مریضوں کو دیکھنے میں مصروف تھا کہ ام محمود حسنی سیدہ امامہ حسنی صاحبہ تشریف لائیں اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب بہت دیر سے محمود میاں کے والد کو ڈھونڈھ رہی ہوں لیکن وہ کہیں نظر نہیں آرہے، راقم نے انہیں اطمینان دلایا کہ باجی! آپ مطب کے قریب ہی واقع خواتین کے حصے میں بیٹھ جائیں، انشاءاللہ تھوڑی دیر میں مسئلہ حل ہوجائے گا، اللہ کا کرم وفضل ہوا کہ نصف گھنٹے بعد سید محمود حسنی کے والد محترم سید حسن حسنی مطب پر

تشریف لائے اور الحمد للہ وہ تمام مشکلیں جو پیش آئی تھیں سب آسان ہوگئیں۔

یہ حقیقت ہے کہ برادر مرحوم سید محمود حسن حسنی کا بچپن اپنے دور کے آفتاب و ماہتاب کے دامن میں گزرا ہے، جن میں بالخصوص مفکر اسلام سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، سابق معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ اور موجودہ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی حفظہ اللہ جیسی مایہ ناز شخصیات شامل ہیں، جن کے سایہ عاطفت میں تربیت یافتہ سید محمود حسنیؒ نے ۱۲؍اگست ۲۰۲۲ء بمطابق ۱۳؍محرم الحرام ۱۴۴۴ھ کی صبح کو گذشتہ چند برسوں سے گردوں کی طویل علالت کے بعد گومتی نگر میں واقع میٹرو ہاسپٹل لکھنؤ میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

بے شک بقا صرف اللہ کی ذات کو ہے اور باقی ہر شئی فنا ہونے والی ہے:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ☆ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾

(الرحمن: ۲۷-۲۶)

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ مرحوم کا شمار اپنے دور کے جواں سال بزرگ کی حیثیت سے ہوتا ہے، جنھیں عوام وخواص دونوں حلقوں میں اللہ کے فضل سے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور جو شاذ ونادر ہی دیکھنے میں آتی ہے، ۵۱؍برس کی قلیل عمر میں کئی اہم کتابوں کے مصنف، عصر حاضر کے جید وعلماء کبار کے صحبت یافتہ، غیر معمولی طبعی شرافت، گفتگو کا انتہائی مہذب سلیقہ، چھوٹوں پہ شفقت اور بڑوں کی عزت، علمی لیاقت، عربی واردو زبانوں پہ یکساں قدرت، حسن اخلاق وریاضت، دوسروں کا لحاظ ومروت جیسے اوصاف ہیں جن کی بدولت الحمد للہ سید محمود حسن حسنیؒ لاکھوں میں بھی ممتاز تھے۔

برادر مرحومؒ کی رحلت کو راقم تحریر محض ملت اسلامیہ اور خانوادۂ حسنی ہی کا نہیں

بلکہ اپنا ذاتی خسارہ بھی گردانتا ہے، کیونکہ موصوف ناچیز کے لیے مستقل حوصلہ دینے والے یا ایک (inspiring personality) انسپائرینگ پرسنالٹی کی حیثیت رکھتے تھے۔

عالم اسلام میں خصوصاً برصغیر کے معروف اسلاف کے کارہائے نمایاں اوران کی علمی ودینی خدمات کے اسباق، یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ گویا انھیں ازبر تھے، اہل اللہ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کرنہ صرف ان بزرگوں سے علم وعرفاں کے گوہر سمیٹتے بلکہ ان کی زندگی کے سارے تجربات ومشاہدات کوانتہائی حسن وخوبی سے سوانح حیات کے عناوین سے ضبط تحریر میں بھی لاتے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سوانح عمری کے موضوع پر مثلاً: ''سوانح محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرارالحق حقی، سوانح حضرت سید محمد ثانی، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جونپوری، سیرت داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی، تذکرہ مولانا زبیر الحسن کاندھلوی، فرشتہ صفت انسان مولانا عبدالباری ندوی'' جیسی تصانیف آپ کے قلم سے منظر عام پر آچکی ہیں، علاوہ ازیں آپ کی دیگر تصانیف میں تاریخ اصلاح وتربیت (دوجلدوں پر مشتمل)، رفتار کارواں (مختلف اسفار کی تفصیلات)، کووِڈ کے درمیان حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی حفظہ اللہ تعالیٰ کی آپ بیتی بعنوان ''اوراق زندگی'' جیسے قیمتی علمی وادبی سرمایہ کا بھی آپ نے اضافہ کیا ہے۔

رائے بریلی دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ میں سید محمود حسنیؒ نے جس بشاشت سے یہاں موجود ہر تاریخی شئی کو بتایا تھا، وہ تمام مناظر آج بھی مرحوم کی یادوں کو تازہ کررہے ہیں۔

یاد آتا ہے لکھنؤ چار باغ اسٹیشن سے رائے بریلی تک کا تقریباً دوگھنٹوں کا سفر، کہاروں کا اڈہ نامی اسٹاپ پر اتر کر سائیکل رکشا سے تکیہ میدان پور کی سمت روانہ ہونا، ایک چھوٹی سی پگڈنڈی جس کا نام سید ابوالحسن علی حسنی ندوی روڈ، راستے میں ایک مسجد

اور مدرسہ ضیاء العلوم کی عمارت، یہاں سائیکل رکشا والے نے اپنی سواری روک دی اور کہا کہ آگے اب آپ کو پیدل ہی جانا ہوگا اور اشارہ سے بتا دیا کہ وہ رہا بڑے مولانا کا گھر و مہمان خانہ، مہمان خانہ میں مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ سے ملاقات کے بعد دائرہ شاہ علم اللہ کی دیگر تمام تفصیلات مرحوم سید محمود حسن حسنیؒ سے حاصل ہوئی تھیں، ۱۰۸۳ھ میں تعمیر کردہ ایک قدیم مسجد جو قبلہ کی شکل میں بنی ہوئی ہے، مسجد کے سامنے ایک کنارے چند کچی قبریں جن کے متعلق مرحوم محمود حسنی نے کہا کہ حضرت مولاناؒ کے خاندان کے ایک بزرگ شاہ علم اللہؒ، حضرت مولاناؒ کے والد مرحوم حکیم سید عبدالحی حسنیؒ، حضرت مولانا کے بڑے بھائی اور سابق ناظم ندوۃ العلماء ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ندویؒ (۱۹۲۶ء کے ایم بی بی ایس ڈاکٹر) وغیرہ کی قبریں ہیں، آپ نے مزید بتایا تھا کہ مسجد سے مغرب کی سمت کچھ فاصلے پر ایک ندی بہتی ہے جس کا نام سئی ندی ہے اور اس ندی اور مسجد کے درمیان مسلمانوں کا ایک قبرستان ہے جس میں فکری ترجمان دارالعلوم ندوۃ العلماء "تعمیر حیات" کے سابق ایڈیٹر و مشہور مصنف اسحاق جلیس ندویؒ بھی یہیں مدفون ہیں، علاوہ ازیں حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ سید محمد طاہرؒ اور حکیم فخر الدینؒ کی قبریں بھی موجود ہیں، لیکن ایک خاص بات جس کا اس قبرستان میں مشاہدہ کیا گیا تھا کہ ان تمام قبروں میں کوئی تختی یا کتبہ لکھا ہوا نہیں دیکھا گیا اور الحمدللہ ساری قبریں کچی ہی تھیں، عجیب اتفاق کہ رائے بریلی کے اسی تاریخی قبرستان میں سید محمود حسن حسنی کی بھی تدفین عمل میں آئی۔

اس خوش اخلاق، خوش گفتار و ملنسار انسان کی بہت ساری یادیں وابستہ ہیں، کن کن خوبیوں کا تذکرہ کیا جائے اور کن نیکیوں پر خاموشی اختیار کی جائے اس کا فیصلہ تقریباً ناممکن ہے، لیکن مرحوم بھائی محمود حسنی کی ایک خوبی ہم تمام زندوں کو تادم زیست اس بات

کی ترغیب دیتی رہے گی کہ درود شریف کو کثرت سے پڑھا جائے کیوں کہ مرحوم ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ کسی عبادت کے متعلق قطعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں قبول ہوئی ہے یا نہیں؟ لیکن درود شریف ایک ایسی مقدس عبادت ہے جس کی اللہ کے نزدیک قبولیت یقینی ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيْماً﴾ (الأحزاب:٥٦)

(اللہ تعالی اور اس کے فرشتے اس نبی پر رحمت بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم (بھی) ان پر درود بھیجو اور خوب سلام بھی بھیجتے رہا کرو۔)

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے برادر مرحوم سید محمود حسن حسنیؒ کی محبت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ مرحوم کی زندگی کی آخری کتاب درود شریف ہی کے عنوان سے ''ہدیہ درود وسلام'' پر رقم کی گئی ہے اور جس کا اجراء برادر محترم سید بلال حسنی دامت برکاتہم کے دست مبارک سے دس محرم الحرام ۱۴۴۴ھ کو عمل میں آیا اور جس کے ٹھیک تین دنوں بعد بروز جمعہ ۱۳ رمحرم الحرام ۱۴۴۴ھ کو ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر کے ان نیکیوں وحسنات کے ساتھ اپنے مالک حقیقی سے جا ملی:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحاً وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَداً﴾ (الکهف:١١٠)

(پھر جو کوئی اپنے رب سے ملنے کی امید رکھے تو اسے چاہیے کہ اچھے کام کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے)

آخر میں بارگاہ خداوندی میں دعا ہے کہ باری تعالی ہمارے مرحوم بھائی سید محمود حسن حسنیؒ کو اپنی جوار رحمت میں ڈھانپ لے، اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے، ان کے تمام لواحقین کو صبر جمیل دے اور ہم سب کا خاتمہ بالخیر فرمائے۔ آمین یارب العالمین

محمود صفات شخصیت

پروفیسر محسن عثمانی ندوی
(سابق پروفیسر افلو یونیورسٹی-حیدرآباد)

ایک انگریز صاحب قلم ادیب کا قول ہے کہ کامیاب انسان وہ ہے جو دنیا سے جانے سے پہلے ایسی کتابیں لکھ جائے جو سو سال تک پڑھی جائیں یا کم از کم وہ دنیا میں ایسا بڑا کام کر جائے کہ اس کے بارے میں کتابیں لکھی جائیں جو سو سال تک پڑھی جائیں، یہ وہ دنیوی نقطہ نظر ہے جو دنیا کے اہل علم وقلم میں معروف ومشہور ہے، اہل دین کا نقطہ نظر اس سے مختلف ہے، اہل دین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کامیاب انسان وہ ہے جو اس دار العمل میں ایسے کام کر کے جائے جو اللہ کے یہاں مقبول ہوں۔

محمود حسن حسنی ندوی جن کے لیے اب ''رحمۃ اللہ علیہ'' لکھنا پڑ رہا ہے، ایسی شخصیت تھی جو دین اور دنیا دونوں میں کامیابی کے معیار پر پوری اترتی تھی۔ دنیوی نقطہ نظر کے اعتبار سے دیکھئے اور مولانا محمود حسنی صاحب کی ایک کتاب ''شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی'' اٹھایئے۔ اس کتاب پر مصنف کی حیثیت سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کا نام لکھا ہوا ملے گا۔ یہ کارنامہ مولانا محمود حسن حسنی کا ہے کہ انہوں نے مولانا

علی میاں کی پچاسوں تقریروں اور تحریروں کو جن میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کا ذکر آیا ہے وہ خوبصورت ترتیب عطا کی کہ ایک مرتب کتاب اور ایک منضبط تصنیف تیار ہوگئی۔ تصنیف وتالیف کی پوری تاریخ میں اس کی مثال آسانی کے ساتھ نہیں ملے گی۔ یہ تصنیف کی تاریخ کی ایک نایاب کتاب ہے، یا یوں کہیے کہ یہ حضرت مولانا علی میاں کی وہ کتاب ہے جو انہوں نے اپنے انتقال کے بعد لکھی ہے اور ان کے انتقال کے بعد چھپی ہے۔ اس طرح کی کتابوں کے نمونے تصنیف کی تاریخ میں کم ملیں گے۔ مولانا محمد اویس ندویؒ استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء کی ایک کتاب تفسیر ابن قیم ہے۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کی کوئی کتاب نہیں لکھی تھی، لیکن ان کی کتابوں میں پھیلے ہوئے تفسیری نکات کو مولانا اویس صاحب نے کتابی شکل میں جمع کر دیا تھا۔

راقم سطور کا علم بھی محدود اور مطالعہ بھی محدود، لیکن اس نے مولانا علی میاںؒ کے قلم سے نکلی ہوئی تمام کتابیں پڑھی ہیں، اردو بھی اور عربی بھی اور بعض کتابوں کے انگریزی ترجمے بھی۔ اس لیے یہ غلط فہمی یا خوش فہمی اس کو رہی ہے کہ وہ حضرت مولانا کے افکار وخیالات سے واقف ہے، اس لیے کبھی کبھی اس کے زبان وقلم سے مولانا کے بارے میں وہ باتیں نکل جاتی ہیں جو کوئی اور دوسرا نہیں کہتا ہے، مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی کی آخری زندگی میں مولانا علی میاں رحمۃ اللہ کے وہ ملفوظات سامنے آئے جو انہوں نے رائے بریلی میں رمضان کے مہینہ میں مرتب کیے تھے اور یہ کتاب ہم تک پہنچی اور پھر مولانا نذر الحفیظ صاحب کا انتقال ہوگیا، پھر میں نے ان کی ابوالحسن شناسی پر ایک مضمون لکھا، جس میں میں نے یہ ''عجیب وغریب'' خیال پیش کیا کہ مولانا علی میاں نے عصر حاضر کی بہت سی عظیم گراں مایہ شخصیتوں پر کتابیں لکھی ہیں، جن سے انہوں نے براہ راست دینی اور روحانی استفادہ کیا اور نہ ان سے وابستہ

رہے، لیکن اس کے باوجود یہ شخصیتیں مولانا کی نگاہ میں رول ماڈل نہیں ہیں۔ اس لیے کہ مولانا کا اپنا جو تصور دین تھا (جو ماذا خسر العالم اور دوسری کتابوں میں موجود ہے) اس کے چوکھٹے میں یہ تصویریں اور یہ شخصیتیں پورے طور پر فٹ نہیں ہوتی ہیں، ہاں البتہ سید احمد شہید جیسی شخصیت پورے طور پر فٹ ہوتی ہے۔

میرا گمان تھا کہ میری اس تحریر سے رائے بریلی کے حلقہ میں اور حسنی خاندان میں انقباض ہوگا۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب محمود حسنی رحمۃ اللہ علیہ کا ٹیلیفون آیا جو بہت کم آتا تھا، انہوں نے مجھ سے میرے خیال سے اتفاق کیا تھا۔ میں نے ان کی گفتگو کو اپنے لیے سند سمجھا اور پھر زبانی گفتگو میں مولانا علی میاں کے بارے میں یہ باتیں کئی بار میری زبان پر آئیں۔

کئی سال پہلے رمضان میں جب رائے بریلی جانا ہوا تھا، انہوں نے اپنی کتاب 'تاریخ اصلاح وتربیت'' کا مسودہ دکھایا تھا، پھر اس کی ایک دو جلدیں بھی شائع ہوگئیں، پھر ان کی کتابیں آسمان سے بارش کے قطروں کی طرح برسنے لگیں، سال میں ایک دو کتابیں۔ زیادہ تر کتابیں سیرت وسوانح سے متعلق، وہ ایک سوانح نگار مصنف کی حیثیت سے منظر تصنیف پر سامنے آئے، آخر میں انہوں نے حضرت مولانا رابع صاحب کی خودنوشت سوانح ''اوراق زندگی'' بھی مرتب کر دی جو دو جلدوں میں ہے اور ایک جلد شائع ہو چکی ہے۔ ان کا قلم بے حد سیال تھا، اس سے لہریں اور موجیں اٹھتی تھیں۔ ایک ادیب اور مصنف کی حیثیت سے ان کو قریب و دور کے لوگ جانتے ہیں، لیکن وہ تصوف اور روحانیت اور انساب کے دریا کے بھی شناور تھے، یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے۔ انہیں معلوم ہوا کہ بہار منتقل ہونے سے پہلے راقم سطور کے آباء واجداد پانی پت میں تھے اور جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی جد امجد تھے، اتنا معلوم

ہونے پر انہوں نے بتادیا کہ جلال الدین کبیر لاولیاء، شمس الدین ترک پانی پتی کے خلیفہ تھے اور شمس الدین ترک پانی پتی حضرت صابر کلیری کے خلیفہ تھے۔ تصوف اور اس کے سلسلوں سے ان کی غیر معمولی واقفیت میرے جیسے کم علم کے لیے حیرت انگیز تھی۔ مجھ سے بے تکلف تھے، میں ان سے بطور مذاق کہا کرتا تھا کہ آپ جلد کسی صورت سے خلافت حاصل کیجیے تا کہ میں آپ سے بزور طاقت اور بہ جبر خلافت حاصل کرلوں، یہ سن کر وہ مسکراتے تھے۔ اب کوئی نہیں رہا جس سے اپنی تمام نا اہلیوں کے باوجود زور وزبردستی سے خلافت حاصل کی جائے۔ میری ذات ناستودہ صفات اور مقام خلافت کی بات۔ ''اس حوصلہ کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے۔''

اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا انسان وہ ہوتا ہے جو ملنے والوں سے ان کے ذوق اور مزاج اور ان کی وابستگیوں اور دلچسپیوں کی رعایت کے ساتھ بات کرے، ایک بار ایسا ہوا کہ میں لکھنؤ آیا ہوا تھا، وہ ندوہ کے مہمان خانہ میں ہم سے ملے اور پھر انہوں نے مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کی بے شمار تحریریں جو ''تعمیر حیات'' اور دوسرے رسائل میں شائع ہوئی تھیں، میرے سامنے پیش کردیں اور یہ کہا کہ اس پر مقدمہ لکھ دیجیے تو پھر اسے شائع کرنے کی کوشش کی جائے۔ میں ان دنوں حیدرآباد میں مقیم تھا، میں مضامین کے اس پلندے کو حیدرآباد لے گیا پھر کچھ عرصہ کے بعد بیمار ہوا، پھر دہلی منتقل ہوگیا، اب یاد بھی نہیں رہا کہ میں نے مقدمہ لکھا یا نہیں لکھا، مسودہ واپس کیا یا نہیں اور اب وہ مسودہ کس کے پاس ہے؟ اب اپنی لکھی ہوئی اور پڑھی ہوئی چیزیں یاد نہیں رہتیں، لوگوں کے نام یاد نہیں رہتے، یاد کرنے اور یاد رکھنے کے لائق تو صرف ایک ہی ذات ہے ؎

ما انچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم

اور اکبرالہ بادی کا یہ شعر بھی خوب ہے ؂

وقت طلوع دیکھا وقت غروب دیکھا
اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

اگست ۲۰۲۲ء کا آخری ہفتہ تھا اور ۲۴؍تاریخ تھی، ہمارا دہلی سے لکھنؤ صبح سویرے پہنچنا ہوا اور اسی دن رائے بریلی چلا گیا۔ آسمان سوگوار تھا، ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی، جیسے چشم نم سے آنسوؤں کے قطرے گرتے ہیں۔ عصر اور مغرب کے درمیان ایک مہربان کی رہنمائی میں مولانا محمود حسن حسنی ندوی کے مرقد پر حاضر ہوا۔ ایک خاک کا ڈھیر تھا جس کے نیچے ایک ستودہ صفات ایک جامع حسنات ایک صاحب تصنیفات ہستی عالم برزخ میں جنت کی عطر بیز ہواؤں سے لطف اندوز ہورہی تھی اور آرام فرما تھی، یہی خاک کا ڈھیر ہر شخص کی منزل ہے، فقیر ہو یا غنی، شاہ ہو یا گدا، سب کو یہاں تک آنا ہے اور اس کے بعد اپنے رب کے حضور حاضر ہونا ہے، فاتحہ پڑھی، ایصال ثواب کیا، چند قدم کے فاصلہ پر مولانا علی میاں اور ان کے خاندان کی قبریں ہیں۔ مولانا علی میاں جن کو ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

آزادِ غبارِ آرزو

مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی
(دار المصنّفین۔اعظم گڑھ)

عزیز مکرم مولانا محمود حسن حسنی کی وفات کی خبر آئی تو زندگی اور موت کے فلسفہ نے ایک بار پھر دل اور سوچ کی دنیا میں بے چینی پیدا کردی۔عقیدہ، یقین، ایمان سب برحق۔ اللہ کے ہیں تو نہ زندگی اپنی نہ موت ہی پر اپنا بس۔اس لیے عقل تو یہی بہانہ سجھاتی ہے کہ جب حیات جاوداں کا وعدہ نہیں اور مرگ ناگہاں کی خبر نہیں تو غم کا ہے کا، لیکن دل کو کون سمجھائے جو سب کچھ جاننے سننے کے بعد ویران آنکھوں سے سوال کر بیٹھتا ہے کہ معاملہ یہی ہے تو پھر یہاں دنیا میں رہنے کا مزہ کیا ہے۔مزہ تو دور کی بات ہے جواز ہی کیا ہے؟ بے چینی سے اٹھنے والے سوالوں کے بارے میں شاید اسی لیے کہا گیا کہ جاننا اتنا ضروری نہیں، بعض سوالات بغیر جواب ہی کے سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔وفات کی خبر ملی تو ''معارف'' کے شذرات میں چند لفظوں میں جذبات، صفحات پر منتشر ہو گئے، لکھا گیا کہ

> ''یہ خبر ایک عالم کو افسردہ کرگئی کہ جواں سال مصنف، تذکرہ نگار اور صاحب تصانیف کثیرہ مولانا محمود حسن حسنی ندوی اس دنیائے فانی

سے رخصت ہو گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون! لیاقت، صلاحیت، شرافت اور مروت کی خوبیاں کس طرح ایک وجود کو مثالی جوہر بنا دیتی ہیں، مرحوم اس کا بہترین نمونہ تھے۔ ان کے قلم سے مولانا زبیر الحسن کاندھلوی، شاہ ابرار الحق، مولانا سید محمد ثانی حسنی، مولانا محمد یونس جونپوری، مولانا حسین احمد مدنی، شاہ ولی اللہ دہلوی وغیرہ رحمہم اللہ نامور ہستیوں پر کتابیں نکلیں۔ ان میں اکثر کا تذکرہ معارف میں آیا بھی ہے۔ ان کی وفات ندوہ اور خانوادہ علم اللّٰہی ہی کا نقصان نہیں علم وعرفان کے خدا جانے کتنے جام و پیمانے ان کو یاد کر کے مدتوں رویا کریں گے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ۔‘‘

ان جملوں کی تشریح کی ضرورت ہے، لیکن اس کے لیے ہمت بھی تو ہونی چاہیے۔ ہمارے لیے تو ان کا سر اور ان کا شانہ اس چھوٹے بچے کا تھا جس پر صرف شفقت کا ہاتھ رکھا جاتا ہے، وہ چھوٹے تھے مگر ان چھوٹوں کی طرح نہیں تھے جو سہاروں اور بیساکھیوں سے کھیلتے ہوئے اپنے قد کی درازی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ میرے عزیز ترین اور بچپن کے دوست ڈاکٹر سید احمد حسنی کے بھتیجے تھے۔ احمد مرحوم کا انتقال ہوا تو چاہنے کے باوجود کچھ بھی لکھنے کی ہمت نہیں ہو پائی۔ قریب نصف صدی کے سلسلہ روز وشب کا ایک مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کیا یاد رہا کیا بھول گئے کی کشمکش کا شکار بن جاتا ہے۔ ہم مسلسل سال میں کم از کم ایک دو دن صحبتے با اہل دل والی لذتوں سے ہمکنار ہو جاتے تھے۔ ضیاء عبداللہ، سید نفیس احمد، عبدالعزیز بھٹکلی تو ہمراز وہم نفس تھے ہی، بھائی حمزہ صاحب بھی اس مجلس میں کچھ ساعتوں کے لیے شریک ہو جاتے۔ باتوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے میں احمد یہ بات ضرور دہراتے کہ عمیر نہ

ہوتا تو میں ندوی نہ ہوتا۔اس جملے کی جو تفصیل احمد بیان کرتے وہ تو ہمارے حافظہ کے صفحہ سے یکسر غائب تھی مگر دل کے کاغذ پر احمد کی محبت کے نقوش ضرور جگمگانے لگتے۔

احمد کا یہ ذکر یوں بے محل نہیں کہ مولوی محمود ان کے بھتیجے اور احمد کی وجہ سے وہ ہمیشہ ہم سے بھی چچا بھتیجے کے رشتے کا اعلان کرتے۔ وہ جب اپنی نئی کتاب عطا کرتے تو ضرور کہتے کہ چچا میاں اس پر تبصرہ ضرور کریے گا۔سیرت داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی، اس نام سے ان کی کتاب چھپی تو وہ جو کہتے تھے اس کو لکھ بھی دیا۔ مخدومی حضرت کے الفاظ جہاں ہماری حیثیت کے لحاظ سے بہت زیادہ بھاری تھے، وہیں ''العم المحترم'' کے الفاظ ہماری قسمت کی خوبی کا اشارہ بھی بن گئے۔ وہ چھوٹے تھے بہت چھوٹے، لیکن صرف عمر میں، ورنہ وہ اپنے علم اور اس سے بھی بڑھ کر اپنے عمل سے بہت آگے۔ بہت بلند اور نمایاں ترین مقام پر فائز تھے۔قلم بھی یہی لکھنا چاہتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے دم سے علم وفضل کی بستیاں آباد ہوجاتی ہیں۔ایک طرح دار ادیب اور مفکر نے لکھا تھا کہ جس آبادی میں اہل احسان نہ ہوں اسے خانہ جنگی اور خانہ بربادی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جس تمدن کو اہل کمال کی خدمات حاصل نہ ہوں وہ خوش نما اور دیرپا نہیں ہوتا۔

غور سے دیکھا جائے تو محمود میاں اپنی کمسنی کے باوجود ایسے ہی احسان اور کمال والوں کے زمرہ میں تھے۔ہم اور کئی دوسرے ان کی کم عمری کی بات کرتے ہیں۔ممکن ہے اس میں چھوٹوں کا خیال رکھنے کا غلبہ ہو، لیکن زمانہ اور عمر میں آگے پیچھے کا پیمانہ کوئی حتمی میزان نہیں۔مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے سید احمد شہیدؒ کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ زمانہ کے لحاظ سے پیچھے تھے، لیکن مرتبے کے لحاظ سے بہت آگے۔عجب معاملہ ہے خانوادۂ حسنی میں صرف سید احمد شہید ہی نہیں بیسیوں اصحاب کمال کے نام گنائے جاسکتے

ہیں جو عمر مستعار کے لحاظ سے کم ہیں، لیکن ان کی عظمت ماوراءِ زمان و مکان رہی۔

خانوادوں اور خاندانوں اور حسب و نسب کے حوالوں سے کارناموں اور کارنامے والوں کا جائزہ لینا زیادہ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ خاندان سے اگر نیک نامی ہے تو یہ اللہ کا کرم ہے ورنہ دوسرا رخ اگر ایسا نہیں تو انتساب کے لہجے میں لکنت در آتی ہے۔ اصل پیمانہ تو یہ ہے کہ زندگی کا مقصد اور خود کی قوتوں کا مصرف کیا ٹھہرایا گیا؟ جس انسانی وجود یا جس انسانی گوشت پوست کے درون سے اس کا جواب مثبت انداز میں ملے، فیصلہ اسی کے لحاظ سے کرنا چاہیے۔

ہم نے مولوی محمود کو ہمیشہ خاموش پایا اور زیادہ تر تنہا تنہا، کسی گوشہ میں صرف کتابوں کی دست گیری کرتے ہوئے، جو عمر چہکنے اور چہکانے کی ہوتی ہے، اس عمر میں نگاہیں اگر خلانورد ہو جائیں تو کوئی بھی ہو حیرت سے دوچار ہو سکتا ہے۔

حیرت تو ان کی کتابوں کے ناموں اور ان کے موضوعات و مواد سے بھی ہوتی ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تصنیف و تالیف کا یہ انداز محض مطلق علم کی اشاعت یا اس کے پردے میں اپنی شخصیت کی تشہیر نہیں، بلکہ موضوع، مواد اور مصنف کی فکر سب ایک ہی رنگ میں کسی اور مقصد تصنیف کی خبر دیتے ہیں۔

بزرگوں کے تذکروں کو نئے زمانہ کے دانشور اہل قلم کی توجہات نہ ملنے کا شکوہ ہونا چاہیے مگر ایسا نہیں ہوا۔ براہ راست علوم سے استفادہ بظاہر بہت معقول بات ہے، لیکن ہر علم، ہر فکر، ہر نظریہ کو اپنی قبولیت کے لیے عملی نمونے کی ضرورت ایک عقلی تقاضا ہے۔ مولوی محمود کو یہ نکتہ اپنے گھر ہی میں مل گیا۔ نزہۃ الخواطر کی بابرکت جلوہ گری کہیں یا سیرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلے کی ثمرباری کہیں کہ محمود میاں نے اصلاح و ارشاد کی نمایاں شخصیتوں کی خدمات کے مطالعہ کو اپنا مرکزی موضوع بنا دیا اور ان بزرگوں کو گذشتہ

زمانوں کی شخصیات سے یوں ممتاز کر دیا کہ یہ کرامتوں اور خلوتوں کی نجی کیفیتوں کا ذکر نہیں، یہ انسانوں کے انسانوں سے رشتوں اور ان کی افادیت اور انجام کار سرخرو ہونے کی کلید ہیں۔ ان کتابوں کے ابواب کے عنوان دیکھتے جایئے تو حیات و خدمات سے کہیں زیادہ علمی کمالات، اوصاف و خصوصیات، افکار و نظریات اور تعلیم و ارشاد سے بحث ہے۔ ایک اچھے انسان کی شکل میں ان کو دیکھے جانے کی چاہت اور ان کی اچھائیوں کو دکھائے جانے کی ضرورت، یہ طرز دانستہ اپنایا گیا ہے۔ ان شخصیات سے محبت کیوں؟ سارا زور اسی کے جواب کے لیے وقف، اچھوں اور اچھائیوں سے قریب کرنے کی تمناؤں کا عجیب معصومانہ انداز۔ وہ انداز جو صرف خوبیوں کو عام کرنے اور فائدہ میں دوسروں کے شریک کرنے کا ہے، اگر یہ راز سمجھ میں آ جائے تو محمود میاں ہی کیا، ہر لکھنے والے کے دل و دماغ میں جھانکنے کے سارے دروازے کھل جاتے ہیں۔

اور کتابوں کو چھوڑیے، انہوں نے اپنی نانی محترمہ کے حالات میں کتاب عائشہ بی مرتب کر دی۔ عائشہ بی محترمہ کو ایک دنیا امۃ اللہ تسنیم اور ان کے رسالہ ''رضوان'' کے ذریعہ جانتی ہے۔ بعض گھروں میں تو گھر کی نانی دادی کا ذکر آتا نہ نام لیا جاتا، ان سے زیادہ ذکر محترمہ خیر النساء بہتر اور محترمہ امۃ اللہ تسنیم کا ہوتا۔ محمود میاں کو اپنی والدہ اور خاندان کی دوسری خواتین اور کچھ مضامین کے ذریعہ جو معلوم ہوا، اس کو جس سلیقہ سے پیش کیا، اس کو مولانا سید محمد رابع ندوی مدظلہ نے اچھی صلاحیت کے ثبوت کے طور پر دیکھا۔ ہم جیسے کم علموں کے لیے تو اس کتاب کی ادبی شان بھی بڑی دلکشی رکھتی ہے۔ عمدہ اردو بلکہ وہ اردو جو لکھنؤ اور اس کے اطراف کی پہچان ہے۔ اس کا مذہبی تذکروں میں اس خوبی سے استعمال عجیب کچھ لطف دیتا جاتا ہے۔

اس کتاب کے برسوں بعد شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوری پر ان کی ضخیم

کتاب آئی۔ دوران تصنیف ایک ملاقات میں انہوں نے کہا: معارف میں شیخ کے متعلق نہیں لکھا گیا۔ لکھ دیا جاتا تو اپنی کتاب میں اس کو نقل کرنے کی مسرت حاصل کرتا۔ بلند پروازی کے بعد یہ خاکسارانہ انداز ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے لیے دل کے درو دیوار کو کوثر و تسنیم سے مصفی کرنا اور اخلاص و محبت کی قندیلوں کو روشن کرنا ہوتا ہے۔ مولوی محمود کے دل کی طہارت اور اندرون میں نورانی جلووں کی تابانی تھی، جس نے ان کو بڑوں چھوٹوں سب کے دلوں میں جگہ بنانے کا ہنر عطا کر دیا تھا۔

تذکرہ نگاری، سچ یہ ہے کہ کھوئے ہوؤں کی جستجو کا ایک اشاریہ ہے، آتش رفتہ ہو یا دل کی دنیا کی شکست و ریخت ہو، دل بہلتا ہے تو ان ہی یادوں کے رنگوں اور خوشبوؤں سے۔ مولوی محمود کے دل میں کیا آگ تھی کہ انفرادی تذکروں سے جی نہ بھرا تو انہوں نے اصلاح و تربیت جو تذکرہ نگاری کا واحد مقصد ہے اسی کی تاریخ مرتب کرنے کی ٹھان لی۔ پہلی جلد چھ سو چھپن صفحوں پر چھپوا دی۔ دوسرے حصے معلوم نہیں شائع ہوئے یا نہیں۔ لیکن یہ جلد اول کہیں سے کم نہیں، تشنہ نہیں، محسن انسانیت ﷺ سے شہید کربلا تک ان پراسرار بندوں کی زندگی جن کی ٹھوکروں سے دریا و صحرا کو دو نیم ہونے میں تاخیر نہ ہوتی۔ پہاڑ ان کے سامنے سمٹ کر رائی بن جاتے۔ ان کی زندگیوں سے آشنائی کی لذت کا اصل لطف لینے کے لیے یہ کتاب ایک پاکیزہ نعمت بن گئی۔ لگتا ہے علامہ شبلی کی طرح ہمارے محمود میاں کو اپنی زندگی کی مدت کا اندازہ تھا۔ اس لیے ایک بے قراری تھی کہ جو پڑھا، جو سمجھا، جو دل کو لگی اور دل پر گزری، سب کو جلد سے جلد سرمایہ کی گٹھری بنا کر پیش کر دیا جائے کہ یہی تو وہ سرمایہ ہے جس سے دل مطمئن ہوتا ہے کہ کچھ تو کر چلے۔

محمود میاں یقیناً مقام محمود پر نظر آئیں گے۔ اس دنیا میں بھی اور اس دنیا میں بھی، کیوں کہ وہ دو لفظوں میں صاف و شفاف تھے ؎

تیرا آئینہ تھا آزادِ غبارِ آرزو

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

ڈاکٹر محمد اکرم ندوی
(آکسفورڈ)

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انساں نکلتے ہیں

برادر مکرم مولانا سید محمود حسن حسنی سے چند روز پہلے فون پر گفتگو ہوئی، بات زیادہ تر علمی و تصنیفی امور سے متعلق تھی، صحت کے بارے میں سوال کیا تو دعا کے لیے کہا، اس طرح کی بیماری اور مصیبت و تکلیف میں بڑے بڑوں کا حوصلہ جواب دے جاتا ہے، مگر ان کا حوصلہ لائق داد تھا اور صبر و تحمل قابل رشک، کوئی شکایت نہیں، اظہار کرب نہیں اور مایوسی کا کلمہ نہیں، بلکہ ایک متشکر شریف انسان کا رکھ رکھاؤ، اس حالت میں بھی بات خالص علمی کرتے، بات کیا ہوتی ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی'' کا مصداق ہوتی:

با ایں ہمہ ضعف و ناتوانی
دانی چہ کارہا نہ کردیم

دو تین روز پہلے عزیز گرامی سید خلیل حسنی کا پیغام آیا کہ محمود بھائی کے لیے حرم

شریف میں دعا کروں، پرسوں برادر معظم مولانا سید جعفر مسعود حسنی کو فون کیا، وہ اس وقت اسپتال میں محمود بھائی کے پاس تھے، کہنے لگے: آپ نے بہت مناسب وقت پر فون کیا اور اس کے بعد محمود بھائی کی بیماری پر تشویش ظاہر کی، وہیں ان کے بھائی مولانا مسعود حسنی تھے، ان سے بھی بات ہوئی، میں نے عرض کیا کہ جب محمود بھائی کی حالت کچھ بہتر ہو تو میرا سلام عرض کردیں، اس یاددہانی کے بعد میں نے ان کی صحت کے لیے دعا کا اہتمام کیا اور ہم دعا کے سوا کیا کرسکتے تھے، اللہ تعالیٰ کا فیصلہ برحق ہے، قضا آئی اور آج (بروز جمعہ ۱۴ر محرم ۱۴۴۴ھ) صبح کے وقت انتقال کی خبر ملی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

مولانا مرحوم حسنی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے، ان کی والدہ سیدہ امامہ حسنی رحمۃ اللہ علیہا استاد محترم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی تھیں، محمود بھائی کی پیدائش ۲۸ر جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۲ر جولائی ۱۹۷۱ء کو ہوئی، انہوں نے اپنے گھر کے علمی، صالح اور پاکیزہ ماحول میں نشوونما پائی، مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر ندوہ سے ۱۹۹۰ء میں عالمیت اور ۱۹۹۲ء میں فضیلت کی اور المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی کا ایک سالہ کورس مکمل کیا۔

فراغت کے بعد سے علم کو اوڑھنا بچھونا بنالیا، مدرسہ ضیاء العلوم میں مدرسی کی، دارعرفات رائے بریلی کے شعبہ تحقیق و تصنیف سے منسلک ہوئے، یوں اپنی صلاحیت کی پختگی اور علمی ترقی کا اہتمام کیا اور طلبہ کے افادہ کا بازار گرم رکھا۔

ایک عرصہ سے ندوہ کے پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' کے نائب مدیر تھے، ماہنامہ ''رضوان'' اور ''پیام عرفات'' کی مجلس ادارت کی رکنیت سنبھالی، علمی حلقوں میں ان کی شہرت ایک سنجیدہ محقق اور متین و شائستہ فکر کے حامل مصنف کی حیثیت سے ہوئی،

میں نے ان کی کئی تصنیفات پڑھی ہیں اور ان سے حسنی خاندان کی تاریخ ونسب کے متعلق استفادہ بھی کیا ہے، اس خاندان کی تاریخ پر اس وقت شاید ان کو ملکہ تامہ حاصل تھا، ایک مرتبہ استاد محترم حضرت مولانا سید محمد واضح رشید ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے آباء واجداد کے متعلق کچھ معلومات چاہی تو فرمایا کہ محمود سے رابطہ کرو، اس موضوع پر سب سے اچھی نظر ان کی ہے، اس بہانہ ان سے رابطہ استوار ہو گیا اور اکثر فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔

ان سے میرے تعلق کا آغاز ان کی طالب علمی کے زمانہ سے رہا ہے، وہ ہمیشہ محبت اور عقیدت سے ملتے، کراچی کی مجلس نشریات اسلام کے ناظم مولانا فضل ربی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۴۲۷ھ مطابق ۲۰۰۶ء میں میری کتاب ''ندوہ کا ایک دن'' چھاپنی چاہی تو اس وقت محمود بھائی وہیں مقیم تھے، چنانچہ مولانا فضل ربی صاحب نے ان سے بھی مقدمہ لکھوایا، اس مقدمہ میں انہوں نے میرے ساتھ گہرے تعلق کا اظہار کیا، یہاں ایک مختصر اقتباس پیش ہے، محمود بھائی نے لکھا:

> ''کتاب دلچسپ ہے، مؤثر ہے، معلومات افزا ہے اور ایسے طالب علم کی طرف سے ہے جو اپنی علمی اور تصنیفی خدمات کی بنا پر علمی حلقوں میں ایک اونچا مقام پیدا کر چکے ہیں اور ایک تاریخی کارنامہ بھی انجام دے رہے ہیں کہ وہ ان خواتین اسلام کے حالات وکارناموں کو مرتب کر رہے ہیں جن کی علمی خدمات رہی ہیں اور انہیں دینی مقام بھی حاصل رہا ہے، یہ کام ان کا تقریباً چالیس جلدوں میں عربی میں سامنے آرہا ہے، اگر ایسا ہو جاتا ہے تو پھر وہ ذہبی وقت کہے جائیں گے۔''

محمود بھائی نے سوانح نگاری کی ایسی مشق بہم پہنچائی تھی کہ اس صنف کے

صاحب طرز مصنفین میں ان کا شمار ہونے لگا تھا، ان کی چند کتابوں کے نام ہیں:
''تاریخ اصلاح وتربیت''''سیرت داعی اسلام حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ''
''تذکرہ مولانا زبیرالحسن''''فرشتہ صفت انسان: سوانح فلسفی اسلام مولانا عبدالباری ندوی''''حیات شاہ ابرارالحق'' وغیرہ، انہوں نے ''تذکرہ مولانا محمد یونس جون پوریؒ'' لکھی تو طباعت سے پہلے پوری کتاب مجھے پڑھنے کے لیے دی اور میں نے ان کی طلب پر کچھ مشورے دیے جن پر انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور کتاب کی اشاعت سے پہلے ان کی روشنی میں کچھ اصلاحات کیں۔

ان کی ایک کتاب ہے ''تذکرہ مولانا عبدالباری ندوی بھٹکلی'' جو انہوں نے مجھے تحفۃً دی، مولانا عبدالباری ندوہ میں میرے درجہ کے ساتھی تھے، انہوں نے جامعہ اسلامیہ بھٹکل کی جس طرح خدمت کی اور بھٹکل میں جس طرح اصلاح ودعوت کا کام کیا اس کی نظیر نہیں، مولانا کی زندگی کی جو تفصیلات آئی ہیں وہ قابل رشک ہیں، پاک دل، پاک ذات و پاک صفات، محمود بھائی نے ان کی سوانح لکھ کر علم وانسانیت کی ایک بڑی خدمت انجام دی۔

مرحوم متواضع، کریم النفس اور با اخلاق انسان تھے، جب بھی لکھنؤ یا رائے بریلی میں ملاقات ہوتی، بڑے تپاک سے ملتے، چہرہ خوشی سے کھل جاتا اور پورے جسم سے تروتازگی کے آثار ہویدا ہوتے، میری علمی سرگرمیوں کے متعلق استفسار کرتے اور اپنی تصنیفات وتحقیقات کا ذکر کرتے، کتابیں ہدیہ کرتے، طبیعت ان کی طرف مائل ہوتی اور ان سے مل کر بہت خوشی ہوتی، مجھ سے ان کا تعلق خالص علمی تھا، ورنہ آج کی دنیا میں خلوص اور علمی رشتہ کو کون پوچھتا ہے؟ ؏

سود وزیاں کو نظر میں رکھ کر کرتے ہیں یارانے لوگ

محمود بھائی کو تصوف سے مناسبت تھی اور اس کے اثرات کبھی کبھی ان کی تحریروں اور مکالمات سے عیاں ہوتے، گرچہ وہ اس کی کوشش کرتے کہ یہ اسرار نااہلوں سے پوشیدہ رہیں، یعنی ''حدیث دل با اہل دل گو'' کی حکمت زریں پر عمل پیرا ہوتے، انہوں نے اپنے خاندان کی شریفانہ روایت کی پاس داری کی، دوسروں کو نفع پہنچاتے اور کبھی کسی کو نقصان نہ پہنچاتے، جب کہ دوسروں کو اذیت دینا فرومایگان زمانہ کا عام شعار ہے، جو برائیاں عقاب کی آنکھ سے چنتے ہیں اور صبا کی رفتار سے پکڑتے ہیں، مگر مرحوم زمانہ کی اس روش سے مختلف تھے، اسی لیے ان کی دوستی اور تعلق کو ہم وجہ سعادت اور باعث فخر سمجھتے تھے۔

ان کا یہ سانحہ کم عمری میں پیش آیا ہے، استاد محترم حضرت مولانا رابع صاحب دامت برکاتہم کے لیے اس طرح کے حادثات کا پیہم آنا بڑا صبر آزما ہے، یہ آپ کی ایمانی قوت کی دلیل ہے، ہم برادر معظم مولانا سید جعفر مسعود حسنی، مرحوم کے بھائی مولانا مسعود حسن حسنی، مولانا منصور حسن حسنی اور دیگر اہل خانہ کو صدق دل سے تعزیت پیش کرتے ہیں، مرحوم کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا کرتے ہیں اور اپنے اس درد کا اظہار کرتے ہیں کہ کس طرح اصحاب فکر و قلم یکے بعد دیگرے رخصت ہوتے جارہے ہیں اور ان کی جگہ لینے والا کوئی نہیں۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

یہ لوگ بھی اٹھ جائیں گے اس بزم وفا سے
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی
اور علمائے امت کی سوانح نگاری

ڈاکٹر ولی الدین ندوی
(جامعہ اسلامیہ، مظفر پور اعظم گڑھ)

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی ایک باکمال اور بڑی خوبیوں کے مالک عالم دین تھے، جو علماء و صالحین امت کے تذکرہ نگار کی حیثیت سے علمی دنیا میں معروف و مشہور ہو رہے تھے، ان سے امت کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں کہ اچانک انہوں نے ۱۳؍محرم ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۲؍اگست ۲۰۲۲ء جمعہ کے روز ۵۳؍سال کی عمر میں اس دار فانی کو الوداع کہا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون، ان للہ ما أخذ و له ما أعطی و کل شئ عنده بأجل مسمی!

مولانا محمود حسن حسنی ندوی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پندرہ روزہ جریدہ ''تعمیر حیات'' کے نائب ایڈیٹر تھے، رائے بریلی کے معروف حسنی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے آغوش تربیت میں

پلے بڑھے، اس کے بعد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ، حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ، حضرت مولانا سید عبداللہ محمد الحسنی ندویؒ سے بھرپور استفادہ کیا، مرحوم کے نانا حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ بڑے مصنف وشاعر اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نہایت قریبی شاگردوں اوران کے مجاز تھے۔

مولانا محمود حسنی مرحوم کی ایک ایسی خوبی جس میں وہ بہت نمایاں نظر آتے ہیں وہ ہے ان کا اپنے بڑوں اور اصحاب فضل وکمال سے نیاز مندانہ تعلق اور رابطہ، ان کی خوبیوں اور کمالات کا تذکرہ، بزرگوں کے بارے میں جہاں ان کی زبان پر تذکرے ہوتے تھے، وہیں انہوں نے بڑے بڑے علماء کے حالات مفصل طور پر لکھے اوران کے اس کام کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی، انہوں نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ حضرت مولانا ابرارالحق ہردوئی کے حالات وکمالات بیان کرنے کے لیے ''تذکرہ حضرت مولانا ابرارالحق صاحب'' لکھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فرزند جلیل اور فاضل یگانہ حضرت مولانا عبدالباری ندوی کی سیرت وسوانح پر ''حیات عبدالباری'' کے نام ۸۴۳ رصفحات پر مشتمل نہایت بیش بہا تصنیف امت کے سامنے پیش کردی، اس کتاب کی تقریظ میں مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے مولانا محمود حسن حسنی ندوی کے بارے میں اپنے بلند کلمات کے ذریعہ ان کی تذکرہ نگاری کی خوبی اوران کے ذاتی کمالات پر بھی روشنی ڈالی ہے، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی ''حیات عبدالباری'' کی تقریظ میں لکھتے ہیں:

''برادر معظم مولانا محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے نواسہ عزیزی محمود حسن حسنی ندوی نے جو سوانح نگاری کا بڑا اچھا ذوق اور سلیقہ رکھتے

ہیں، اس اہم خدمت کو انجام دیا، ان کو سوانح نگاری کا ذوق اپنے نانا مرحوم سے وراثت میں ملا ہے، عزیزی محمود حسن حسنی ندوی نے اس سے پہلے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ اجل حضرت مولانا ابرار الحق حقی صاحب کی سوانح تحریر کی جو بہت مقبول ہوئی، مولانا عبد الباری صاحب کے فرزندوں کے اصرار پر انہوں نے مولانا عبد الباری ندوی کی سوانح بڑی محنت، دل چسپی اور تحقیق کے ساتھ تحریر کی، جس میں ان کے ساتھ ان کے اساتذہ ومشائخ اور معاصرین علماء کا بھی تذکرہ آ گیا ہے اور ان کی تصنیفات کا تعارف بھی! عزیزی محمود حسنی سلمہ کو خال مخدوم ومعظم مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی بھی علمی ودینی سرپرستی حاصل ہوئی اور ان کے بعض کاموں میں معاونت کا شرف بھی ان کو ملا۔‘‘

تحریک دعوت وتبلیغ کے اہم رکن مولانا زبیر الحسن کاندھلویؒ کے حالات وخصوصیات بیان کرنے کے لیے ’’تذکرہ حضرت مولانا زبیر الحسن کاندھلوی‘‘ لکھی جو ۲۲۴ر صفحات پر مشتمل ہے، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جونپوری کی حدیثی خدمات اور اپنے عہد کے علماء وصلحاء سے ان کے تعلقات اور علم ودین کے سلسلہ میں ان کی زریں خدمات کو نمایاں کرنے کی خاطر ’’سوانح حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوری‘‘ ۵۸۴ر صفحات پر مشتمل ایک مبسوط کتاب لکھی، داعی اسلام مولانا سید عبد اللہ حسنی ندوی جو مولانا محمود حسن حسنی ندوی کے ماموں بھی تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو متعدد خصوصیات سے نوازا تھا، ان کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوئی، کیونکہ ۵۶ر سال کی عمر میں انہوں نے وفات پائی، لیکن مشائخ کی توجہ وعنایت سے ان کی ظاہری وباطنی

احوال وکارنامے ایسے تھے کہ ان پر مستقل کتاب کی تصنیف کی ضرورت تھی، ان کے حالات وکمالات، خصوصیات وخدمات، طریقہ اصلاح وارشاد اور خدمت دین اور اشاعت اسلام کے لیے ان کی قربانیوں اور انتھک کوششوں کے بیان پر مشتمل ۶۳۹/صفحات میں پھیلی ہوئی ایک اہم دستاویزی کتاب ''سیرت داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی'' لکھ کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا، اس کتاب پر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہم، حضرت مولانا سید محمد نظام الدین صاحب سابق جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تقریظ کے ساتھ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی زیدمجدہم کا مبسوط مقدمہ ہے، اس میں انہوں نے مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی کے لکھنے میں برق رفتاری پر حیرت واستعجاب ان الفاظ کے ساتھ ظاہر کیا ہے کہ

> ''جب مجھے مولانا محمود صاحب نے یہ اطلاع دی کہ ہم نے مولانا حسنی (حضرت مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ) کی سوانح مرتب کی ہے تو مجھے خیال ہوا کہ اس کے لیے ضروری تیاری کے بعد کام شروع کیا ہوگا، اس گفتگو کی دوسری صبح جب مولانا محمود صاحب نے یہ کتاب سامنے لاکر رکھ دی تو میں اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ابھی مولانا عبد اللہ صاحب کی وفات پر وقت ہی کتنا گزرا ہے، دیکھا جائے تو دو مہینے سے زیادہ کا حساب نہیں آتا، اگرچہ مولانا عبد اللہ صاحبؒ مصنف کے ماموں تھے اور دونوں برسوں سے سفر وحضر میں اکثر ساتھ رہتے تھے اور مؤلف کتاب مولانا عبد اللہ کی خصوصیات وکمالات، خدمات، طریقہ اصلاح وارشاد اور اشاعت خدمت دین کی جدوجہد نیز اس میں مولانا کے فکر ومزاج اور طرز عمل سے خوب واقف تھے،

مگر یہ سب باتیں مولانا محمود صاحب کو اس قدر یاد اور مستحضر ہوں گی، وہ ان کو یوں بے تکلف لکھتے چلے جائیں گے، اس کا خیال تک نہیں تھا، اس کو مولانا عبداللہ کی خدمات کی عنداللہ مقبولیت کا نشان کہیے یا مولانا محمود کی مولانا سے غیر معمولی گہری محبت کی علامت کہ وہ اس قلیل عرصہ میں اس مشکل مرحلہ سے کامیاب گزرے اور یہ تذکرہ وسوانح قارئین کے سامنے پیش کردیا۔''

اور بزرگوں کے منظور نظر مشہور سوانح نگار مولانا سید محمد ثانی حسنی کے حالات وخصوصیات اور ان کے علمی ودینی ودعوتی خدمات اور کارناموں کو ''سوانح حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ'' لکھ کر اپنی تذکرہ نگاری اور سوانح نویسی کا عمدہ نمونہ پیش کیا، یہ کتاب بھی ۵۳۷ صفحات پر مشتمل ہے، ان سب تصنیفات سے ان کی سوانح نگاری سے خاص شغف اور علماء وصالحین امت سے محبت وتعلق کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ اپنے بڑوں اور بزرگوں سے گہرا نیازمندانہ تعلق رکھتے تھے، راقم السطور کے والد ماجد محدث جلیل حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی دامت برکاتہم سے بھی مولانا محمود حسن حسنی ندوی بہت قریب رہے، والد صاحب دامت برکاتہم کا اس خاندان حسنی سے جو دیرینہ تعلق قائم ہے، وہ مخفی نہیں ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بعد اسی طرح حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب دامت برکاتہم سے ہر معاملہ میں رائے ومشورہ والد صاحب ضروری خیال فرماتے ہیں، جامعہ اسلامیہ کے تعلق سے ان ہی کی رائے عالی اور گراں قدر اشارے ومشورے کو والد صاحب حرز جاں سمجھتے ہیں، اس خاندان کے دوسرے افراد سے بھی وہی محبت وتکریم کا سا معاملہ رہتا ہے، مولانا محمود صاحب پر حضرت والد صاحب کی

بے پناہ نگاہ شفقت تھی، وہ بھی بزرگوں کی طرح والد صاحب کا احترام کرتے تھے، مولانا محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ جو والد صاحب کے معاصر اور رفیق تھے، ان کے بارے میں حضرت والد صاحب نے ایک مختصر مگر جامع تحریر محمود حسنی صاحب ہی کے اصرار وتقاضے پر لکھ کر دی، جس کا ذکر والد صاحب نے ''تذکرۂ رفتگاں'' میں فرمایا ہے کہ ''مولوی محمود حسنی صاحب کے کہنے پر یہ چند سطریں لکھوادی ہیں۔'' وہ جب بھی جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ آتے تو والد صاحب کے لگائے ہوئے علمی باغ کی سرسبزی وشادابی دیکھ کر نہایت درجہ خوش ہوتے اور والد صاحب سے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار کرتے، ناچیز کے ساتھ بھی ان کا معاملہ محبت کا معاملہ تھا، انہوں نے جب شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوری کے حالات وخدمات پر مشتمل کتاب لکھی تو اس میں والد ماجد حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری دامت برکاتہم معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بارے میں جہاں پر تذکرہ کیا ہے اور ان کے علمی وعملی فیوض وبرکات کو بیان کیا ہے، اس کو بڑی محبت وخلوص سے دکھایا تھا اور اس پر اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا کہ محدث جلیل حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری دامت برکاتہم کے تذکرہ کا شرف بھی ان کو حاصل ہو رہا ہے۔

مولانا محمود حسنی ندوی کا تیز رفتار اور رواں قلم اہل اللہ ومشائخ کی داستان مرتب کرنے میں بڑا تیز مگر محتاط تھا، کہیں بھی ان کی شان میں کوئی کمی نظر نہیں آتی، یہی قلم کی اصل خوبی ہے، اس بات کے ذکر کرنے میں کوئی تردد نہیں کہ ان کی تحریر میں حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب مدظلہ العالی کی تحریر کا عکس محسوس ہوتا تھا، علماء واہل اللہ کی دعاؤں کے ساتھ وہ بارگاہ رب العزت میں پہنچ گئے، اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے سرفراز فرمائے اور اپنی دائمی نعمتوں سے مالا مال فرمائے۔ آمین!

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی
(جنرل سکریٹری رابطہ ادب اسلامی برصغیر)

ایک طویل علالت کے بعد بالآخر مولانا محمود حسن حسنی ندوی بھی ہم سے رخصت ہوگئے، کل تک ہم ان سے بات کرتے تھے، آج ہم ان کی باتیں کریں گے، ان کی خوبیوں اور نیکیوں کی بات کریں گے، وہ خوبیاں اور نیکیاں جو مادیت کے اس دور میں اب کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں اور اگر ملتی بھی ہیں تو صرف ان حضرات کے یہاں جو دین کے پابند، شریعت کے تابع اور صرف اور صرف رضائے الٰہی کے طلب گار ہوتے ہیں جو دنیا میں رہتے ہیں ایک مسافر کی طرح، زندگی گذارتے ہیں ایک زاہد کی طرح، جو لینے پر نہیں دینے پر یقین رکھتے ہیں، اپنی فکر کم دوسرے کی فکر زیادہ رکھتے ہیں، اپنا شوق نہیں صرف اپنی ضرورت پوری کرتے ہیں، جن کی نظر منزل پر ہوتی ہے اور منزل کی راہ میں حائل روڑوں کو جن کو مادہ پرست نگاہیں ہیرے جواہرات سمجھ کر چکا چوند ہونے لگتی ہیں، ان روڑوں کو ٹھوکر مار کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتے ہیں، ہمارے محمود حسن حسنی ندوی مرحوم بھی انہی مبارک اور برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک تھے۔

وہ عمر میں تقریباً مجھ سے دس سال چھوٹے تھے، لیکن علم اور عمل میں وہ مجھ سے کئی سال بڑے تھے، ان کا کمال تھا کہ رشتہ اور عمر کے اس فرق کا ہمیشہ انھوں نے لحاظ رکھا اور وہ ادب برابر ملحوظ رکھا جو ایک بھانجہ اپنے ماموں کے ساتھ رکھتا ہے، میں تو پھر بھی ان سے دس سال بڑا تھا، مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی تو عمر میں ان سے صرف دو ڈھائی سال ہی بڑے تھے، درجہ کا فرق بھی ایک ہی دو سال کا رہا ہوگا، ہر کام میں شریک، ہم خیال اور ایک دوسرے کے معاون لیکن چونکہ بلال رشتہ میں بڑے تھے، ماموں لگتے تھے، چنانچہ محمود مرحوم اس رشتہ سے ان کا پورا ادب کرتے تھے، احترام کرتے تھے اور پوری اہمیت دیتے تھے۔

مرحوم محمود حسنی عقائد میں، عبادات میں، اخلاق میں، معاملات میں، سخاوت وفیاضی میں، مہمان نوازی میں، صلہ رحمی میں، پڑوسیوں کا خیال رکھنے اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں ہم سب کے لیے ایک نمونہ تھے، وہ جو تھے وہی نظر آتے تھے اور جو نظر آتے تھے وہی تھے، نہ ان کے چہرہ پر تقویٰ کا کوئی نقاب تھا اور نہ ان کے جسم پر تصوف کا کوئی لبادہ، تقویٰ ان کے اندر تھا اور حقیقی تصوف جس نے ان کو احسان کے مرتبہ کے تک پہنچا دیا تھا، ان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہا تھا، ظاہر وباطن کی یہ وہ یکسانیت تھی جو صرف اللہ والوں کے یہاں ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

مرحوم کی مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ مہمان کسی کا ہو، ملنے کسی اور سے آیا ہو، اس کی خاطر داری وہ ایسی کرتے کہ جیسے کہ وہ انھی کا مہمان ہے اور صرف انھی سے ملنے کے لیے آیا ہے، رشتہ دار کے ساتھ معاملہ ایسا کرتے کہ لگتا کہ سب سے زیادہ قریبی رشتہ اس کا انھی سے ہے، وقت بھی دیتے، تواضع بھی کرتے، رشتہ کی نوعیت بھی بتاتے اور دوسرے رشتہ داروں کا تعارف بھی کراتے۔

انھوں نے اپنے دادیہال اور نانیہال دونوں کی خوبیاں پائی تھیں، ان کے اندر

تواضع بھی تھی، انکساری بھی تھی اور بے نفسی بھی، ایمانی حمیت بھی تھی، عقیدہ کی پختگی بھی تھی، شرک وبدعت سے نفرت بھی تھی اور حق کے معاملہ میں بے لچک رویہ بھی، ان کو اپنی ذات کے لیے کبھی غصہ ہوتے نہیں دیکھا گیا، ہاں اگر دین وشریعت کے خلاف کوئی بات ہوتی یا جمہور اہل سنت والجماعت کے موقف سے ہٹ کر کوئی موقف پیش کیا جاتا یا کسی نیک بندہ پر کوئی غلط تبصرہ ہوتا یا کسی بزرگ شخصیت کے ساتھ بے ادبی کا کوئی معاملہ ہوتا تو پھر ان کا طیش میں آنا طے تھا، وہ سخت لہجہ میں نکیر کرتے یا تو اپنی بات منوا لیتے یا اس مجلس سے اٹھ کر چلے جاتے، کیوں کہ وہ جانتے تھے اور صرف جانتے ہی نہیں، تاریخ کی کتابوں میں محفوظ وہ واقعات ان کی نظروں کے سامنے تھے جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اللہ کے نیک بندوں کے سلسلہ میں کی گئی بے بنیاد باتوں کے نقصانات پہنچ کر رہتے ہیں۔

حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنی والدہ کے حکم پر اپنے کو اپنے نانا مولانا سید محمد ثانی حسنی ندویؒ کے دونوں بھائیوں مولانا محمد رابع حسنی ندوی (دامت برکاتہم) اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوری طرح حوالہ کر دیا تھا، انہی کے ساتھ قیام، انہی کے ساتھ سفر، انہی کے علمی کاموں میں معاونت، انہی کے ساتھ کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت، انہی کے ساتھ معروف ومشہور علمی شخصیات سے ملاقاتیں اور اپنے علمی وتصنیفی کاموں میں انہی دونوں حضرات سے رائے اور مشورہ اور پھر انہی کی رائے اور انہی کے مشورہ پر عمل، یہ وہ چیز تھی جس نے ان کی شخصیت کو سنوارنے اور ان کی افادیت کے دائرہ کو وسیع کرنے کا کام کیا، ان دونوں حضرات کے ساتھ اسفار کا ایک فائدہ ان کو یہ بھی ہوا کہ وہ تقریر کے میدان میں بھی آ گئے، وہ مجلسوں میں تو بولتے تھے اور پوری قوت سے بولتے تھے لیکن اسٹیج سے دور رہتے تھے، لیکن اسفار میں یہ ہوتا تھا کہ بعض جلسوں میں

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی جگہ ان کو تقریر کرنی پڑ جاتی تھی، کیوں کہ ہر جلسہ میں مولانا جا نہیں سکتے تھے، لہٰذا وہ محمود مرحوم کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیج دیتے تھے، اس طرح محمود مرحوم دھیرے دھیرے مقرر بھی بن گئے۔

محمود مرحوم کے بارے میں یہ بات تقریباً یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ جو کام کرتے تھے اللہ کے لیے کرتے تھے، قریب ہوتے تو اللہ کے لیے، دور ہوتے تو اللہ کے لیے، ناطہ توڑتے تو اللہ کے لیے، ناطہ جوڑتے تو اللہ کے لیے، اپنی کوئی مصلحت، اپنا کوئی مفاد، اپنی کوئی غرض اور اپنی کوئی ضرورت ان کے پیش نظر نہیں ہوتی تھی، سات قسم کے لوگوں کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ اس دن عرش کے سایہ میں ہوں گے جس دن سوائے عرش کے سایہ کے کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا، محمود مرحوم میں ایسی کئی چیزیں پائی جاتی تھیں کہ یقین ہے کہ ان سات قسم کے لوگوں میں وہ بھی شامل ہوں گے۔

سیاست اور سیاسی لوگوں سے محمود مرحوم کو ذرا بھی دلچسپی نہ تھی، نہ انہیں ان کو دیکھنے کا کوئی شوق تھا اور نہ ان سے ملنے کی ان کو کوئی خواہش، ندوہ کے مہمان خانہ میں جب اس طرح کے سیاسی لیڈروں کی آمد ہوتی تو ہر آدمی کو شوق ہوتا کہ ان کو دیکھے، ان کی باتیں سنیں اور اگر ہو سکے تو ان کے ساتھ ایک آدھ تصویر بھی کھنچوالے، لیکن اس موقع پر محمود مرحوم یا تو دوسرے کمرے میں جا کر اپنے کسی علمی کام میں مشغول ہو جاتے یا پھر وہ والد محترم مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ گھر چلے آتے، کیوں کہ ان کو ذرا بھی اس طرح کے لوگوں سے مناسبت نہ تھی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کو ان سے وحشت تھی، یوں تو وہ جب گھر آتے تو عام طور پر تینوں یعنی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی اور مرحوم محمود حسن حسنی

ساتھ ہی آتے تھے، لیکن جب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے بغیر یہ دونوں حضرات آتے تو میں سمجھ جاتا تھا کہ آج ندوہ میں کسی سیاسی لیڈر کی آمد ہے۔

لیکن یہی محمود دوسری طرف دینی شخصیات سے ملنے، ان کی ضیافت کرنے اور ان کا استقبال کرنے میں سب سے آگے نظر آتے تھے، اس موقع پر ان کی خوشی دیکھنے کے لائق ہوتی تھی، ایک ایک کو ملواتے، تعارف کراتے اور دعائیں دلواتے، سر پر ہاتھ پھرواتے اور اپنی کتابیں ان کو ہدیہ کرتے اور گاڑی تک چھوڑنے جاتے۔

زمین، جائیداد، کاروبار اور دنیاداری کے معاملات سے محمود مرحوم کو ذرا بھی دلچسپی نہ تھی، اس کا ذکر بھی ہوتا تو وہ اپنے چھوٹے بھائی مفتی مسعود حسن حسنی ندوی کی طرف اشارہ کر کے کہتے کہ یہ معاملات ان کے ذمہ ہیں، یہ جانیں اور ان کو ان کے چھوٹے بھائی مولوی منصور حسن حسنی ندوی کو یہ نصیحت کرتے کہ دیکھو! ان چیزوں کے چکر میں زیادہ نہ پڑنا، وقت بہت قیمتی ہے، اس کو اسی کام میں لگاؤ جو آخرت میں کام آئے، یہ سب چیزیں تو یہیں رہ جائیں گی، بس جتنا ضروری ہو اتنا ہی کرو۔

محمود مرحوم کا مزاج توڑنے کا نہیں جوڑنے کا تھا، دور کرنے کا نہیں قریب لانے کا تھا، فاصلے بڑھانے کا نہیں فاصلے گھٹانے کا تھا، ادارہ کو ادارہ سے، شخصیت کو شخصیت سے، تحریک کو تحریک سے جوڑنے کا کام گویا ان کا من پسند کام تھا، ندوی قاسمی اور مظاہری سب کو انہوں نے جوڑ رکھا تھا، وہ بدگمانیوں کو دور کرتے، غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے، ایک کی دوسرے سے تعریف کرتے اور ایک کے سامنے دوسرے کے اچھے پہلو بیان کرتے اور یہ کام بڑے اخلاص اور جذبہ کے ساتھ اور بڑی خوش اسلوبی اور سلیقہ مندی کے ساتھ انجام دیتے۔

نیکی کی بہت سی قسمیں آپ نے دیکھی ہوں گی، لیکن نیکی کی جو شکلیں محمود حسنی

ندوی مرحوم کے یہاں ملتی ہیں، ان کی طرف لوگوں کی نظریں کم ہی جاتی ہیں، نیکی کرنا ہی صرف نیکی نہیں بلکہ کسی کو گنہگار ہونے سے بچالینا بھی ایک بڑی نیکی ہے، نیکی کی اس قسم کی طرف نیکی کرنے والوں کا ذہن کم ہی جاتا ہے، بلکہ ہمارے سماج میں شاید اس کو نیکی ہی نہیں سمجھا جاتا، اس کی دو مثالیں میں آپ کو دیتا ہوں:

جب میرے والد ماجد کا انتقال ہوا تو مجھے اس بات کا خیال نہیں آیا جس بات کا خیال محمود مرحوم کو آیا، انہوں نے لائبریری جا کر یہ معلوم کیا کہ مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کے نام سے کوئی کتاب تو نہیں نکلی ہے اور اگر نکلی ہے تو وہ کون سی ہے اور اس کی کیا قیمت ہے؟ پھر آکر انہوں نے مجھے بتایا کہ آپ کے ابی کے نام یہ کتابیں نکلی ہیں، یہ کتابیں تلاش کر کے لائبریری میں جمع کرادیں یا پھر ان کی قیمت ادا کردیں، تاکہ آپ کے ابی کے ذمہ حساب باقی نہ رہے۔

اسی طرح دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق شیخ الحدیث مولانا محمد ناصر علی ندویؒ کا جب انتقال ہوا تو محمود کو اس کی فکر ہوئی کہ ان کے نام کتابیں تو نہیں چڑھی ہیں، محمود نے لائبریری جا کر معلوم کیا تو پتہ چلا کہ فلاں فلاں کتاب مولانا کے نام نکلی ہوئی ہے، محمود نے اپنے چھوٹے بھائی مسعود سے کہا کہ مولانا میرے بھی استاذ تھے اور تمہارے بھی، لہٰذا تم لائبریری جا کر کتابوں کی قیمت جمع کردو، ان کے صاحبزادگان کو بتانے کی ضرورت نہیں، بحیثیت استاذ مولانا کا یہ حق ہم لوگوں پر بھی بنتا ہے۔

ایک واقعہ ان کے ایثار کا عین الحسن بھائی کی زبانی سنیے، وہ کہتے ہیں کہ ایک دن ہم لوگ مولانا محمود صاحب کے ساتھ خاتون منزل سے ندوہ آرہے تھے، موتی محل پل کی ڈھال پر ندوہ کے ایک استاد مولانا مظہر الحق کریمی صاحب پیدل ندوہ جاتے ہوئے ملے، مولانا محمود صاحب نے گاڑی رکوائی، اس سے پہلے کہ میں اپنی طرف

کا دروازہ کھول کر اترتا، دوسرے دروازہ سے تیزی سے محمود صاحب اتر گئے اور اصرار کر کے مولانا مظہر کریمی صاحب کو اپنی جگہ بٹھایا اور جگہ تنگ ہو جانے کی وجہ سے خود محمود صاحب پیدل ندوہ کی طرف چل دیے، پاؤں میں ورم تھا، کمزوری بھی تھی، میں نے بہت چاہا کہ میں چلا جاؤں، لیکن انہوں نے بڑی سختی سے مجھے روک دیا اور کہا: مجھے بھی کچھ ثواب کما لینے دیجیے۔

گاڑی روک کر کسی کو بٹھانا کوئی کمال نہیں، لیکن اپنی جگہ دوسرے کو بٹھا کر بیماری کی حالت میں خود پیدل چل دینا بڑی بات ہے، ایثار اور قربانی کے اس طرح کے واقعات اگر ان کے جمع کیے جائیں تو ایک مستقل کتاب تیار ہو جائے، ان کا معاملہ یہ تھا کہ خود تکلیف اٹھا کر اور اپنے کو پریشانی میں ڈال کر دوسروں کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔

غریبوں، ضرورت مندوں، پریشان حال لوگوں کی مالی مدد وہ اس طرح کرتے تھے کہ جیسے وہ ان کی مدد نہیں ان کا قرض ادا کر رہے ہیں، لینے والا لے کر شاید اتنا احسان مند نہ بنتا جتنا وہ دے کر احسان مند نظر آتے تھے، ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ گن کر نہیں دیتے تھے، جیب میں ہاتھ ڈالتے اور مٹھی میں جو آجاتا وہ دے دیا کرتے، اپنے لیے کچھ خریدنا، اپنے لیے کچھ کرنا، اپنے لیے کچھ بنانا، ان کو آتا ہی نہیں تھا۔

ایک خصوصیت ان کی یہ بھی تھی کہ آدمی کی ضرورت کو وہ خود ہی بھانپ لیا کرتے تھے اور بغیر اس کے کچھ کہے اپنی بھری مٹھی بڑی خاموشی سے اس کی جیب میں خالی کر دیا کرتے تھے، اگر ان کی جیب میں اس وقت دینے کے لیے کچھ نہ ہوتا تو اپنے بھائیوں سے کہتے یا اپنے ان قریب ترین لوگوں سے کہتے جن کے بارے میں وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ دے سکتے ہیں اور دے کر خوش بھی ہوتے ہیں اور اس طرح وہ دوسروں کو بھی ایک خیر کے

کام میں شریک کر لیتے، وہ خود تو انتہائی خوددار اور غیرت مند تھے لیکن دوسرے کے لیے کسی دوسرے سے کہنے میں وہ ذرا بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے، وہ اس بات کو سمجھتے تھے کہ اچھائی کا راستہ دکھانے والا ویسا ہی ہے جیسے کہ اچھائی کرنے والا۔

۲۰۱۲ء میں خاندان ہی کے آٹھ افراد پر مشتمل ایک مختصر سا قافلہ حج کو روانہ ہوا، اس قافلہ میں مولانا سید عبد اللہ حسنی ندوی مرحوم، مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی، مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی اور میں بھی تھا اور ہم لوگوں کے گھر والے بھی تھے، محمود مرحوم سب میں چھوٹے تھے، انہوں نے اس موقع پر عبادت اور خدمت کو اس طرح جمع کیا کہ نہ عبادت میں کوئی کمی کی اور نہ خدمت میں کوئی کوتاہی، اس ذوق وشوق سے وہ کام کرتے تھے اور اپنے بڑوں کو ہر طرح کی زحمت سے بچانے کی وہ ایسی کوشش کرتے تھے کہ ان کے لیے سب کے دل سے دعا نکلتی تھی، حج کے ایام میں ان کے لیے کی جانے والی یہ دعائیں یقیناً آج ان کے کام آرہی ہوں گی۔

لوگ سفر سے گھبراتے ہیں، بچتے ہیں اور اگر کرنا ہی پڑ جائے تو پھر اس کے لیے پہلے سے تیاری کرتے ہیں، لیکن محمود مرحوم نہ سفر سے گھبراتے تھے، نہ بچتے تھے اور نہ اس کے لیے تیاری کو کوئی اہمیت دیتے تھے، وہ لمبے سے لمبا سفر، بڑے سے بڑے شہر کا سفر اس طرح کیا کرتے تھے کہ جیسے ساٹھ ستر میل دور کسی چھوٹی سی بستی میں دو چار دن کے لیے جا رہے ہوں، ایک چھوٹا سا بیگ ہوتا تھا اور اس میں روزمرہ کے استعمال کے دو تین جوڑے، سفر کے موقع پر اگر انہیں کسی چیز کی فکر ہوتی تھی اور سفر طے ہوتے ہی وہ اس کے انتظامات میں لگ جاتے تھے تو وہ کتابیں ہوتی تھیں، وہ بڑے اہتمام سے ان کتابوں کو یکجا کرتے، پیک کرواتے، گاڑی پر رکھواتے اور جب منزل پر پہنچتے تو ان کتابوں کو ناظم ندوۃ العلماء کے ہاتھوں باذوق لوگوں کو ہدیہ کرواتے۔

محمود مرحوم کا مطالعہ بڑا وسیع اور عمیق تھا، خاص طور پر سیرت، سوانح اور تاریخ کی کتابوں کا اور پھر اس مطالعہ کے ساتھ ان کا تاریخی ذوق، غیر معمولی یادداشت، یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے موضوع پر سند کا درجہ رکھتے تھے اور ایک مرجع کی شکل اختیار کر چکے تھے، سنین تو انہیں اس طرح یاد تھے جیسے ذہین بچوں کو پہاڑا یاد ہوتا ہے، تاریخ پیدائش ہو یا تاریخ وفات، پوچھنے پر وہ اس طرح بتاتے جیسے کہ وہ ابھی ابھی دیکھ کر آئے ہوں، ایسا ہی معاملہ خاندانی شجروں اور انساب کا بھی تھا، اس میں بھی وہ سب کی ضرورت پوری کرتے تھے، ان کی سطح کا کوئی آدمی اپنے اس علمی حلقہ میں اب نظر نہیں آتا۔

لکھنے پر تو ان کو ایسی قدرت تھی، خاص طور پر شخصیات پر کہ وہ دوسرے کاموں میں مشغول رہتے ہوئے بھی کئی کئی صفحات بڑی آسانی سے لکھوا دیا کرتے تھے، نہ ان کو سوچنا پڑتا تھا، نہ ذہن پر زور ڈالنا پڑتا تھا، نہ کسی سے کچھ پوچھنا پڑتا تھا، نہ کتابوں سے مدد لینی پڑتی تھی، وہ مضمون شروع کرتے تھے اور ختم ہی کر کے اٹھتے تھے، ان کا کمال تھا کہ پندرہ پندرہ صفحے ایک ہی نشست میں لکھ دیا کرتے تھے، انہیں معلوم رہتا تھا کہ اس مضمون سے متعلق چیزیں کن کن کتابوں اور کن کن رسائل وجرائد میں مل سکتی ہیں، انہیں مواد وحوالہ تلاش کرنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوتی تھی، بس شرط یہ تھی کہ وہ کتاب یا رسالہ ان کی نظر سے کبھی گذرا ہو، بھلے اس پر ایک لمبی مدت ہی کیوں نہ گذر چکی ہو۔

یہ انہی کا کمال تھا کہ انہوں نے بعض ایسی شخصیات پر بڑی ضخیم کتابیں تیار کر دیں جن پر مواد جمع کرنا، معلومات اکٹھا کرنا اور پھر ان کو ترتیب دے کر کئی سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب تیار کر دینا کوئی آسان کام نہ تھا، لیکن محمود مرحوم جب اس کام میں لگتے تھے تو خدا کی مدد ایسی ہوتی تھی کہ ان کے لیے راہیں کھلتی جاتی تھیں اور ان کا قلم ایک تیز رفتار گھوڑے کی طرح ان راہوں پر دوڑنے لگتا تھا، ان کو جب

کہیں سے مدد نہ ملتی تو وہ ان بزرگوں کے خاندان والوں سے رابطہ کرتے، ان سے تعلق رکھنے والوں سے مدد لیتے، ان کی بستی کے لوگوں سے معلومات حاصل کرتے اور اپنے مطلب کی چیزیں نکال لیتے اور ان بزرگوں کی زندگی کے وہ پہلو سامنے لانے میں کامیاب ہوجاتے جن سے ان کی شخصیت اپنے تمام خدوخال کے ساتھ سامنے آجاتی اور پڑھنے والوں کو بھی اس سے فائدہ ہوتا۔

محمود مرحوم کا دل بڑا ہی صاف وشفاف تھا اور اس کی صفائی اور شفافیت کا اندازہ ان کی گفتگو، ان کے لہجہ، ان کے معاملہ، ان کے ملنے کے انداز اور ان کے چہرہ پر ایک سچی مسکراہٹ سے بخوبی ہوجاتا تھا، وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ دوسروں کو اور خاص کر اپنے چھوٹوں کو دینی کاموں میں کیسے آگے بڑھایا جائے اور علمی ترقی کے مواقع ان کے لیے کیسے نکالے جائیں، وہ اپنے لیے نہ کچھ سوچتے تھے نہ اپنے لیے کچھ کرتے تھے، لوگ دنیا سے بےتعلقی کا اظہار تو بہت کرتے ہیں، لیکن کھرے اس پر کم ہی لوگ اترتے ہیں، وقت آنے پر قلعی ان کی کھل جاتی ہے اور حقیقت ان کی سامنے آجاتی ہے، لیکن محمود مرحوم کی زندگی دیکھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وہ جملے یاد آجاتے ہیں جو آپ نے دنیا کو مخاطب کرکے کہے تھے کہ

''میرے علاوہ لوگ ہوں گے جو تیرے فریب میں آئیں، میں تجھے تین طلاقیں دے چکا ہوں، رجوع کی اب کوئی گنجائش نہیں، تیری عمر بہت مختصر اور تیری زندگی بہت معمولی اور تیرا خطرہ بہت بڑا ہے۔ آہ! زادِ سفر کتنا کم ہے اور سفر کتنا لمبا ہے اور راستہ کتنا ویران ہے۔''

محمود مرحوم بھی دنیا کو اسی نظر سے دیکھتے تھے اور بس اتنی ہی اہمیت دیتے تھے۔

محمود مرحوم کی تقریر سننے والوں اور تحریر پڑھنے والوں پر ان کی باتوں کا بڑا گہرا

اثر پڑتا تھا، ان کی تقریروں اور تحریروں میں یہ اثر ان کے قول و عمل کی مطابقت سے پیدا ہوا تھا، محمود مرحوم کی تقریر سن کر کوئی ان سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ذرا آپ اپنے کو بھی تو دیکھ لیں، آپ ہم کو جو نصیحتیں کر رہے ہیں کیا آپ خود بھی اس پر عمل پیرا ہیں؟ آپ زہد کی بات کر رہے ہیں، قناعت کی بات کر رہے ہیں، ایثار کی بات کر رہے ہیں، عزیمت کی بات کر رہے ہیں، پڑوسیوں و رشتہ داروں کے حقوق کی بات کر رہے ہیں، امانت، دیانت اور صداقت کی بات کر رہے ہیں، ایثار، احتیاط، تقویٰ اور ورع کی بات کر رہے ہیں، سادگی، تقشّف اور اتحاد کی بات کر رہے ہیں، کیا خود آپ کی زندگی میں یہ چیزیں پائی جاتی ہیں؟

آپ ہمیں تو ڈراتے ہیں خدا کی پکڑ سے، جھوٹ پر، غیبت پر، تہمت پر، بدگوئی اور بدزبانی پر، غلط بیانی پر، الزام تراشی پر، کیا آپ خود بھی ان باتوں پر خدا کی پکڑ سے ڈرتے ہیں؟

محمود مرحوم کی تقریر سن کر واہ واہ کا شور تو نہیں مچتا تھا، لیکن سننے والا سوچنے پر ضرور مجبور ہو جاتا تھا اور کچھ دیر کے لیے اس کی اپنی زندگی کا نقشہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا تھا اور اس نقشہ پر گناہوں کے داغ دھبے اس کو صاف نظر آنے لگتے اور پھر ندامت اور توبہ کے آنسوؤں سے وہ ان داغ دھبوں کو دور کرنے میں لگ جاتا تھا۔

یہ تھیں محمود مرحوم کی وہ خوبیاں جنہوں نے ان کو بلندی اور مقبولیت کے اس مقام پر پہنچا دیا تھا، جس کا اندازہ لوگوں کو ان کی زندگی میں تو اس طرح نہ ہو سکا لیکن ان کا جنازہ دیکھ کر اور جنازہ کے موقع پر تعلق رکھنے والوں کا ازدحام دیکھ کر لوگوں کو ضرور ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی سچی دین داری نصیب فرمائے اور اس پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

مولانا محمود حسن حسنی ندوی اور سوانحی ادب

مولانا وزیر احمد اعظمی ندوی
(شارجہ-امارات)

خانوادۂ حسنی علم و عمل، دعوت و عزیمت، سلوک و تصوف اور تصنیف و تالیف کی ایک پوری تاریخ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ نے ''یادرفتگاں'' میں اس خانوادہ کے ایک بزرگ عالم دین مشہور مؤرخ اور بلند پایہ سیرت نگار مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں اس خانوادۂ حسنی کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

''مولانا حکیم سید عبدالحی ناظم ندوۃ العلماء عہد جدید کے اولین علماء میں تھے، سادات رائے بریلی کے مشہور خانوادۂ علم و عمل سے تھے، جس کے بعض افراد سلاطین کے درباروں میں اور بعض فقر و تصوف کی خانقاہوں میں ممتاز تھے، بعض درس و تدریس کی چٹائیوں پر اور بعض تالیف و تصنیف کی مسندوں پر جلوہ آرا تھے۔'' (یادرفتگاں:۴۸)

اس خانوادہ کا ایک ایک فرد آفتاب و ماہتاب ہے، رائے بریلی کے اس سادات

خانوادہ سے ایسے علماء، مفکرین ومؤرخین، ادباء، ماہرین تعلیم وتربیت اوراسکالرزاٹھے ہیں جن کی علمی موشگافیوں، تربیتی دل نوازیوں، ادبی بلندیوں اورفکری بصیرتوں سے عالم اسلامی مستفید ہورہا ہے، مفکراسلام حضرت مولانا علی میاں حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی فکری رہنمائی، مولانا محمد الحسنی ندویؒ کی ادبی تحریریں، استاذ جلیل مولانا محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کی بصیرت افروزفکری ٔ ادبی اورثقافتی رنگارنگی اورمربی محترم مرشدالامۃ حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کی مربیانہ سرگرمیاں پورے عالم عربی واسلامی کوضیابار کیے ہوئے ہیں۔اسی کاروان دانش وآگہی کے ایک فرد جواں سال اورجواں مرگ عالم ربانی مولانا محمود حسنی ندوی بھی تھے۔

مولانا کی ولادت ۱۹۷۱ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم مدرسہ ضیاء العلوم میں ہوئی اور اعلیٰ تعلیم مادرعلمی دار العلوم ندوۃ العلماء میں حاصل کی، ابتداء ہی سے حضرت مفکر اسلام علیہ الرحمۃ اوردونوں ناناجان مولانا محمد رابع صاحب حسنی ندوی مدظلہ العالی اور مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی عنایتوں اورشفقتوں کا محور رہے، اس لیے ان بزرگوں کی خصوصیات کوبھی انھوں نے اپنے اندر جذب کرلیا، دیگر اکابر مصلحین اورعلماء ربانیین کی صحبت سے بھی فائدہ اٹھایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوانی ہی میں ذکروفکراورتصوف کی سرمستیوں میں کھوگئے۔مولانا ضیاء الدین ندوی خیرآبادی ان کی اس خصوصیت پرروشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''تصوف وسلوک سے طبعی مناسبت تھی، لہٰذا جوانی ہی میں اس راہ کے نشیب وفراز سے گذرنے لگے اور روحانی ترقیات کے مراحل طے کرنے لگے، مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور میں تدریسی خدمات کے ساتھ اہل اللہ اوراولیاء اللہ کے تذکرے لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہا، رائے بریلی میں رمضان

المبارک حضرت مولانا علی میاں کے ساتھ گذرتا اور ذکر کی مجالس منعقد ہوتی تھی، دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ ان ایام میں محمود حسنی پر وجد وجذب کی سرشاری ہوتی تھی، وہ جب حب الٰہی میں ڈوب کر ذکر کرتے تھے تو دوسروں پر بھی کیف وسرور کی مستی طاری ہوجاتی تھی، یہ عمراور یہ انداز فنائیت، جی چاہتا ہے کہ شیخ سعدی کا یہ شعران کے نام کروں:

شکر خدائے کن کہ موفق شدی بخیر
نہ انعام وفضل خویش نہ معطل گذاشت''

مولانا محمود حسنی- اپنی خدمات وخصوصیات کے آئینہ میں:

مولانا محمود حسن حسنی ندوی مرنجاں مرنج شخصیت کے حامل تھے، وہ فضل وکمال کا مجسمہ تھے، تقویٰ ودینداری ان کے چہرۂ کمال کا خط وخال تھی، تصنیف وتالیف کا ذوق ان کو ورثہ میں ملا تھا، بزرگان دین، مصلحین امت اور علماء ربانیین کی سوانح نگاری ان کی زندگی کا مشن تھا۔ انہوں نے شیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحب جونپوری کی سیرت پر کتاب لکھی، داعی اسلام مولانا عبداللہ حسنی کی سرگذشت حیات قلم بندکی اور ہمارے ہم درس مولانا عبدالباری ندوی بھٹکلی کی صفات وخصوصیات کو اجاگر کیا۔

سوانح نگاری سے ان کو خاص شغف تھا، سوانح نگاری ایک فن بھی ہے اور ادب کی ایک شاخ بھی، ڈاکٹر ممتاز فاخرہ نے اپنی کتاب ''اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا ۱۹۱۴ تا ۱۹۷۵ء'' میں سوانح نگاری کا تعارف یوں کرایا ہے:

''سوانح عمری کسی فرد کی پیدائش سے لے کر موت تک کے خارجی حالات کے ساتھ ساتھ داخلی کوائف (جذبات واحساسات) کے بیان پر مشتمل ہوتی ہے، بیانات کے تجزیہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جہاں یہ تاریخ کی

طرح کسی فرد کے حالات زندگی بتاتی ہے، وہاں فکشن کی طرح اس کی زندگی کی نقاب کشائی بھی کرتی ہے، جس طرح اول درجہ کا مؤرخ حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرسکتا، اسی طرح اچھے سوانح نگار کے لیے بھی حقیقت سے دامن کشی ممکن نہیں۔'' (صفحہ:۲۱)

اس تعریف کی روشنی میں اگر ہم مولانا محمود حسن حسنی ندوی کی سوانح نگاری کا جائزہ لیتے ہیں تو اس حقیقت کو ماننے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ جن شخصیات کی سوانح عمریاں ان کے قلم گہر بار سے معرض وجود میں آئیں ہیں وہ بہت جامع مدلل اور پر مغز ہیں، ان میں حقائق سے چشم پوشی نہیں کی گئی ہے۔

سوانح عمری کے ماہرین اور اسکالرز نے کامیاب سوانح نگاری کو متعدد شرائط سے مشروط کیا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز فاخرہ نے اپنی کتاب میں کامیاب اور دل کش سوانح نگاری کے لیے درج ذیل شرائط کا تذکرہ کیا ہے:

۱-سوانح عمری ادب کی ایک شاخ ہے، اس لیے ادبی تقاضوں کو ملحوظ رکھنا سوانح نگاری کی اہم شرط ہے۔

۲-سوانح عمری میں ''موضوع'' بنیادی اہمیت کا حامل ہے، اس لیے سوانح نگار کو موضوع کو اختیار کرتے وقت دانش مندی، دیانت داری اور غیر جانب داری سے کام لینا چاہیے۔

۳-جس طرح ناول، افسانے اور تاریخ وتنقید کا اپنا مخصوص اسلوب ہے، اسی طرح سوانح نگاری کا بھی ایک خاص اسلوب ہے۔

سوانح نگاری میں بحیثیت فن موضوع اور مواد کے بعد اسلوب بیاں کو اہمیت حاصل رہی ہے، اسلوب بیاں دراصل شخصیت کے انعکاس کا نام ہے، اسلوب بیان

کے ذریعہ نہ صرف مصنف کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے، بلکہ موضوع کی شخصیت کو بھی اسلوب ہی کے ذریعہ پیش کیا جاسکتا ہے، اسلوب کے ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اسلوبِ بیاں شگفتہ اور دل کش ہونے کے ساتھ ساتھ حفظ مراتب کا پورا خیال لیے ہوئے ہو۔

۴-سوانح عمری میں نہ تاریخ کے مخصوص سادہ اسلوب کی گنجائش ہے، نہ قانونی نکتہ سنجی کی، ناول اور ڈرامے کی طرح وہ تخیلاتی یا تصوراتی نہیں، اس لیے وہ اسلوب جس کی بنیاد تخیل پر ہو سوانح عمری کے لیے مناسب نہیں۔ سوانح نگار کے اسلوب سے یہ احساس نہ ہو کہ وہ کسی دقیق یا خشک مسئلہ میں الجھا ہوا ہے، بلکہ اس کے قلم میں تازگی اور شگفتہ بیانی ہونی چاہیے۔

۵-سوانح نگاری میں سچائی کا ہونا ضروری ہے، مصنف اگر تصنیف کے وقت داخلی وخارجی حالات کو بیان کرتے وقت سچائی کا دامن تھامے رہے، تو اس کی سوانح نگاری قارئین کے لیے دلچسپی کا موجب بنتی ہے۔

۶-سوانح نگار کو واقعات کی ترتیب اس انداز سے کرنی چاہیے کہ ان میں ربط وتسلسل قائم رہے۔

یہ چند وہ بنیادی اصول ومبادی ہیں جن کو برتنے سے سوانح نگاری کی افادیت دوچند ہوجاتی ہے۔

ان اصول ومبادی کی روشنی میں ہم مولانا محمود حسن ندوی کے چند اقتباسات کا جائزہ لیں گے اور دلچسپ ودلکش سوانح نگاری کی کسوٹی پر پرکھیں گے، تاکہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوجائے کہ مولانا ایک عظیم سوانح نگار تھے۔

وہ اپنی کتاب ’’شیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحب جون پوری رحمۃ اللہ علیہ‘‘

میں مولانا کے وسعت مطالعہ اور ان کے مسلکی توسع کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسی طرح آپ کے علمی مزاج میں توسع تھا، طبیعت تو بڑی نازک پائی تھی اور مستقل امراض نے تو اور نڈھال کر دیا تھا، مزاج کے خلاف ذرا سی بات بھی بار خاطر ہو جاتی، لیکن علماً و ذہناً مزاج و فکر میں بڑا توسع تھا اور عملی زندگی میں بھی موقع بہ موقع احادیث کی روشنی میں اس پر عمل پیرا ہوتے۔''

آگے مزید لکھتے ہیں:

''جب کہ آپ جس مدرسہ سے تعلیمی و تدریسی طور پر وابستہ ہوئے اور جہاں سے وابستگی دنیا کے ظاہری اسباب میں آپ کے لیے نافع ہوئی اور آپ کے فیوض علمی و روحانی کے دور دور تک پہنچنے کا سبب بنی، اس کا ایک علمی و اعتقادی و عملی طریق کار ہے جس کا وہاں کے بزرگوں نے ہمیشہ خیال رکھا، ہمارے حضرت الشیخ بھی اس سے بالکل الگ تھلگ نہیں تھے، لیکن حدیث سے خصوصی تعلق اور اس کے مطالعہ نے آپ میں وسعت علمی کے ساتھ توسع عملی بھی پیدا کر دیا تھا، ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ میں نے علم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آئینہ سے حاصل کیا ہے، نہ میں شافعی نہ کوئی اور، میں اس لیے یہ کہہ رہا ہوں کہ عبدالسلام اور اس کی برادری (یعنی اس وقت کے شافعی طلبہ) مجھے شافعی کہتے ہیں۔'' (صفحہ: ۱۵۲-۱۵۳)

یہ اقتباس اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مولانا محمود حسن حسنی نے شیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحبؒ کے بارے میں ایک سچائی کا برملا اظہار کیا ہے اور اس سچائی کے برملا اعتراف نے ان کی اس سوانح نگاری کو عظمت سے روشناس کرایا ہے۔

ایک اور اقتباس ان کی کتاب ''عائشہ بی'' سے ملاحظہ فرمائیں، مفکر اسلام

حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم مرحومہ خود ایک صاحب دل اور صاحب طریقت عالمہ تھیں، ان کے تذکرہ میں ’’دعاؤں کا اعلیٰ ذوق‘‘ کے عنوان سے مولانا محمود حسن حسنی ندوی رقم طراز ہیں:

’’اللہ تعالیٰ نے امۃ اللہ تسنیم مرحومہ کو ابتہال ومناجات کا اعلیٰ ذوق عطا فرمایا تھا، مسنون وماثور دعاؤں کے ساتھ انھوں نے اشعار کے ذریعہ اس میں قوت پیدا کردی تھی کہ ان کی طبیعت بے قرار رہتی اوراس کے ذریعہ اپنے رب سے مناجات کر کے وہ قرار حاصل کرتیں، انھوں نے حمد کے اشعار بھی کہے جس کا ایک بند ہے:

تیری ذات اعلی صفات ہے
تیرا نام آب حیات ہے
تیری یاد وجہ نجات ہے
تیری شان جل جلالہ

ایک دوسرا شعر جس میں ان کا اپنے رب سے قوی تعلق ظاہر ہوتا ہے:

ہے جہاں میں تیرا ہی رنگ وبو
بس خیال میں تو ہی تو ہے
ہے زبان وقلب پہ ذکر تیرا
تیری شان جل جلالہ‘‘

(صفحہ:۱۳۲)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس میں جس موضوع کو اختیار کیا گیا ہے، اسی کی مناسبت سے دل کش ودل آویز اسلوب کو بھی اپنایا گیا۔

ان کی ایک اور کتاب ''سیرت داعی اسلام مولانا عبد اللہ حسنی'' سے بھی ایک اقتباس ملاحظہ کرتے چلیں، مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ کے بارے میں وہ رقم طراز ہیں:

''انہوں نے صوفی سنتوں، رشی منیوں، آچاریوں گرو اور پادریوں کو دعوت دی، ان لوگوں کو ان کے مٹھوں سے نکالا اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کا پیغام انسانیت کھل کر پیش کیا اور اس میں انھوں نے وہ طریقہ اختیار کیا کہ یہ باتیں غیر مسلم رہنماؤں سے کہلوائیں، جنھوں نے اسلام کی غیر مسلموں اور تمام انسانیت کی فلاح و بہبود کی باتوں کا کھل کر اعتراف کیا، اپنی تقریروں میں واضح طور پر ان کو پیش کیا، خاص طور سے ان کو سب سے زیادہ اس سلسلہ میں سوامی شنکر جی سے مدد ملی، جنہوں نے پہلے قرآن مجید اور اسلام کے خلاف کتاب لکھی، پھر جب قرآن کا مطالعہ یکسو ہو کر اور تعصب کی عینک اتار کر کیا تو اسلام کے دفاع میں کتاب لکھی۔'' (صفحہ:۴۰۶)

مرشد الامت حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرگذشت حیات ''اوراق زندگی'' کی ترتیب و تنسیق مولانا محمود حسن حسنی ندوی کے ناقابل فراموش کارناموں میں سے ہے، یہ کتاب سوانح نگاری میں مولانا محمود حسنی ندوی کی پختگی کی غماز ہے اور سوانحی ادب میں ایک وقیع اضافہ ہے، سوانحی ادب میں ان کا یہ کارنامہ سنہرے حروف میں لکھا جائے گا، استاذ محترم مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ کے ایماء پر حضرت مولانا محمد رابع حسنی دامت برکاتہم سے ان کے احوال زندگی سفر وحضر اور ندوہ، تکیہ رائے بریلی کے قیام کے دوران استفسار کر کے لکھنا شروع کیا، پھر لکھی ہوئی تحریر حضرت کو سناتے، اس میں حسب ارشاد حذف و اضافہ کرتے، جب حضرت توثیق فرما دیتے تو محفوظ کر لیتے، اس طرح کئی سالوں کی جاں

فشانی وعرق ریزی کے بعد اس کی پہلی جلد شائع ہوئی، جب کہ دوسری بھی تیار ہے، زندگی نے وفا نہیں کی ورنہ ''اوراق زندگی'' کی ترتیب وتہذیب کا یہ زریں سلسلہ انہی کے ذریعہ پایہ تکمیل کو پہنچتا، زبان واسلوب دونوں مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، اس کتاب کی زبان سشتہ اور اسلوب دلکش وشگفتہ ہے، تکلف وتصنع کا دور دور تک شائبہ نہیں، اس کتاب کے درج ذیل اقتباس سے سوانحی ادب میں مولانا محمود حسن حسنی ندوی کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، عارف باللہ شاہ ضیاء النبی حسنیؒ کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ ضیاء النبی حسنی قدس سرہ چودھویں صدی ہجری کے اوائل کے ان عظیم المرتبت بزرگوں میں تھے، جن کے پاس حصول معرفت الٰہی اور رہبانیت صادقہ کے لیے بڑی ذی علم شخصیتیں قیام فرما تھیں، جن میں مولانا محمد ابراہیم آروی، مولانا ابوبکر شیث جونپوری، حضرت مولانا سید محمد امین نصیرآبادی کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں اور ان کا فیض دور دور پھیلا۔ مشہور بزرگ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے عظیم القدر خلیفہ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری نے بھی قیام فرمایا تھا اور انہوں نے ایک بار ان کے نواسہ خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے فرمایا تھا کہ میں نے آپ کے نانا (حضرت شاہ ضیاء النبیؒ) سے اچھی نماز پڑھتے کسی کو نہیں دیکھا، حضرت مولانا عبدالحی حسنی جو ان کے داماد تھے اور خلیفہ بھی، ان کے متعلق تذکرہ میں لکھا ہے: ''برکۃ الدنیا سر الوجود ولب لباب العرفان''

نماز سے انہیں جو شغف اور مناسبت والی بات حاصل تھی، ان کی اولاد پوتے، پوتیوں اور نواسہ نواسیوں میں دیکھ کر بھی اس کا کسی طرح سے اندازہ

کیا جاسکتا ہے، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا بے چینی سے انتظار، قرآن مجید سے تعلق کا بھی یہی حال تھا، ان کے پوتے سید سراج النبی حسنی کا یہ حال تھا کہ قرآن مجید سن کر وہ تاب نہیں لا پاتے اور گر پڑتے، کئی بار چوٹ بھی آئی، ان کے ایک پوتے حافظ سید حبیب الرحمن حسنی مرحوم نے اپنے شوق سے حفظ کیا اور دوسروں کو کرایا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی ان کے پاس حفظ کیا اور ایک پوتے مولانا سید ابوالخیر برق حسنیؒ حافظ حدیث تھے اور اس قرآن وحدیث کی محبت وشیفتگی نے انہیں عربیت کا بڑا عالم بنا دیا تھا، مع سند کے حدیثیں بہ آسانی سنانے لگتے اور عربی و اردو کے الفاظ ومحاورے نوکِ زبان رہتے۔‘‘ (صفحہ:۲۸)

ان اقتباسات سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ مولانا محمود حسنی ایک بلند پایہ سوانح نگار تھے اور ان کی قلم بند کی ہوئی سوانح عمریاں اردو ادب میں گنج ہائے گراں مایہ کی حیثیت رکھتی ہیں، بقول مولانا ضیاء الدین ندوی خیرآبادی:

’’مولانا محمود حسن حسنی صرف نام کے محمود نہیں تھے بلکہ وہ اسم بامسمی تھے، عمل وکردار، صلاح وتقویٰ میں بھی محمود تھے، سیرت وطبیعت میں بھی محمود تھے اور پاک طینتی، صاف دلی میں بھی محمود تھے، حسن اخلاق اور تواضع وانکساری میں بھی محمود تھے، آہ سحرگاہی اور ابتہال وتضرع، تہجد کی پابندی اور ذکر وفکر کا اہتمام ان کی شناخت تھی، اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ!‘‘

ممتاز عالم دین

مولانا آفتاب ندوی
(ناظم جامعہ ام سلمہ - دھنباد)

خدائے لازوال کے سوا کسی کو بقا نہیں، دنیا میں جو بھی آتا ہے ایک دن اسے یہ دنیا چھوڑنی ہی پڑتی ہے، خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس فانی دنیا میں آخرت کو فراموش کر کے نہیں جیتے ہیں، عمر رواں کے ایک ایک پل کی ان کے نزدیک اہمیت ہوتی ہے، اس جہان فانی کو وہ آنے والے جہان کو بنانے سنوارنے کا آخری موقع سمجھتے ہیں، ایسے سمجھدار، نیکو کار، ہمہ وقت خالق کے حضور حاضری کا استحضار رکھنے والے بندگان خدا کو معصوم فرشتے لینے آتے ہیں، مقرب ملائک خوش آمدید کہتے ہیں، زبان خلق نقارۂ خدا ہوتا ہے، مولانا محمود حسن حسنی کا تعلق یقیناً اسی قابل رشک جماعت سے تھا، والدین اور خاندان کے بزرگ خواتین وحضرات خصوصاً مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ، مولانا محمد ثانی حسنیؒ، مولانا واضح رشید ندویؒ اور مخدوم گرامی قدر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے سایۂ عاطفت میں ان کی پرورش ہوئی، شرافت، سنجیدگی، سلیقہ مندی، ادب وشائستگی میں بچپن ہی سے ممتاز

تھے، فرائض وواجبات کے ساتھ نوافل اور اوراد واذکار کے بھی پابند تھے، تواضع وانکساری اور حسن اخلاق سے ان کی شخصیت کی تشکیل ہوئی تھی، ہر ایک سے مسکرا کر بھرپور انداز میں ملتے، ملنے والا عزت محسوس کرتا۔

علماء اور بزرگوں سے تعلق کے ساتھ اللہ نے انہیں اچھا حافظہ عطا کیا تھا، بزرگوں کے انساب واحوال، ان کی خدمات وخصوصیات سے بڑی واقفیت تھی، مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ کی وفات کے دوسرے دن میں تکیہ رائے بریلی پہنچا، اسی وقت مولانا ولی رحمانی صاحبؒ بھی پہنچے، قبر پر حاضری کے وقت راقم ساتھ تھا، مولانا نے تکیہ کی مسجد کے سامنے چھوٹے سے احاطہ میں موجود قبروں کے سلسلہ میں دریافت کیا، میں نے عرض کیا کہ اس کام کے لیے سب سے موزوں مولانا محمود صاحب ہیں، یہ یاد نہیں کہ مولانا محمود صاحب خود پہنچ گئے یا انہیں بلوایا گیا، انہوں نے تفصیل سے تمام قبروں کے بارے میں بتایا، مولانا ولی رحمانی صاحب مرحوم اپنے ذہن کی ڈائری میں ایک ایک چیز نوٹ کرتے رہے، مولانا واضح صاحب پر اپنے تاثراتی مضمون میں ان تمام چیزوں کا انہوں نے ذکر کیا، مثلاً بائیں طرف فلاں بزرگ کی اور دائیں طرف فلاں بزرگ کی قبر ہے۔

مولانا محمود صاحب کو لکھنے کا فطری ذوق تھا، انہیں لکھنے میں وقت نہیں لگتا تھا اور نہ انہیں لکھنے کے لیے پرسکون ماحول، یکسوئی، تنہائی اور موڈ بنانے کی ضرورت پڑتی تھی، سفر میں پلیٹ فارم پر، ٹرین اور ایر پورٹ کہیں بھی وہ لکھنے پر قادر تھے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے اسفار میں اکثر وہ ساتھ رہتے تھے، مولانا سے ان کے حالات پوچھ پوچھ کر ایک پوری کتاب مرتب کر دی، کتاب کی ترتیب اس خوبصورتی سے انجام پائی ہے کہ مولانا کی یہ دلکش خودنوشت سوانح بن گئی۔

ابھی بقرعید میں ۱۳/ ذی الحجہ کو راقم تکیہ رائے بریلی گیا تو مولانا محمود صاحب کو نہیں دیکھا، ان کے برادر خورد مفتی مسعود صاحب سے پوچھا کہ محمود صاحب نظر نہیں آرہے ہیں؟ تو بتایا کہ بھائی صاحب کچھ ہی دیر پہلے بغرض علاج چنڈی گڑھ کے لیے نکلے ہیں، کہا جاتا ہے کہ گردے کی بیماری کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے، چنڈی گڑھ سے واپس آئے تو طبیعت تشویشناک حد تک بگڑ چکی تھی، روزانہ ڈائلیسس کے باوجود آخر کار بروز جمعہ ۱۳/محرم ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۲/اگست ۲۰۲۲ء تقریباً ساڑھے آٹھ بجے صبح لکھنؤ کے ایک ہاسپٹل میں آخری سانس لی، سب کو اللہ ہی کے پاس لوٹنا ہے۔

خانوادۂ حسنی اور ندوۃ العلماء کے لیے یہ ایک بڑا حادثہ ہے، حضرت مولانا رابع صاحب دامت برکاتہم عمر کے اس مرحلہ میں پے در پے جانکاہ حادثات سے گزر رہے ہیں، مولانا صبر و تحمل اور استقامت کے پہاڑ ہیں، خدا ملت پر صحت و تندرستی کے ساتھ ان کے سایہ کو تادیر سلامت رکھے۔

سوانحی خاکہ:

مولانا مرحوم کی پیدائش ۲۸/جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۲/جولائی ۱۹۷۲ء کو لکھنؤ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم کے بعد ندوۃ العلماء میں داخل کیے گئے، جہاں ۱۹۹۰ء میں عالمیت اور ۱۹۹۲ء میں حدیث میں فضیلت کی سند حاصل کی، اس کے بعد شعبۂ دعوت کا ایک سالہ کورس بھی مکمل کیا، فراغت کے بعد مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی میں استاد کی حیثیت سے کام شروع کیا اور ادارہ دارعرفات برائے تصنیف و تحقیق سے بھی وابستگی اختیار کی، ۲۰۰۱ء میں ندوۃ العلماء کے پندرہ روزہ پرچہ "تعمیر حیات" سے نائب مدیر کے طور پر وابستہ ہوئے۔

مولانا مرحوم کو بزرگوں کی سیرت و سوانح سے بڑی دلچسپی تھی، متعدد بزرگوں پر

ان کی تصنیفات نے اہلِ علم سے خراجِ تحسین وصول کیا، خواتین کے ماہنامہ ''رضوان'' کے وہ معاون ایڈیٹر تھے، ''پیامِ عرفات'' کی مجلس ادارت کے بھی رکن تھے، اولاد میں اکلوتی بیٹی ان کی یادگار ہے۔

ملت ایک نیک، متواضع اور بزرگوں کی وراثت کے علم بردار، ممتاز عالمِ دین سے محروم ہوگئی۔

تیری نیکیاں زندہ تری خوبیاں باقی

سید محمود حسنی آہ سوئے خلد رفت

شاہ اجمل فاروق ندوی
(نئی دہلی)

یہ خبر سن کر ہوا ہر اک کا سینہ لخت لخت
سید محمود حسنی آہ سوئے خلد رفت

مردِ حق آگاہ بھی تھے، عالم و واعظ بھی تھے
کیا مثالی زندگی تھی، کس قدر اعلیٰ تھا بخت

طاق تھے تاریخ میں وہ اپنے پرکھوں کی طرح
ان کی تصنیفات نے ہم کو بتایا بود و ہست

فضلِ حق سے پائی نعمت خاتمہ بالخیر کی
شہرِ حرمت، سید الایام اور مقبول وقت

ان کو اپنے سائے میں رکھ اے خدائے ذوالمنن
کر رہا ہے یہ دعا اجملؔ اٹھائے خستہ دست

خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود

بلال عبدالحی حسنی ندوی
(ناظر عام ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

برادر عزیز مولوی محمود کی بیماری کا سلسلہ سالوں سے جاری تھا، مگر حاشیہ خیال میں نہیں تھا کہ وہ اتنی جلد داغ مفارقت دے جائیں گے، ان کے حادثہ وفات نے صرف اہل خاندان ہی کو نہیں ایک علمی دنیا کو متاثر کیا، مدرسوں اور خانقاہوں میں اظہار غم کیا گیا، طلبہ اور اساتذہ نے ایک خلا محسوس کیا، جگہ جگہ ایصال ثواب کا ایک سلسلہ جاری رہا۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا، وہ ہر ایک کے خیر خواہ اور ہر ضرورت مند کے کام آنے والے تھے، نہ جانے کتنوں کو انہوں نے مصنف اور مضمون نگار بنادیا اور کتنوں کو تبلیغ ودعوت یا درس وتدریس کے راستہ پر لگایا۔ ان کے مزاج میں زہد تھا، دنیا سے انہوں نے کبھی دل نہیں لگایا، جو آتا وہ تقسیم کرتے جاتے اور دوسروں کو بھی اسی کی ترغیب دیتے رہے، اپنی بیماری کے زمانہ میں بھی اپنی تکلیفوں اور کمزوری کے باوجود وہ یہ سب کام کرتے رہے اور کرتے کرتے اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے۔

عزیز موصوف اس گنہگار سے تقریباً دو سال چھوٹے تھے، ان کی دادی اور نانی دونوں راقم کی حقیقی پھوپھیاں تھیں، اس لیے بچپن کا ساتھ تھا، مکتب کی تعلیم بھی ساتھ ہوئی، درجہ میں بھی وہ دو سال پیچھے تھے، مگر ساتھ آنا جانا، ساتھ کھیلنا، روٹھنا منانا سب نظروں کے سامنے ہے، درمیان میں چند سال وہ رائے بریلی میں رہے اور مدرسہ ضیاء العلوم سے پڑھ کر ندوہ آئے اور تعلیم مکمل کی۔

ان کو بچپن سے ملنے ملانے کا شوق تھا اور ہم اس میں اتنے ہی کچے تھے، وہ ایسی جگہوں پر پہنچ جاتے تھے جہاں ہمارے لیے پہنچنا دشوار ہوتا تھا، وہ دو تین سال کے رہے ہوں گے، جب ندوہ میں بڑا جلسہ ہوا، ہم لوگ بھی وہیں تھے، محمود نے اسٹیج پر حضرت مولانا کو دیکھا تو بے تکلف دوڑ کر پہنچے، سب نے شفقت کا ہاتھ رکھا، ڈاکٹر احمد توتونجی بھی تھے، انہوں نے گود میں بٹھالیا۔ بچے توتلاتے ہیں محمود کا توتلا پن تین چار سال رہا، مگر وہ اپنی زبان میں دنیا بھر کی باتیں کرتے، بزرگِ خاندان حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جن کو ہم سب ''ابا جان'' کہتے تھے، گھر تشریف لاتے تو محمود اپنی توتلی زبان میں خوب باتیں کرتے اور حضرت بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ چونکہ اپنی نسل میں سب سے بڑے تھے اور اپنی دادیوں نانیوں کے پہلے پوتے نواسے تھے، اس لیے سب کے چہیتے تھے، حضرت مولانا کی ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ ان کو بہت چاہتی تھیں، گرچہ انہوں نے ان کی زندگی کے صرف تین سال دیکھے پھر ان کی وفات ہوگئی، لیکن ان کی خوب شفقت ومحبت محمود نے پائی اور اسی کا اثر تھا کہ جب اللہ نے ان کو لکھنے کا سلیقہ دیا تو انہوں نے ان کی بھرپور سوانح ''عائشہ بی'' کے نام سے لکھی جو بہت مقبول ہوئی، حضرت رحمہ اللہ کی بڑی ہمشیرہ تو محمود کی والدہ کی دادی تھیں، ہر ایک پر انتہائی شفیق ومہربان، محمود تو ان کے دل کا ٹکڑا تھے، ان کو دیکھ کر وہ خوش ہوتیں اور جب

وہ پڑھنے لکھنے کے قابل ہوئے تو ان سے دینی کتابیں سنتیں، محمود کی سلامتی طبع کی بات تھی کہ وہ بڑی سعادت مندی سے کتاب پڑھتے۔

لکھنؤ کے قیام میں ہم میں وہی چھوٹے تھے، کچھ منگوانا ہوتا تو محمود کو آواز دی جاتی، وہ بڑی خوشی خوشی کام کرتے، ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ جو چیز منگوائی جاتی، خواہ کتنی ہی دور جانا پڑے وہ لے کر آتے، وہ پیدل چلنے کے ماہر تھے، بعض مرتبہ لطیفہ ہوا سب ناشتہ پر بیٹھے ہیں، محمود نہاری لینے گئے، قریب میں نہیں ملی تو پیدل ہی چوک پہنچ گئے، ہم لوگ انتظار میں بیٹھے ہیں، گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد آئے اور کہنے لگے کہ چوک کی نہاری زیادہ اچھی ہوتی ہے، اس لیے وہاں لینے چلے گئے تھے۔ ان کو یوں بھی کھلانے پلانے کا بڑا شوق تھا، سفروں میں بھی وہ خاطر تواضع کرتے رہتے، گاڑی کسی اسٹیشن پر رکتی تو اکثر وہ اتر جاتے اور وہاں کی کوئی مشہور کھانے پینے کی چیز لے آتے اور سب کو بڑے ذوق شوق سے کھلاتے۔

مولوی محمود ۲۲/جولائی ۱۹۷۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ان کے دادا سید محمد مسلم حسنی رحمۃ اللہ علیہ گرچہ عالم نہ تھے، مگر ان کے مطالعہ، وسعتِ نظر اور بزرگوں سے تعلقات نے ان کو علماء کی صف میں کھڑا کر دیا تھا، وہ ہمارے دادا ڈاکٹر عبد العلی کے سب سے بڑے داماد اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی خالہ زاد بہن کے فرزند اور حضرت کے ہم عمر اور بچپن کے دوست تھے، محمود ان کے بڑے فرزند سید حسن حسنیؒ کے فرزند اکبر تھے۔ حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ محمود کے نانا تھے، جو بڑے بزرگ، مصنف، شاعر، ندوہ اور مظاہر کے فارغ اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے خلیفہ تھے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے حقیقی بڑے بھانجے اور حضرت کے معتمد تھے۔ دادا کو اللہ نے عمر طویل عطا فرمائی

اور قمری حساب سے انہوں نے سو سال کی عمر پائی، مگر نانا نے زندگی کی صرف ۵۵؍بہاریں دیکھیں، مگر اسی کم عمری میں انہوں نے بڑا تصنیفی ذخیرہ یادگار چھوڑا، تاریخ وسوانح سے ان کو خاص دلچسپی تھی، علم الانساب کے ماہر تھے، خاندان علم الٰہی کی تاریخ کے سب سے زیادہ واقف اور خاندانی اخلاق واوصاف کے امین تھے۔ عزیزی محمود نے یہ صفات ورثہ میں پائی تھیں، پھر حضرت مولاناؒ کی صحبت ونظر کیمیا اثر نے ان صفات کو پروان چڑھایا۔ محمود کی والدہ خاندان کی ممتاز خواتین میں تھیں، امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کی پروردہ، علم وعمل سے آراستہ اور اپنے بڑوں کی خدمت گذار تھیں، بڑی صاحبِ فہم ونظر اور ادائیگی حقوق میں فرد تھیں۔

محمود نے ابتدائی تعلیم محلہ سے قریب مکتب میں پائی، پنجم مکتب کے بعد وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے معہد میں درجہ ششم میں داخل ہوئے، لیکن نانا کی وفات کے بعد والدہ کے رائے بریلی رہنے کی وجہ سے مدرسہ ضیاء العلوم میں داخل ہوئے اور وہاں سے دار العلوم پہنچے اور پھر انہوں نے مکمل تعلیم ندوہ میں حاصل کی۔ فضیلت کا مقالہ انہوں نے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ پر لکھا اور خوب لکھا، پھر والد صاحب کے اصرار پر لکھنؤ یونیورسٹی میں بی اے اور ایم اے کا امتحان دیا، اس کی سند بھی حاصل کی۔

ندوہ سے فراغت کے بعد سال بھر وہ دعوتی وثقافتی سفروں میں مشغول رہے، پھر حضرت مولانا رابع صاحب مدظلہ کے حکم پر ضیاء العلوم میں تدریسی خدمات شروع کیں، وہاں سے ان کی نئی علمی وتصنیفی زندگی کا آغاز ہوا، ہمیں یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے اردو میں پہلا مضمون حضرت رحمہ اللہ کی اہلیہ کے انتقال پر لکھا جو ''رضوان'' میں چھپا اور بہت پسند کیا گیا۔ رائے بریلی میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے معمولات انہوں نے قلمبند کرنا شروع کیے، پھر مختلف موضوعات پر انہوں نے لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔

مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا مضمون مولانا حکیم ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ پر ''فرشتہ صفت انسان'' کے عنوان سے کسی رسالہ میں چھپا تھا، انہوں نے اس پر کام کیا اور مستقل رسالہ تیار کر دیا، اس پر حواشی لکھے، جس سے اس کی افادیت دو چند ہوگئی اور ضخامت بھی ایک مستقل رسالہ کی ہوگئی، یہ رسالہ بہت مقبول ہوا۔ اسی زمانہ میں برادر اکبر مولانا عبداللہ حسنی صاحبؒ نے ان کو توجہ دلائی کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سلاسل تصوف جمع کریں، انہوں نے ''سلاسل اربعہ'' کے نام سے یہ رسالہ تیار کیا جو بار بار چھپا، اس میں انہوں نے مسترشدین کے لیے حضرتؒ کی ہدایات بھی جمع کر دیں۔

لکھنؤ کے طالب علمی کے اخیر دور میں انہوں نے خاص طور پر مولانا واضح رشید حسنیؒ اور مولانا عبداللہ حسنیؒ سے فائدہ اٹھایا، فجر بعد عام طور پر وہ ان کے پاس بیٹھتے۔

بزرگوں سے ان کو شروع سے بڑی مناسبت تھی، خاص طور سے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے وہ انتہائی عقیدت مند تھے، ان کی گرچہ زیارت نہ ہوسکی تھی، لیکن گھر میں شیخ کے محبت وعقیدت بھرے تذکروں نے ان کے دل میں ان کی خاص محبت پیدا کر دی تھی، مولانا واضح صاحب کی مجلسوں میں بھی خاص طور پر شیخ کا والہانہ تذکرہ ہوتا تھا، پڑھنے کا ان کو شروع سے شوق تھا، ''آپ بیتی'' انہوں نے پڑھی اور اس کا اثر قبول کیا، پھر حضرت مولانا کی سوانحی تصنیفات کا مطالعہ کیا اور دوسرے مصنفین کی کتابیں بھی دیکھیں، لیکن حضرت مولانا اور اپنے نانا مولانا محمد ثانی حسنی کا خاص اثر قبول کیا۔

حضرت مولانا محمد احمد پھول پوریؒ، حضرت مولانا ابرار الحق صاحبؒ ہردوئی سے بھی ان کو خاص عقیدت تھی، حضرت ہردوئی کی خدمت میں وہ بار بار حاضر ہوئے، خاص طور پر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کے ہمراہ ان کو اس کا بار بار موقع ملا، وہ خود بھی ملتے اور دوسروں کو بھی

ملواتے، ہمیں یاد ہے کہ حضرت کی وفات کے بعد جب پہلی مرتبہ حضرت ہردوئی کے یہاں حاضری ہوئی تو محمود حضرت سے خلوت میں ملے اور اس ناچیز کو بھی اس کا موقع ملا، اس وقت طبیعت پر حضرت کی وفات کا بڑا اثر تھا، مولانا نے اس وقت ﴿رَبَّنَا لاَ تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ﴾ ہرنماز کے بعد پڑھنے کی ہدایت فرمائی تھی جو بہت مفید ثابت ہوئی۔

حضرت کی وفات کے بعد ان کی والدہ نے ان کو تاکید کی کہ حضرت مولانا رابع صاحب اور مولانا واضح صاحب کی خدمت میں رہا کریں، اس کو انہوں نے دانتوں سے پکڑ لیا اور ایسا نباہا کہ سفر و حضر میں ساتھ رہے اور علمی کاموں میں بڑی معاونت کی۔

ان کے علمی ذوق کو دیکھ کر مولانا عبداللہ عباس صاحبؒ نے ان کو ''تعمیر حیات'' کا معاون مدیر بنا دیا، اس میں وہ مستقل کتابوں پر تبصرے بھی لکھتے رہے اور حضرت مولانا رابع صاحب اور مولانا واضح صاحب کے سفروں کی روداد بھی قلمبند کرتے رہے، اس کو جمع کیا جائے تو وہ خود ایک ضخیم کتاب ہے۔

رابطہ ادب اسلامی کے جلسوں میں بھی وہ صرف شریک ہی نہ ہوتے، بلکہ پابندی سے مقالہ لکھتے، ایک سفر میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے انہوں نے مقالہ پڑھا جو حضرت نے بھی بہت پسند کیا، حضرت مولاناؒ کے ساتھ بھی انہوں نے متعدد اسفار کیے تھے اور ممبئی کے قیام میں بھی ایک دو مرتبہ حضرت کے ساتھ رہے اور علمی کاموں میں تعاون کرتے رہے، ''کاروان زندگی'' کی آخری جلد جو حضرت نے بیماری کے زمانہ میں مکمل کی، انہوں نے بہت تعاون کیا، حضرت نے اس کا تذکرہ ''کاروان زندگی'' کے مقدمہ میں کیا اور دعائیں دیں۔

وہ ایک کامیاب مدرس بھی تھے، چھوٹی کتاب پڑھاتے تو بھی بڑے اہتمام سے

اور حدیث کی کتاب ہوتی تو بڑے ادب واحترام سے، طلبہ کے اندر بھی دینی ذوق پیدا کرتے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں ''تہذیب الاخلاق'' بھی مکمل ہوتی تو حضرت سے کراتے اور اس بہانے طلبہ کو بھی حضرت سے پڑھنے کا موقع مل جاتا۔

ادب واحترام کا مزاج ان کا شروع سے تھا، طالب علمی میں گرچہ وہ اولین درجہ کے طلبہ میں نہ تھے، مگر اساتذہ کے ادب واحترام میں نمبر ایک پر تھے، اگر کبھی کوئی کسی استاد پر تبصرہ کرتا تو سخت ناراضگی کا اظہار کرتے، اسی لیے ان کو اساتذہ کی شفقت ومحبت حاصل رہی، جو ان کی ترقی کا ذریعہ بنی اور اسی سے ان کو علمی اعتبار حاصل ہوا، جس کا آج اعتراف کیا جارہا ہے۔

وہ بڑے متواضع اور خلیق تھے، اپنے چھوٹوں سے بھی وہ کس درجہ احترام کا معاملہ کرتے، البتہ اگر کوئی غلط بات دیکھتے تو فوراً ٹوکتے، اس میں وہ ''لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ'' کا مصداق تھے، بڑوں کی بھی غلط بات برداشت کرنا ان کے لیے مشکل ہوتا تھا۔

ہندوستان کے انہوں نے بہت سفر کیے، بیرون کے بھی متعدد اسفار ہوئے، پہلا سفر حج کیا، تو اس میں حضرت مولانا رابع صاحب مدظلہ کے علاوہ ان کے دادا بھی تھے، یہ ناچیز بھی گردِ کارواں تھا، وہاں انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا، بڑوں کی واپسی کے بعد بھی چند روز مزید ہم ٹھہر گئے، ہم میں مولانا معاذ کاندھلویؒ بھی تھے، ہم ہمیشہ سے آرام کوش، محمود ہر وقت تیار، راتوں کا جاگنا، حرم کی حاضری، پھر اس میں علماء ومشائخ سے ملاقاتیں، اسی سفر میں پہلی مرتبہ حضرت شاہ نفیس صاحب کی زیارت ہوئی اور حضرت کی محبتیں ملیں، اس کے بعد لاہور کے سفر میں حضرت نے بڑی عنایتیں فرمائیں، محمود نے خاص طور پر بڑا فائدہ اٹھایا اور ان کو حضرت کی طرف سے اجازت بیعت وارشاد بھی حاصل ہوئی۔

دوسرا سفر حج برادر اکبر مولانا عبداللہ صاحب حسنیؒ کے ساتھ ہوا، اس میں جعفر بھائی بھی ساتھ تھے، اس میں بھی محمود کی مستعدی دیکھنے کے لائق تھی، ائمہ حرم سے ملے اور مشائخ سے ملے۔

تیسرا سفر حج ابھی چند سال پہلے ہوا، اس وقت ان کی بیماری کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، مگر وہ ہار ماننے والے نہیں تھے، بعض مرتبہ لگا کہ گر پڑیں گے مگر وہ عزیمت پر عمل کرتے۔

آخری عمرہ انہوں نے لاک ڈاؤن سے چند روز پہلے کیا، اس میں عزیزی مولوی رشید احمد ندوی سلمہ اور فرزند مولوی عبدالعلی سلمہ تھے، اس میں ان کی بیماری بڑھی ہوئی تھی، بھائی وسیم صاحب بھٹکلی بھی ساتھ تھے، مطاف میں داخل ہوئے تو پاؤں میں بہت ورم تھا، چلنا مشکل تھا، ہم نے کہا کہ وہیل چیئر منگوا لیتے ہیں، تم اسی پر طواف وسعی کرلو، مگر راضی نہ ہوئے، اللہ کا فضل ہوا کہ طبیعت بحال ہوئی اور انہوں نے بصد شوق پیدل ہی عمرہ مکمل کیا، اس سفر میں خود ان کو بہت دشواری ہوئی اور ہم نے بھی ان کو مشقت اٹھانے سے روکا، مگر وہ چھوٹوں کو تلقین کرتے رہے۔

انہوں نے بڑی بے چین طبیعت پائی تھی، ایک سیمابی کیفیت تھی جو ان کو سکون سے رہنے نہ دیتی تھی، لکھنا پڑھنا ان کی غذا اور دوا تھی، کھانا کھایا اور لکھنے بیٹھ گئے، بارہا ہم نے کہا کہ محمود کچھ آرام کرلو، مگر آرام ان کے لیے حرام تھا، مرض الوفات میں بھی انہوں نے نہ جانے کتنے مضامین بلکہ کئی کتابیں تیار کردیں۔

اخیر دور کے بزرگوں میں مولانا یونس صاحبؒ، حکیم کلیم اللہ صاحب مدظلہ، مولانا قمر الزماں صاحب مدظلہ، مفتی احمد خانپوری مدظلہ سے انہیں بڑی عقیدت ومحبت تھی اور ان بزرگوں کی بھی ان پر خاص نظر تھی، مولانا یونس صاحب کے یہاں ایک حاضری میں مولانا نے ان کو ایک قلم ہدیہ کیا تھا، جو محمود کے لیے نیک فال تھا اور مولانا کی بصیرت کا غماز۔

انجینئر الحاج عبدالمنان صاحب پشاوری مدظلہ جو مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں اور ''میزاب

رحمت“ کے سامنے بعد عصر و مغرب تشریف فرما ہوتے ہیں، سفر حجاز میں ان سے ضرور ملاقات ہوتی، وہ بڑی ضیافت فرماتے، اخیر میں محمود کے برادر اصغر عزیزی مولوی منصور ندوی سلمہ کو انھوں نے محمود کے نام مکتوب میں اجازت بیعت وارشاد دی اور دعائیں دیں۔

ان کے مزاج میں سخاوت اور دوسروں کے لیے خیر خواہی تھی، وہ خود داد و دہش پر اکتفا نہیں کرتے تھے دوسروں کو بھی توجہ دلاتے اور ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کی سعی کرتے، خیر کے راستوں کو تلاش کرتے اور اس میں خرچ کرتے اور کرواتے۔

مہمانوں کی ضیافت کا بھی خاص مزاج تھا اور اس کے لیے مشقت اٹھاتے، خود نہ کھا کر دوسروں کو کھلاتے، اس میں کبھی ان کے گھر والے شاکی ہوتے کہ یہ چیز تمہارے لیے رکھی ہے، تم کھالو، مگر وہ چپکے سے دوسروں کو لے جا کر کھلا دیتے، مہمانوں کو لینے کے لیے خود جاتے، پھر رخصت کرنے کے لیے بھی اہتمام کرتے، ان میں زیادہ تر مہمان حضرت کے ہوتے تھے، اس طرح ان کو حضرت کی بھی بڑی دعائیں ملیں۔

جعفر بھائی، عمار بھائی تو ان سے خاصے بڑے تھے، ہم سے صرف دو سال کا فرق تھا، مگر اس کا وہ بڑا لحاظ کرتے اور قریبی رشتہ کے اعتبار سے ہم لوگوں کے بھانجے بھتیجے ہوتے تھے، اس لیے بھی ان کو اس کا خیال ہوتا، ملنے ملانے میں، سفروں میں ہمارا بہت ساتھ رہا، کہیں بھی یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ آگے بڑھ جائیں۔

بہت سے الفاظ کثرت استعمال سے اپنی معانی کھو دیتے ہیں، ان ہی میں ”داغ مفارقت“ بھی ہے، لیکن عزیزی محمود نے مفارقت کا جو داغ دیا مشکل ہے کہ وہ مندمل ہو سکے، وہ عمر میں مجھ سے تقریباً دو سال چھوٹے تھے، بچپن سے ہم دونوں کا ساتھ تھا جو اخیر تک رہا، ان کو دین کا ذوق بچپن سے حاصل تھا، جو عمر کے ساتھ بڑھتا گیا، وہ اپنے زہد اور دنیا سے بے رغبتی میں بہت آگے گئے، ہر کام میں ان کے سامنے دینی فائدہ ہوتا، دنیا کے کسی ادنیٰ فائدہ سے ان کو کوئی رغبت نہ تھی، ان کو شروع سے بزرگوں سے

استفادہ کا شوق تھا، مشائخ عصر کی خاص توجہ وشفقت ان کو حاصل رہی، متعدد مشائخ سے ان کو اجازت وخلافت بھی ملی، مگر انہوں نے کہیں اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ان پر خاص نظر شفقت تھی، اخیر میں وہ حضرت کے علمی کاموں میں معاون بنے، خاص طور پر کاروان زندگی کی آخری جلد کی تکمیل جو حضرت نے معذوری کے زمانہ میں کی، محمود نے حوالوں کی تلاش میں بڑی مدد کی اور حضرت کی دعائیں لیں، اس کے مقدمہ میں حضرت نے ان کا تذکرہ کیا اور دعائیں دیں، ان کی وفات کے بعد وہ حضرات شیخین کے ہوکر رہ گئے، یہ ان کی والدہ کی تاکید تھی، وہ سفر وحضر میں جانشین مفکر اسلام حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی کے ساتھ رہے، سفرنامے بھی لکھے اور حضرت مدظلہ کے علمی کاموں میں خاص معاون رہے، یہاں تک کہ جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔

ان کو لکھنے کا ذوق روزنامچہ لکھنے سے پیدا ہوا، پھر وہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا روزنامچہ لکھنے لگے، دسیوں ڈائریاں لکھ ڈالیں، جو اب ایک یادگار اور ایک بڑا خزانہ ہے، سوانح نگاری کا ذوق ان کو اپنے نانا حضرت مولانا محمد ثانی حسنیؒ سے ملا جو مزید پروان چڑھا، دسیوں ضخیم کتابیں انہوں نے کم وقت میں تیار کردیں، ان کا قلم سیال تھا، لکھتے تو ایک ہی نشست میں دس دس بیس بیس صفحے لکھ ڈالتے، ان کا حافظہ مضبوط تھا، مراجع ان کی نگاہوں کے سامنے تھے، لکھنا ان کی ہابی (Hobby) تھی، وفات سے چند دن پہلے وہ چنڈی گڑھ جانے کے لیے لکھنؤ آئے تھے، اپنے کمرہ میں تھے، ہم اندر تھے تو دیکھا کہ کچھ لکھ رہے ہیں، ہم نے کہا کہ ”محمود اپنے اوپر رحم کرو۔“ بولے کہ ”مولانا یونس صاحب نے بڑی اچھی ایک بات فلاں جگہ لکھی، خیال آیا کہ نوٹ کرلیں۔“ جن بزرگوں کی انہوں نے سوانح حیات لکھے، ان میں مولانا عبد الباری صاحب ندوی، مولانا شاہ ابرار الحق حقی، مولانا محمد ثانی حسنی، مولانا زبیر الحسن

کاندھلوی، مولانا محمد یونس جونپوری، مولانا عبداللہ حسنی، مولانا عبدالباری بھٹکلی ندوی شامل ہیں، مولانا سلمان صاحب مظاہری کی سوانح بھی بڑی حد تک مکمل ہورہی تھی، ''عائشہ بی'' کے نام سے خاندان کی بزرگ خاتون حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کی مکمل سوانح لکھی، ان کے علاوہ تاریخ اصلاح وتربیت کی دو ضخیم جلدیں طبع ہوئیں، دس جلدوں کا خاکہ ان کے ذہن میں تھا، مزید دو جلدوں کا مواد تیار ہے، تیسری جلد مکمل ہوچکی تھی جو انشاء اللہ جلد ہی چھپے گی، سلاسل اربعہ ان کا مقبول رسالہ ہے جو شاید لاکھوں کی تعداد میں چھپا اور نہ جانے کتنی کتابیں انہوں نے دوسروں سے لکھوائیں، کبھی خود لکھ کر دیں۔

وہ بڑے ذاکر وشاغل تھے، ذکر سے ان کو شروع سے مناسبت تھی، قدرے جہر سے ذکر کرتے، تلاوت کا بھی اچھا معمول تھا، ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے، اہل تعلق کو ایئرپورٹ یا اسٹیشن لینے جاتے پھر چھوڑنے جاتے، ہر ایک کے کام آتے۔

حق بات کہنے میں ان کو کوئی باک نہیں تھا، ''لَا یَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ'' کا مصداق تھے، اخیر میں صحابہ کے دفاع میں تیغ براں تھے، اللہ کے لیے ان کو کسی کی پرواہ نہیں ہوتی تھی، غلط کام پر ٹوکتے، شاگردوں کی رہنمائی کرتے اور ان کو کامیابی کے راستے بتاتے، نہ جانے کتنوں کو انہوں نے کام پر لگادیا اور کتنوں کو مصنف بنادیا۔

اللہ نے عزیز موصوف کو بڑی صفات اور بڑی خوبیوں سے نوازا تھا، جو یقیناً دوسری دنیا میں ان کے کام آرہی ہوں گی، لیکن ہم لوگوں کے لیے یہ بڑا خسارہ ہے، اللہ تعالیٰ رحم کا معاملہ فرمائے جانے والے پر، اور صبر دے باقی رہنے والوں کو، اور صحت وعافیت کے ساتھ رکھے ان کے بھائیوں اور اہل خانہ کو، ''خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود'' کے وہ مصداق تھے، عمر کی پچاس بہاریں انہوں نے دیکھیں، لیکن کام سو سال کا کرگئے۔

باکردار شخصیت

مولانا عبدالمتین منیری بھٹکلی
(مرکز جمعۃ الماجد- دبئ)

ہونی کو کون ٹال سکتا ہے، مقدر میں زندگی کے جو لمحات لکھے گئے ہیں ان میں ایک لمحہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوسکتی، یہ قانون قدرت ہے، جو انسانوں کی خواہشوں اور تمناؤں کے ماتحت نہیں ہے، اس قانون کی ساری دنیائے انسانیت تابع ہے، کل مؤرخہ ۱۲/اگست مولانا محمود حسن حسنی ندوی بھی زندگی اور موت کی کشمکش میں چند ماہ گذار کر اللہ کو پیارے ہو گئے، آپ مسلمانان ہند کے عظیم رہنما حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کی بھتیجی کے نہ صرف فرزند تھے، بلکہ آپ کے معتمد ترین وابستگان، بلکہ روز وشب کے رازدانوں میں تھے۔آپ حضرت مولانا محمد ثانی حسنیؒ کے نواسے تھے، آپ کے والد حسن حسنی خاندان کے دوسرے اکابر کے برخلاف علمی میدان سے وابستہ نہیں ہو سکے تھے، لیکن آپ کی تمنا تھی کہ آپ کے فرزندان اپنے خاندان کی علمی، دینی اور دعوتی روایات کو آگے بڑھائیں، آپ کی یہ تمنا پوری ہوئی اور آپ کے تینوں فرزندان نے علم دین کے فروغ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

مولانا کی رحلت کا یہ حادثہ حسنی خاندان اور خاص طور پر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی دامت برکاتہم کے لیے اس کبر سنی میں بڑا ہی صبر آزما مرحلہ ہے، گزشتہ مختصر عرصہ میں آپ کے کئی ایک عزیز و معتمد شخصیات اس دنیا سے رخصت ہو گئیں، ان میں مولانا سید محمد واضح حسنیؒ، مولانا محمد حمزہ حسنیؒ، مولانا محمد مسلم حسنیؒ (محمود صاحب کے دادا)، مولانا نذر الحفیظ ندویؒ، وغیرہ کئی ایک قابل ذکر شخصیات شامل ہیں، جو مولانا کے ساتھ سایہ بن کے رہتی تھیں اور کڑے سے کڑے وقت میں رفاقت کا حق ادا کرتی تھیں، دیکھتے ہی دیکھتے یکے بعد دیگرے سبھی اللہ کو پیارے ہو گئے اور یہ دنیا آپ کے لیے تنہائی کا تاریک سایہ دراز کرتی چلی گئی، کبر سنی میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسے ابتلا و آزمائش کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ لیکن آپ نے غم والم کی ان گھڑیوں میں راضی بہ رضا رہنے کی جو مثال قائم کی ہے، وہ آئندہ نسلوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ بنی رہے گی۔

مولانا محمود حسن حسنی کی ولادت باسعادت ۱۹۷۱ء میں ہوئی تھی، مکتب کی تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مکتب میں، ابتدائی عربی درجات مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی میں، ثانویہ، عالمیت اور تخصص فی الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مکمل کر کے ۱۹۹۲ء میں سند فضیلت حاصل کی، اس کے بعد ایک سال المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی میں گذارا اور پھر اپنے مادر علمی مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی میں تدریس سے وابستہ ہو گئے، جہاں آپ نے تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی قدم رکھا، یہاں دار عرفات کے ترجمان پیام عرفات کی ادارت سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۹۹ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن ندیؒ نے اس دار فانی سے کوچ کیا، انہی دنوں آپ کو زیارت حرمین شریفین نصیب ہوئی، بدر کی زیارت کے موقع پر آپ

کے دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالی آپ کو حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی دامت برکاتہم کی خدمت میں قبول کر لے، قبولیتِ دعا کی گھڑی تھی، اس وقت سے تادم آخر حضرت مولانا کے سفر و حضر کے شریک بن گئے۔ ان مصرفیات کے سبب آپ کی تدریسی مشغولیات کچھ کم ہوگئیں، لیکن آپ کی اپنے نانا کے قائم کردہ خواتین کے رسالہ ماہنامہ ''رضوان'' لکھنؤ اور ''تعمیر حیات'' لکھنؤ میں ادارت کی ذمہ داریوں کا اضافہ ہوا، آپ پر اس دوران ان مجلّات کے معاون مدیر کی ذمہ داریاں ڈالی گئیں جنہیں آپ نے بحسن خوبی انجام دیا۔

مولانا نے اپنی زندگی کے پل پل کو بڑی امانت داری سے استعمال کیا، زندگی کی بنیادی ضرورتوں کے علاوہ آپ کا وقت لکھنے پڑھنے یا پھر عبادت واذکار میں صرف ہوتا تھا، اللہ نے وقت میں بڑی برکت دی اور کم عمری میں اتنا بہت سا علمی کام انجام دیا جو آپ سے دگنی عمر کے افراد سے بھی نہیں ہوا کرتا، اپنے نانا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بزرگوں کی سوانح حیات کو اپنے تصنیفی میدان کا محور بنایا اور آپ کے قلم سے حضرت مولانا سید ابرار الحق حقی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا زبیر الحسن کاندھلویؒ، مولانا عبدالباری ندویؒ (مہتمم جامعہ اسلامیہ بھٹکل) اور مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ وغیرہ کی مبسوط سوانح حیات نکلیں، آپ کا آخری کارنامہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی دامت برکاتہم کی آپ بیتی ہے، جس کی پہلی جلد منظر عام پر آچکی ہے، قارئین کو اس میں آپ کا قلم واضح طور پر نظر آتا ہے۔

آپ کی زندگی میں بڑی سادگی تھی، حسنی خاندان کے قابل ناز فرزند ہونے کے باوجود آپ کے معاملات سے کبھی صاحبزادگی کا اثر نظر نہیں آیا، ویسے یہ اس خاندان کے سبھی افراد کا وصف رہا ہے، جن لوگوں نے تکیہ شاہ علم اللہ کی مسجد میں ماہ رمضان

المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف کا سماں دیکھا ہے، ان کا کہنا ہے کہ آپ اس میں شرکت کی پابندی کرنے والوں میں سے تھے، یہاں پر عموماً معتکفین کے لیے جگہیں متعین ہوتی تھیں، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ نے اپنے لیے کوئی مخصوص جگہ متعین کی ہو، جہاں جگہ ملتی وہیں پڑ جاتے، نیند آتی تو سوجاتے، جامعہ اسلامیہ بھٹکل آتے تو طلبہ کے ساتھ باتیں کرتے رات گذر جاتی، تہجد کا وقت آتا تو اٹھ کر ذکر واذکار اور عبادتوں میں لگ جاتے۔ احباب جب کہتے کہ آپ ہمیشہ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں، کبھی آرام بھی کیجیے، تو کہتے کہ جب میں بستر پر لیٹتا ہوں تو بستر کاٹنے لگتا ہے۔ مولانا ایک خوش حال والد کے فرزند تھے، آپ کی لکھنؤ میں کوٹھی تھی، جہاں پر وہ آرام سے رہ سکتے تھے، لیکن آپ اس آرام دہ کوٹھی کو چھوڑ کر ہمیشہ ندوہ کے مہمان خانے میں پڑے رہتے اور جہاں جگہ ملتی سوجاتے۔

مولانا کی رحلت ہمارے لیے بھی ایک ذاتی حادثہ ہے، ویسے تو آپ سبھی سے نرمی اور محبت واخلاص اور خیر خواہی کا معاملہ کرتے تھے، جس سے ہر کوئی اپنے ساتھ مخصوص معاملہ سمجھتا تھا، حقیقتاً ہر ایک کے ساتھ آپ کا یہی معاملہ تھا، ہمیں آپ کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقعہ نہیں ملا، لیکن جب بھی ملاقات ہوئی تو اپنائیت اور احترام کی عجیب سی حلاوت ان میں محسوس ہوئی، آج سے دس بارہ سال قبل جب ہمیں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی دامت برکاتہم کی بھٹکل آمد پر آپ بیتی پر مشتمل بیس منٹ کی گفتگو ویڈیو پر ریکارڈ کرنے کا موقع ملا تو آپ نے بڑی ہی مسرت کا اظہار کیا تھا، یہ ان کی دلچسپی کا موضوع تھا، اس زمانہ میں اس قسم کا کام ہمارے معاشرے میں بہت مشکل سمجھا جاتا تھا، پھر تو آپ کے نقش قدم پر ہمیں مولانا سید محمد واضح حسنیؒ، مولانا نذر الحفیظ ندویؒ اور مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی دامت برکاتہم کی آپ بیتی اور

مشاہدات زندگی پر مبنی گفتگوئیں ویڈیو پر محفوظ کرنے کا شرف حاصل ہوگیا اور مولانا سے ہمارے تعلقات بھی مضبوط تر ہوتے گئے، ان سے ہمارا ذوق کافی ملتا جلتا تھا، وہ ہماری ہر تحریر کو شوق سے طلب کر کے پڑھتے تھے، بارہا ایسا ہوا کہ آپ نے ہماری ٹوٹی پھوٹی تحریریں فرمائش کر کے لیں اور انہیں اول تا آخر حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب اور مولانا واضح صاحب کو سنوائیں، ان حضرات کی وسعت قلبی اور خوردوں کی ہمت افزائی کا یہ بھی ایک نمونہ تھا، مولانا محمود حسنی کی ذات میں بھی ان اکابر کی یہ عظمت کردار سرایت کر چکی تھی، اپنے چھوٹوں کی ہمت افزائی آپ کا خاص وصف تھا۔

جانے والا اپنے خالق حقیقی کی بارگاہ میں چلا گیا، اس فانی دنیا میں اتنی ہی زندگی انہیں دی گئی تھی، لیکن آپ کی یاد ہمیشہ آپ کے چاہنے والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی اور آپ کی شخصیت اور روشن کردار آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ بنا رہے گا، کیا خوب آدمی تھا۔ اللہ آپ کے درجات کو بلند کرے۔ آمین!

آئینہ ذات وصفات

مولانا ضیاء الدین قاسمی ندوی
(خیر آباد، مئو-یوپی)

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی بھی ہم سے رخ موڑ کر اپنے خالق و پالنہار کے دربار میں چلے گئے، یہی دنیا کی ریت وروایت ہے کہ جو آتا ہے اس کو ایک دن اس دنیا سے جانا ہے، اللہ نے یہی نظام مقرر کیا ہے، جس میں نبی ورسول، اولیاء واتقیاء ہوں کہ شاہان مملکت یا سربراہان حکومت، غنی ہو یا فقیر سب برابر ہیں، موت وزندگی ایک ایسی حقیقت ہے جس پر مومن وکافر، ملحد ومرتد سب متفق ہیں کہ ہر ذی روح کو ایک دن بے روح وجان ہو کر خاک میں ملنا ہے اور یہ بھی ہر فرد بشر جانتا ہے کہ نہ زندگی کا عطا ہونا اس کے علم وقابو میں ہے، نہ موت سے دو چار ہونا اس کی خواہش وارادہ کے تحت ہے، اللہ جس کو جب چاہتا ہے اپنے پاس بلا لیتا ہے۔

”وَلَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِأَیِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ إِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ“ (لقمان: ۳۴)

(اور کوئی نہیں جانتا کہ کس جگہ اس کی موت ہوگی بلاشبہ اللہ خوب جانتا پوری خبر رکھتا ہے)

مولانا محمود حسن حسنی کا وقت موعود ۱۳؍محرم الحرام ۱۴۴۴ھ موافق ۱۲؍اگست ۲۰۲۲ء کو آ پہنچا، علاج ومعالجہ کی تمام کوششیں ہوتی رہیں، وہ موت وحیات کے درمیان لکھنؤ کے ایک معروف اسپتال میں انتہائی نگہداشت کے شعبہ میں ایڈمٹ تھے، لیکن اللہ کا فرمان ’’أینما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم في بروج مشیدۃ‘‘ (النساء: ۷۸) (تم جہاں کہیں بھی ہو موت تم کو آ کر رہے گی خواہ تم مضبوط قلعوں ہی میں کیوں نہ ہو) پورا ہونا تھا، ملک الموت کے بے رحم ہاتھ وہاں پہنچ گئے اور فرشتہ نے ’’یا أیتھا النفس المطمئنۃ ارجعي إلی ربک راضیۃ مرضیۃ‘‘ (اے وہ جان جو سکون پا چکی، اپنے رب کی طرف اس طرح لوٹ کر آ جا کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی، بس میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا) کہتے ہوئے اس پاکیزہ روح کو اپنے قبضہ میں لیا ہوگا۔

مولانا محمود حسنی ندوی (۱۹۷۱ء-۲۰۲۲ء) ان پاکیزہ صفات نفوس قدسیہ میں تھے جن کی زندگی کو حیات طیبہ کہا جاتا ہے، عاش للہ ومات في اللہ (اللہ کے لیے زندگی گذاری اور اللہ کی راہ میں جان جانِ آفریں کے سپرد کردی) کے مصداق تھے، حسب ونسب میں نجیب الطرفین، دادیہال بھی حسنی اور نانیہال بھی حسنی خاندان تھا، اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ ملتا ہے، والد محترم سید حسن بن سید مسلم رحمہما اللہ دونوں اہل اللہ میں سے تھے، جب کہ نانا سید محمد ثانی حسنی رحمہ اللہ ایک بلند پایہ عالم دین، قادر الکلام شاعر، طلیق اللسان مقرر، اعلیٰ درجہ کے منتظم اور صاحب اسلوب مصنف تھے، حضرت شیخ زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی کے دست گرفتہ اور تربیت یافتہ فیض کشیدہ مجاز بیعت تھے، شیخ کی نگاہ کرم کے محور خاص تھے، اس نسبت سے مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اطال بقاءہ اور مولانا سید واضح

رشید حسنی ندوی رحمہ اللہ، محمود حسنی ندوی کے نانا اور مفکر اسلام علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ پر نانا تھے۔

سید محمود حسن حسنی کی تعلیم و تربیت انہی بزرگوں کے زیر سایہ ہوئی، تکیہ کلاں رائے بریلی کے نورانی ماحول اور روحانی فضا میں اپنے عہد و زمانہ کے جہابذۂ علم و معرفت کی نگرانی و سرپرستی میں پروان چڑھے، ابتدائی تعلیم مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور میں ہوئی، جب کہ عالمیت و فضیلت احاطہ ندوہ میں رہتے ہوئے دار العلوم ندوۃ العلماء سے کی، گھر ہو کہ ندوہ، نانیہال ہو کہ مدرسہ ہر جگہ واسطہ و سابقہ اہل علم طبقہ سے تھا، حضرت مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت نصیب تھی، جن کے یہاں قدم بوسی کے لیے عرب و عجم کے علماء و صلحاء، دانشوروں اور مفکروں، سیاسی رہنماؤں اور سماجی سرخیلوں کی آمد ہوتی رہتی تھی، محمود حسنی کی تعلیم و تربیت میں ان سب عوامل کا خاص دخل تھا، حضرت علی میاں کے بعد محمود حسن حسنی حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کے ہو کر رہ گئے، سفر و حضر میں معیت و صحبت کا اعزاز ان کو ملتا رہا اور روحانی فیض بھی پہنچتا رہا۔

محمود حسنی کو تذکرہ نویسی اور بزرگان دین کی سیرت نگاری سے خاص شغف تھا، وہ قدیم و جدید بزرگوں، ولیوں اور صالحین کے احوال و کوائف تلاش کرتے رہتے تھے، تصوف و سلوک سے طبعی مناسبت تھی، لہٰذا جوانی ہی میں وہ اس راہ کے نشیب و فراز سے گزرنے لگے اور روحانی ترقیات کے مراحل طے کرنے لگے، مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور میں تدریسی خدمات کے ساتھ اہل اللہ کے تذکرے لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہا، رائے بریلی میں رمضان المبارک میں حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ گزرتا اور ذکر کی مجالس منعقد ہوتی تھیں، دیکھنے والے بتاتے ہیں، ان ایام

میں محمود حسنی پر وجد وجذب کی سرشاری ہوتی تھی، وہ جب یاد الٰہی میں ڈوب کر ذکر کرتے تھے تو دوسروں پر بھی کیف وسرور کی مستی طاری ہوجاتی تھی، یہ عمر اور یہ انداز فنائیت، جی چاہتا ہے کہ شیخ سعدی کا یہ شعر ان کے نام کروں:

شکر خدائے کن موفق شدی بخیر
ز انعام وفضل خویش نہ معطل گذاشت

مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور میں ان سے کسب علم کرنے والے ہزاروں شاگرد پیدا ہوئے جو اپنے استاذ محترم کے حسن اخلاق وکردار کے امین وگواہ ہیں، ان کے ایک شاگرد محمد جمیل اختر جلیلی ندوی بتاتے ہیں:

''کتابوں سے انہیں بے حد لگاؤ تھا، درجہ کے علاوہ تعلیمی ایام میں جب بھی ان سے ملاقات ہوئی خواہ تکیہ سے میدان پور آرہے ہوں یا میدان پور سے تکیہ جا رہے ہوں، یا پھر تکیہ سے کہاروں کے اڈہ کے لیے رواں دواں ہوں، ہاتھ میں عموماً کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ہوتی تھی۔''

مزید لکھتے ہیں:

''مولانا مرحوم کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ طالب علم جب کچھ لکھ کر دکھاتا تو آپ نہ صرف اس کو چیک کرتے بلکہ اس کی ہمت افزائی بھی کرتے تھے۔''

یہ ایک طویل جذباتی تحریر سے اخذ کردہ اقتباس ہے، یہی جذبات ان کے اکثر تربیت کردہ تلامذہ کے ہیں، جنھوں نے اپنے استاذ کو قریب سے دیکھا اور ان سے کسب علم کیا تھا اور بہترین گواہی دی ہے جو ہمہ وقت قریب رہنے والے تلامذہ دیتے ہیں، کیوں کہ دوران تدریس استاذ پر مختلف احوال طاری ہوتے ہیں، ان کا مشاہدہ طلبہ باریکی سے کرتے ہیں، مولانا محمود حسن حسنی ایک مشفق اور کامیاب استاذ

اور مربی تھے۔

مولانا مرحوم کو طبعی طور پر قلم وقرطاس سے مناسبت تھی، تحقیق وتصنیف ان کے تصنیفی مزاج کا حصہ تھا، خاص کر بزرگان دین، سلف صالحین اور اتقیاء امت کے احوال وکوائف اور تذکروں سے خاص شغف تھا، چناں چہ تکیہ کلاں دارعرفات کے شعبۂ نشر واشاعت اور تالیفات سے وابستہ تھے، دارعرفات کے ترجمان ''پیام عرفات'' کی مجلس ادارت کے رکن تھے، چوں کہ سیرت وسوانح نگاری کا ذوق تھا، اس لیے اپنے خاندان کے بزرگوں کے انساب کے ماہر مانے جاتے تھے، جس کو خانوادۂ علم اللّٰہی کے یکتائے روزگار علماء اور بزرگوں کے بارے میں معلومات درکار ہوتیں وہ محمود حسنی سے رجوع کرتا تھا۔

حضرت مولانا محمد رابع حسنی دامت برکاتہم کے خاص صحبت یافتہ تھے، زیادہ تر وقت حضرت دامت برکاتہم اور حضرت مولانا واضح رشید ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ سفر وحضر میں گذرتا تھا، ۱۶؍جنوری ۲۰۱۷ء میں جب اچانک مولانا واضح رشید صاحب کا سانحہ وفات پیش آیا تو اس کا شدید اثر مولانا محمود حسنی پر نمایاں ہوا، اس کے بعد انہوں نے ایک بڑا کام شروع کیا اور حضرت مولانا محمد رابع صاحب دامت برکاتہم سے کرید کرید کر ان کے حالات زندگی معلوم کر کے لکھنے لگے اور حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء کی سوانح حیات ''اوراق زندگی'' کے نام سے مرتب کر کے ایک بڑا علمی، ادبی، سوانحی تحفہ امت اسلامیہ کی خدمت میں پیش کردیا کہ ''أولئک آبائی فجئنی بمثلھم'' (میرے آباء واجداد ایسے تھے تو تم بھی ان کی نظیر پیش کر کے دکھاؤ) یہ سید محمود حسن حسنی کا ایک بہت قابل تحسین کارنامہ ہے۔

ندوۃ العلماء میں بلائے جانے کے بعد ان کو ''تعمیر حیات'' جیسے مؤقر ومعتبر

پندرہ روزہ اردو ترجمان کا معاون مدیر مقرر کیا گیا، انہوں نے تعمیر حیات کے لیے بڑی خدمات انجام دیں، شروع سے ہی بے پناہ محنت کے عادی تھے، ان کی سرگرمیاں تحقیق وجستجو اور خوب سے خوب تر کی تلاش تھیں، وہ بہت اچھے تبصرہ نگار تھے، تعمیر حیات میں کتابوں پر ان کے تبصروں کو اہل علم کا اعتبار حاصل تھا، ماہنامہ ''پیام عرفات'' اور ماہنامہ ''رضوان'' میں بھی برابر لکھتے رہتے تھے، ان کی متعدد کتابیں سیرت وتذکرہ پر کافی اہم تسلیم کی جاتیں ہیں، ''سیرت داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی'' ایک کتاب مولانا عبدالباری ندوی بھٹکلی کی سوانح وتذکرہ ہے، مولانا عبدالباری راقم الحروف کے ہم درس تھے، صرف فضیلت وتخصص کا فرق تھا، بھٹکل کے زمانہ قیام میں میرا ان سے بے تکلفانہ تعلق تھا، حسن صورت وسیرت میں نمونہ تھے، حیات شاہ ابرارالحق، تذکرہ مولانا محمد یونس جونپوری، یہ چند کتابوں کا سرسری ذکر کرنا اس مقصد سے ہے کہ ان کے تصنیفی مزاج اور تحقیقی طبیعت کا اندازہ لگا سکیں کہ ان کو اہل علم ومعرفت اور صالحین امت ومحدثین عظام کی تذکرہ نویسی سے کتنی مناسبت تھی، یہ محمود حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت صالحہ کا وہ پہلو ہے جو ان کو دوسرے تذکروں سے الگ پہچان دیتا ہے، ان کی تحریر میں سلاست وشگفتگی اور جاذبیت ہوتی ہے۔

میری نظر میں ان کی امتیازی خصوصیات:

مولانا محمود حسن ندوی حسنی خانوادہ کے گل سرسبد تھے، وہ تمام خصوصیات وامتیازات جو حسنی خاندان کے بزرگوں کی شناخت ہیں مرحوم میں پائی جاتی تھیں، میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر تواضع وانکساری، اعلیٰ ظرفی ووضع داری، صلاحیت وصالحیت، ابتہال وتضرع الی اللہ، صلاح وتقویٰ، خوفِ خدا اور فکر آخرت، للّٰہیت وانابت اور حسن اخلاق ورواداری، بے نفسی وبے لوثی کو مجسم شکل دے کر ایک قالب تیار کیا جائے تو

سید محمود حسن حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی صورت سامنے آئے گی۔

وہ مسلسل شوگر اور دیگر امراض سے جوجھ رہے تھے، صحت مستقل خراب رہتی تھی، شوگر یوں بھی سب سے زیادہ انسانی جسم کو توڑنے والی بیماری ہے، ان کے گردے میں انفیکشن رہتا تھا، پھر بھی چہرہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا، ملاقاتیوں سے مسکرا کر ملنا، جان پہچان کے لوگوں سے معانقہ ومصافحہ کرنا اور خیر وعافیت معلوم کرنا ان کے مزاج کا حصہ تھا۔

میں جب بھی ندوہ حاضر ہوتا، بہت تپاک سے مسکراتے ہوئے ملتے، عمر میں چوں کہ بڑا تھا (مگر کمالات میں کورا) اس کا لحاظ کرتے اور احترام وادب کا معاملہ فرماتے تھے، بارہا کہتے تھے کہ آپ حضرات سے دلی محبت ہے، آپ لوگوں کا ذکر خیر حضرت کی ذاتی مجلسوں میں بھی آتا رہتا ہے، خاص کر ندوہ سے تعلق ومحبت اور حاضری اور اساتذہ سے ملاقات کے لیے آنا، علمی سرگرمیوں میں لگے رہنے کا تذکرہ گاہے بگاہے ہوتا رہتا ہے، بعض دفعہ حاضر ہوا اور اتفاق سے ناشتہ پر حاضر نہیں ہوسکا تو حضرت ناظم صاحب یا حضرت مولانا واضح رشید صاحب پوچھتے تھے کہ مولوی ضیاء الدین خیرآبادی دکھائی نہیں دیئے، ناشتہ کیا کہ نہیں؟ محمود حسن حسنی سے جب ملاقات ہوتی تو بتاتے تھے آپ کہاں تھے؟ حضرت آپ کو ناشتہ پر یاد کررہے تھے، ان کی تواضع کا یہ حال تھا کہ کئی بار فرمایا کہ میرے سر پر ہاتھ رکھیں اور دعائیں دیں، مجھے ان کی اس ادا سے کافی شرمندگی محسوس ہوتی تھی، جب بھی ندوہ جاتا ان کو کسی نہ کسی کتاب سے کچھ اقتباس لیتے یا مطالعہ کرتے دیکھا، فرصت ہوتی تو ساتھ بیٹھ کر بات بھی کرلیتے، وہی کسی شخصیت کا تذکرہ یا لکھنے پڑھنے کا ذکر یا کئی دفعہ بتایا کہ میں مولانا کرامت علی جونپوری پر کام کررہا ہوں، مگر پھر وہ التواء میں پڑ گیا، اچھا خاصا مواد

مسودہ کی شکل میں تیار ہے، طباعت کی نوبت نہیں آسکی، میں ابھی گذشتہ ۱۷/اگست ۲۰۲۲ء کو عزیز گرامی مولوی مسعود حسن حسنی ندوی سے اس کے بارے میں استفسار کیا تو بتایا کہ مسودہ ہے تو مگر تلاش کرنا پڑے گا۔

ذمہ داران ندوہ خاص کر حضرت ناظم صاحب واساتذہ کو ان سے بڑی توقعات تھیں کہ آگے چل کر زبردست علمی خدمات سرانجام دیں گے، یہ کم لوگ جانتے ہوں گے کہ وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے، عمر عزیز کا اتنا ہی حصہ لے کر آئے تھے جو دینی ودعوتی اور تصنیفی وتدریسی سرگرمیوں میں گزار کر ایک تاریخ رقم کر کے چلے گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ!

ایک سورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اٹھا

ڈاکٹر تابش مہدی
(معاون مدیر ماہنامہ ''زندگی نو'' دہلی)

موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا آج تک کسی نے انکار نہیں کیا۔ نہ قیامت تک اس کا کوئی امکان ہے۔ اس نے اپنی حقیقت، اہمیت اور واقعیت کا اعتراف دنیا کے ہر فرد بشر، بل کہ ہر ذی روح سے کرا لیا ہے۔ ہر متنفس کو اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے لیے نہ کسی ذات برادری کی قید ہے اور نہ کسی خطہ وقریہ کی اور نہ کسی عمر یا صنف کی۔ یہ کسی بھی وقت اور کسی کو بھی بہ حکم ایزدی فنا سے دوچار کر سکتی ہے۔ اسی لیے کسی عارف شاعر نے کہا ہے:

انساں کو چاہیے کہ خیال قضا رہے
ہر کیا، رہیں گے، جب نہ رسول خدا رہے

آئے دن دنیا سے رخصت ہونے والوں کی سناونیاں ملتی رہتی ہیں۔ گزشتہ دو ڈھائی برس سے یہ سلسلہ کچھ زیادہ ہی ہے۔ ان رخصت ہونے والوں میں مختلف حیثیتوں اور سطحوں کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض تو ایسے ہوتے ہیں جو کسی ایک خاندان

یا محدود حلقے کو محزون و مغموم کرتے ہیں اور بعض ایسے جن کی اس دنیا سے روانگی انسانوں کے ایک بڑے طبقے کے لیے تکلیف دہ اور قابل افسوس ہوتی ہے۔ ہمارے شفیق و کریم محترم بھائی مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی بھی انہی مسافران عدم میں سے ہیں، جنھوں نے اس دنیا سے رخصت ہو کر نہ جانے کتنوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ان کی موت سے متاثر و متاسف ہونے والوں میں ان کے اپنے اعزہ واقربا بھی تھے اور ہم جماعت و ہم خیال یار و احباب بھی اور بے شمار ایسے لوگ بھی جن کا ان سے کسی بھی قسم کا ذاتی، خاندانی یا علاقائی رشتہ نہیں تھا۔ ہر سطح، ہر مکتبِ فکر اور ہر طبقے کے لوگوں نے ان کی موت کو محسوس کیا اور آج تک ان کی جدائی پر غم گین و متاسف ہیں۔ حضرت محمود رام پوری (۱۸۶۵-۱۹۳۴) کا یہ شعر کتنا مبنی بر حقیقت ہے:

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک اعلیٰ اخلاق و کردار کے انسان تھے۔ عبادت و ریاضت اور تواضع و خاکساری ان کی پہچان تھی۔ تکیہ شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ جس زہد و اتقا اور اخلاص و استغنا کے لیے ہندستان اور اس سے باہر جانا جاتا ہے، اس کی وہ ایک زندہ مثال اور چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ راے بریلی، لکھنؤ یا باہر کے جلسوں، سمی ناروں اور کانفرنسوں کے مواقع پر وہاں کے دوران قیام میں ان کے روز و شب کے علمی و روحانی مشاغل اور انہماک ہمارے لیے ہمیشہ قابل رشک رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر یا ان کے پاس بیٹھ کر اللہ یاد آتا تھا۔ ماضی قریب و بعید کی علمی، روحانی اور زاہدان شب بیدار شخصیتوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ انھوں نے اپنے عہد کے اعاظم علمی و روحانی رجال کی صحبتیں حاصل کی تھیں، ان سے کسب فیض کیا اور ان کے روشن و

تاب ناک احوال وکوائف کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی تھی۔اس سلسلے میں حضرت قاری صدیق احمد باندوی رحمۃ اللہ علیہ،حضرت مولانا شاہ ابرارالحق حقی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ سید نفیس الحسینی رحمۃ اللہ علیہ کے اسمائے گرامی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔انھیں اس بات کا بھی شرف حاصل تھا کہ انھوں نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طویل صحبت اٹھائی تھی اور ان کے شب وروز کا گہرا مشاہدہ کیا تھا۔مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم سے تو وہ زندگی کے آخری سانس تک وابستہ رہے۔ان کے سفر وحضر میں ان کے ہم راہ رہے اور ان کی قلمی وتحریری معاونت فرمائی۔یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات نے حضرت والا دامت برکاتہم کو بے حد متاثر کیا۔وفات کے دو تین دن بعد رائے بریلی حاضری ہوئی تو یہ بات مجھے شدت کے ساتھ محسوس ہوئی۔

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ درس وتدریس کے ذریعے سے عملی زندگی میں داخل ہوئے تھے۔انھوں نے تعلیم سے فراغت کے بعد ایک طویل مدت تک مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی میں خدمت تدریس انجام دی اور وہاں کے نصاب کے مطابق اونچی اور معیاری کتابوں کا انھوں نے درس دیا اور شاگردوں کی ایک بڑی جماعت کو تعلیم وتربیت سے آراستہ کیا۔کتابی علم کے ساتھ فکری وروحانی تربیت بھی فرمائی اور اپنی نیکی،تقویٰ،محبت،شفقت،پابندی وقت اور ہر کام میں مستعدی کا ان کے دلوں میں گہرا نقش ثبت کیا۔بعد میں بعض اکابر خصوصاً خانوادۂ حسنی کے عظیم المرتبت بزرگ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تجویز اور رہ نمائی میں وہ پورے طور پر تصنیف وتالیف کے لیے یک سو ہو گئے تھے۔انھوں نے خود کو تصنیف تالیف اور

تدوین کے لیے وقف کردیا تھا۔ایسی ایسی چیزیں ان کے قلم سے منصۂ شہود پر آئیں جو بہ ہر حال سیرت وسوانح اور علم وتحقیق کی دنیا کے لیے ایک گراں قدر سرمایہ ہیں۔شائقین تذکرہ وسوانح ان سے تادیر مستفید ہوتے رہیں گے۔

تجدید معاشرت (دوجلدیں)،تاریخ اصلاح وتربیت (دوجلدیں)اور تذکرہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ ان کی وہ مایۂ ناز کتابیں ہیں جو علمی،روحانی اور فکری اعتبار سے انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

جب ہم مولانا کی فرشتہ صفت انسان (ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ندوی)،عائشہ بی (تذکرۂ سیدہ امۃ اللہ تسنیم)،سوانح مولانا شاہ ابرار الحق حقی،تذکرۂ مولانا عبدالباری بھٹکلی،تذکرہ شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جون پوری،سوانح مولانا سید محمد ثانی حسنی ندوی،تذکرۂ مولانا عبدالباری ندوی،تذکرہ مولانا محمد زبیر الحسن کاندھلوی اور سیرت داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی جیسی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو انھیں دادِ تحقیق وتفحص دینی پڑتی ہے۔گرچہ یہ ان کی وہ کتابیں ہیں جنھیں علمی اور تکنیکی اعتبار سے محض تذکرہ وسوانح کے خانے میں رکھا جائے گا۔لیکن اپنی حقیقت،معنویت اور اہمیت کے اعتبار سے یہ وہ کتابیں ہیں جن سے علم وفضل اور اصلاح وتربیت کے ایک دبستاں کی دریافت ہوتی ہے۔یہ وہ کتابیں ہیں جو تادیر بندگان خدا اور طالبان اصلاح وتربیت کو بھی فیض یاب وسیراب کرتی رہیں گی اور اپنے مصنف کے عظیم علمی و فکری ذخیرے میں بھی اضافے کا سبب بنیں گی۔

مولانا سید محمود حسنی کی قلمی کاوشوں میں ایک اہم اور نادر المثال کتاب ''تذکرۂ شیخ الاسلام'' بھی ہے۔یہ کتاب دراصل مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے مختلف النوع کتابوں،مضامین،بیانات اور مکاتیب سے ماخوذ

ہے۔اس لحاظ سے مولانا محمود صاحبؒ اس کے مصنف نہیں مدون ومرتب ہیں۔اسی حیثیت سے کتاب پران کا نام بھی ہے۔لیکن انھوں نے حضرت مولانا علی میاںؒ کے بکھرے ہوئے قلمی وتحریری ذخیرے سے ان کی تحریروں، خطوط اور بیانات سے بعض جملوں کو کچھ اس انداز سے مرتب ومدون کیا ہے کہ اس پر ترتیب یا تدوین کا شبہ بھی نہیں ہوتا۔ پورے طور پر یہ ایک منظم، منصوبہ بند اور مبسوط سوانحی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔اسی طرح کی ایک عظیم کوشش ڈاکٹر خالد ندیم (سرگودھا، پاکستان) نے علامہ شبلی نعمانیؒ کی آپ بیتی کے نام سے کی تھی۔اس کتاب پر انھیں پاکستان میں اعزازات سے سرفراز کیا گیا تھا۔بے شبہ مولانا سید محمود حسن حسنی کی یہ کاوش اس قابل ہے کہ انھیں اس کی بنیاد پر کسی دانش گاہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوتی۔لیکن وہ تو ان سب اعزازات واعترافات سے یکسر بے نیاز تھے۔انھیں ایسے تکلفات اور انعام واکرام سے دور پرے کا بھی واسطہ نہیں تھا۔کسی قسم کے نام ونمود، جاہ وحشمت اورغرض یا لالچ کی انھیں ہوا تک نہیں لگی تھی۔ان کی زندگی تو ملک نصراللہ خاں عزیز کے اس شعر کا چلتا پھرتا نمونہ تھی:

مری زندگی کا مقصد، ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں، میں اسی لیے نمازی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اوران کے خانوادے سے ہمیشہ میری نیازمندانہ وابستگی رہی ہے۔ بہت کم عمری سے میں خود کو خاندان حسنی کا عقیدت مند سمجھنے لگا تھا۔عزیز القدر مولوی شاہ اجمل فاروق ندوی کے وہاں جانے کے بعد سے یہ عقیدت و نیازمندی دوچند ہوگئی تھی۔سیدی ومخدومی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم اور مشفقی ومکرمی حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ

اللہ علیہ کی شفقتوں، کرم فرمائیوں اور خورد نوازیوں نے مجھے اس خانوادے سے بہت قریب کر دیا تھا بل کہ اقرب۔ لیکن یہ عجیب اتفاق کہ مولانا محمود حسن حسنی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت دیر میں تعارف ہوا۔ ان کا نام سب سے پہلے میں نے اپنے بیٹے مولوی اجمل فاروق ندوی کی زبان سے سنا۔ وہ اس وقت ندوۃ العلماء کی شاخ معہد سیدنا ابی بکر صدیق مہپت مئو۔ لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے۔ انہی کے ذریعے سے ان کی تصنیف و تالیف سے غیر معمولی دل چسپی اور اپنے خوردوں کے ساتھ محبت و شفقت علم میں آئی تھی۔ ان سے پہلی ملاقات جنوری یا فروری ۲۰۰۱ء میں ہوئی۔ یہ ملاقات بڑی تفصیلی اور معلومات افزا تھی۔ نہ پوچھیے کن کن بزرگوں کے نام زیر تذکرہ آئے اور ان کی زندگی کے کن کن پہلوؤں پر بصیرت افروز گفتگو ہوئی۔ ان کے لیے میری یہ بات سب سے زیادہ کشش والتفات کا باعث تھی کہ میں حسنی خانوادے کے مشہور و معروف بزرگ مجدد عصر اور سراپا تبلیغ و دعوت حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک منتسب کا نواسہ تھا۔ اس کے علاوہ مجھ میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو ان کو میری طرف متوجہ کرتی اور وہ میرے ساتھ کوئی خصوصی برتاؤ کرتے۔ مولانا محمود حسنی سے دوسری کسی قدر تفصیلی ملاقات اپریل ۲۰۰۴ء میں ہوئی۔ مدرسہ فلاح المسلمین تیندوا ضلع رائے بریلی میں حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ایک عظیم یک روزہ سمینار کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس میں مقالہ خوانی اور اظہار خیال کے لیے بڑے بڑے علماء اور دانش وروں کے ساتھ ہم خوردوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس موقع پر مولانا محمود صاحب سے اچھی ملاقات رہی۔ ان کی اس بات نے خصوصیت کے ساتھ متاثر کیا کہ انھوں نے اپنی جملہ مصروفیات کے ہجوم میں عزیز القدر اجمل فاروق سلمہٗ سے اپنی ہدایت و رہ نمائی میں حضرت سید نصیر آبادی رحمۃ اللہ

علیہ پر ایک مقالہ لکھوایا اور اسے منتظمین سے کہہ کر سمی نار میں پڑھوایا بھی۔ اس سے ان کی خورد نوازی، علم دوستی اور تربیتی مزاج و طبیعت کا اندازہ ہوا۔ وہ اجمل میاں کی اکثر حوصلہ افزائی فرماتے رہتے تھے اور حسب موقع انھیں تحسینی کلمات سے نوازتے رہتے تھے۔

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے تھے۔ وہ ۱۹۷۱ء میں عالم وجود میں آئے تھے۔ اس وقت تک میں نہ صرف اسٹیج پر آچکا تھا، بل کہ دور دراز کے سیرت النبی کے جلسوں اور نعتیہ و بہاریہ مشاعروں میں مجھے مدعو کیا جانے لگا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مقام اور مرتبے میں وہ مجھ سے بہت بڑے تھے۔ وہ علم و فضل اور اصلاح و تربیت کے اس مقام پر فائز تھے کہ اگر ہم سر اٹھا کے دیکھیں تو ہماری ٹوپیاں گر جائیں۔ میں ان سے جب بھی ملا ہوں اور ان کے پاس بیٹھا ہوں، مجھے اس مقام اور مرتبے میں اضافہ ہی محسوس ہوا ہے۔ جب بھی ان سے مل کر آیا ہوں، اپنے دامن کو خیر و برکت سے بھرا ہوا محسوس کیا ہے۔ لیکن وہ اپنی اس بلندی و رفعت کے باوجود مجھ ہیچ مداں سے محبانہ و نیازمندانہ تعلق رکھتے تھے۔ زبان و بیان اور املاء و انشاء کے سلسلے میں اکثر کچھ نہ کچھ دریافت فرماتے رہتے تھے۔ اپنی زیر تحریر چیزیں ضرور دکھاتے اور سناتے تھے۔ فرماتے تھے کہ حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کی خصوصی تاکید ہے کہ آپ جب بھی ندوۃ العلماء تشریف لائیں، آپ سے زبان و بیان کے سلسلے میں ضرور استفادہ کروں اور آپ کو اپنی زیر تصنیف چیزیں دکھا کر مشورہ و رہ نمائی حاصل کروں۔ یہ بھی ان کی عظمت اور بلندیِ اخلاق کی بات تھی کہ اپنی ہر کتاب مجھے ضرور مرحمت فرماتے تھے۔ بالعموم اس پر یہ عبارت لکھتے تھے:

”بہ شرفِ ملاحظہ مخدومی جناب ڈاکٹر تابش مہدی مدظلہ العالی“

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تکیہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی کے سادات حسنی خانوادے کے ایک ایسے روشن و تابناک چراغ تھے، جو اس کی روایت اور عظمت و نورانیت کو پورے طور پر روشن و منور کرتے رہتے تھے اور دور دور تک اس کے فیوض و برکات کی ترسیل کے لیے بڑی مربیانہ حکمت و دانش مندی کے ساتھ ساعی و کوشاں رہتے تھے۔نئی نسل کے ایک بڑے طبقے کو اس روحانی تربیتی اور اصلاحی خانوادے سے مستفید، مستفیض اور روشناس کیا۔عہدِ حاضر کے عظیم علمی وروحانی شخصیتوں سے ان کی عقیدت و محبت اسی روحانی و مقدس جذبے کی نشان دہی کرتی ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ ۱۲/اگست ۲۰۲۲ء کو ہم جیسے نہ جانے کتنوں کو محزون و مغموم کرکے دنیا سے رخصت ہوگئے۔لیکن انھوں نے خاموشی و یکسوئی کے ساتھ جو علمی وروحانی یادیں چھوڑی ہیں اور عظیم کارنامے انجام دیے ہیں، ان سے ہم تادیر مسرور و فیض یاب ہوتے رہیں گے۔

ایک صوفی صفت انسان

مولانا محمد وسیم صدیقی ندوی
(استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

مولانا محمود حسنی بہت ہی نیک، پرہیزگار، عبادت گذار، شب بیدار، اللہ والے انسان تھے، ان کے اندر مردمومن کی وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جس کو اقبال نے ''مرد مومن'' کے لقب سے یاد کیا ہے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بارہا اس کا تذکرہ فرمایا ہے اور اس تعبیر کو پسند کیا ہے، وہ مردمومن کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔

میرا سب سے پہلے ان سے تعارف اس وقت ہوا جب میں مدرسہ مظہر الاسلام میں اہتمام کے فرائض انجام دے رہا تھا اور وہ ناظم مدرسہ اسحاق حسینی مرحوم کے حکم پر یوسف حسینی بن سلمان حسینی کے لیے تشریف لائے تھے کہ انہیں عالیہ اولیٰ کا تصدیق نامہ مدرسہ سے دلایا جائے، اس کے بعد ایک لمبے عرصہ کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ملاقات ہوئی اور پھر بار بار ملاقات ہوئی، اسی ملاقات میں قربت اس وقت پیدا ہوئی جب سعودی سفارت خانہ سے حج کے لیے ایک امیدوار منتخب کرنا تھا اور یہ ذمہ داری مجھ پر تھی اور مجھے اس سلسلہ میں حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب دامت

برکاتہم (ناظم ندوۃ العلماء) سے ملنا تھا، اتفاق سے وہ ملے اور بڑے ہی پیار ومحبت بھرے لہجہ میں حضرت سے میرا تعارف کرایا اور پھر فرمایا کہ اس کے لیے مولانا محمد وثیق ندوی صاحب بہت موزوں ومناسب رہیں گے اوران کی ندوہ کے لیے خدمات ہیں، میں نے موافقت کی اور حضرت کی اجازت سے نام طے ہوگیا اور وہ بحمد اللہ بخیر وخوبی حج کر کے واپس آئے۔

اس کے بعد پھر ملاقات کا سلسلہ رہنے لگا، اس دوران انہوں نے میری نیک نامی کا بڑا ذکر کیا، میں ان کا بہت ہی ممنون رہنے لگا، عاجزی وانکساری کا جواب نہ تھا، جب بھی ملتے بہت محبت سے مسکراتے ہوئے ملتے، بلکہ بسا اوقات میرا ہاتھ چوم لیتے، میں شرم سار ہوجاتا اور کہتا کہ مولانا! آپ کا ہاتھ ہم چومیں گے نہ کہ آپ ہمارا، فرماتے: آپ ہمارے بڑے ہیں اور کئی لوگوں نے بتایا کہ مولانا کا یہ معاملہ میرے ساتھ بھی تھا، یہ صفت اللہ والوں کی ہوتی ہے، جو اللہ کے بندوں کو اپنے سے اعلیٰ وبلند سمجھتا ہے اور اپنے کو کم تر، بہرحال ایسا تواضع کہ آج اس زمانہ میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

ملاقات کا سلسلہ جاری رہا، پھر اچانک بہت دنوں تک مولانا کو دیکھا نہیں کہ مولانا کہاں ہیں؟ معلوم ہوا کہ مولانا سخت بیمار ہیں اور گردہ کا عارضہ درپیش ہے، چلنا پھرنا بند ہوگیا، پھر تو افسوس کی انتہا نہ رہی، ہمارے بیٹے سالم فیضان جو دبئی میں ہیں، وہ ان سے بہت محبت کرتے تھے اور کہتے تھے ہمیں مولانا بہت اچھے لگتے ہیں، بڑے مخلص، اللہ والے، انہوں نے تکیہ میں بارہا ذکر میں مشغول دیکھا تھا، ہم سے پوچھنے لگے کہ یہ کون مولانا ہیں؟ تو میں نے تعارف کرایا، میں نے بھی ایک بار ذکر بالجہر کرتے ہوئے رائے بریلی تکیہ میں رمضان المبارک میں دیکھا، عجیب

والہانہ کیفیت سے اور فنائیت و عشق کے جذبہ سے فرما رہے تھے، میں بہت دیر تک دیکھتا رہ گیا۔

بہرحال مولانا کا جن سے بھی تعلق تھا وہ اسی طرح کے جذبات واحساسات اور ان کی محبت وخلوص، بے لوثی وبے نفسی، تواضع وعاجزی کا قائل تھا اور وہ اس ذکر میں حق بجانب ہوگا، کیونکہ مولانا کے اندر یہ خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں، مولانا ان اعلیٰ صفات کا نمونہ تھے، بیماری میں گھر بھی عیادت کے لیے گیا، تو بڑی محبت سے پیش آئے اور حتی الامکان ضیافت بھی فرمائی، بڑی قدر آئی، محبت میں اضافہ ہوتا رہا، لیکن کیا معلوم تھا کہ مولانا کا یہی مرض مرض الوفات بن جائے گا، بہرحال اللہ کے تقدیر وفیصلے کے آگے ہر شخص بے بس اور ہر شخص کو اس دار فانی سے دار بقا کی طرف کوچ کرنا ہے: ”اذا جاء أجلھم فلا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون“

اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے اور ان کی شایان شان بدلہ عنایت فرمائے اور پسماندگان اور بھائیوں مسعود حسنی اور منصور حسنی کو صبر جمیل عطا فرمائے اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب دامت برکاتہم جن کو اس عمر میں اس صدمہ سے دوچار ہونا پڑا، اللہ تعالیٰ انہیں بھی صبر عطا فرمائے اور ہم لوگوں پر ان کا سایہ شفقت دراز فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

رفیق محترم مولانا محمود حسنی - چند یادیں

مفتی راشد حسین ندوی
(مہتمم مدرسہ ضیاء العلوم - رائے بریلی)

۱۱؍اگست ۲۰۲۲ء جمعرات کو مدرسہ کے اساتذہ مولانا دوست محمد صاحب ندوی، مولانا سہیل ندوی اور راقم نے طے کیا کہ آج مولانا محمود صاحب کی عیادت کے لیے لکھنؤ چلتے ہیں، مولانا عرصہ سے گردے کے عارضہ میں مبتلا تھے اور علاج کے لیے لکھنؤ کے ایک پرائیویٹ ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھے، مدرسہ کے اکثر اساتذہ عیادت کر کے آچکے تھے، سب کا کہنا تھا کہ مولانا کی حالت سیریس ہے، وینٹی لیٹر پر ہیں، ابھی تک ہم لوگ عیادت کے لیے نہیں جاسکے تھے، بہر حال ہاسپٹل گئے اور باری باری دور سے مولانا سے سلام دعا کی، قریب جانے کی اجازت نہیں تھی، معلوم ہوا کہ آج وینٹی لیٹر ہٹا لیا گیا ہے، اس سے کچھ اطمینان ہوا، مولانا ہوش میں تھے اور بغور ہمیں دیکھ رہے تھے، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شاید پہچان رہے ہیں، لیکن چونکہ منھ میں آلات لگے ہوئے تھے، اس لیے مولانا بات نہیں کر سکتے تھے اور صحیح طور سے یہ کہہ پانا مشکل تھا کہ ہمیں پہچان سکے یا نہیں، بہر حال عیادت کے بعد جب ہم ندوہ گئے

اور لوگوں نے مولانا کا حال پوچھا تو ہم نے یہی بتایا کہ اب تو ماشاء اللہ حالت کچھ بہتر لگ رہی ہے، پھر ہم مدرسہ واپس آ گئے اور دوسرے دن جمعہ تھا، میں مدرسہ کے اپنے کواٹر میں تھا اور جمعہ کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا کہ اچانک سوشل میڈیا کے ذریعہ حادثہ جانکاہ کی اطلاع ملی، دل دھک سے رہ گیا، پہلے ہمیں بھی حادثہ کا اندیشہ لگ رہا تھا، لیکن ملنے کے بعد صحت کی امید ہو رہی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے کہ موت کا جو وقت مقرر ہے اس سے ایک ساعت کا بھی فرق نہیں ہو سکتا۔ فانا للہ و انا الیہ راجعون، للہ ما أخذ و لہ ما أعطی و کل شئ عندہ بأجل مسمی.

مولانا محمود حسنی صاحب کو راقم نے سب سے پہلے اس وقت دیکھا جب مولانا نے ندوہ میں داخلہ لیا، مولانا مہمان خانہ کے سامنے مسجد کے پاس تھے، راقم اطہر ہاسٹل سے مسجد کی طرف آ رہا تھا، مجھے مولانا مرحوم میں اپنے رفیق درس اور اس وقت ناظر عام ندوۃ العلماء مولانا بلال صاحب سے مشابہت نظر آئی، ساتھیوں نے بتایا کہ یہ بھی حسنی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں مولانا سے زیادہ تعلق نہیں ہو سکا، مرحوم سے تعلق اس وقت ہوا جب راقم کا تقرر مدرسہ ضیاء العلوم میں ہوا اور فراغت کے بعد مولانا مرحوم کے بھی مدرسہ میں کچھ گھنٹے لگے، مولانا مرحوم کو خاص طور سے حدیث شریف کی تدریس کی خواہش تھی، اس وقت مدرسہ صرف ثانویہ خامسہ تک تھا اور حدیث کی صرف ایک کتاب ''تہذیب الاخلاق'' تھی، مولانا نے کوشش کر کے اس کا گھنٹہ لگوایا اور پوری دلچسپی سے تدریسی فرائض انجام دیے، بعد میں جب درجات بڑھائے گئے تو حدیث کی دوسری کتابیں بھی آپ کو دی گئیں۔

مولانا اس زمانہ میں بھی مضامین لکھتے تھے اور بہت اچھا لکھتے تھے، لیکن ان کی خاص بات یہ تھی کہ وہ طلبہ کو تاڑ لیا کرتے تھے اور جن کے اندر تحریر کا ملکہ نظر آتا تھا، ان کی خصوصی تربیت کیا کرتے تھے، اس طرح کئی طلبہ کو انہوں نے اچھا لکھنے والا

بنادیا، ان کی تحریری صلاحیتوں کے سبب مدرسہ کی ''الاصلاح'' کی بزم مقالات جس کا نام یہاں ''بزم ثانی'' ہے کے صدر اور حکم اکثر وہی ہوا کرتے تھے اور مدرسہ کے طلبہ کی جانب سے جداری پرچوں کی سرپرستی بھی اکثر ان کے ذمہ ہوا کرتی تھی۔

مولانا کی تحریر سہل ممتنع کا بہترین نمونہ تھی، اس کو ہر خاص وعام سمجھ لیتا تھا، ہمارے گھر میں ان کے مضامین کو دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا اور بہت پسند کیا جاتا تھا، مولانا کا خاص میدان سیرت وسوانح تھا، اس موضوع پر ان کی کئی کتابیں ہیں، لیکن اس آخری دور میں حسنی خاندان کے سلسلہ میں ان کی معلومات قابل رشک تھیں، اسی لیے خاندان کے کسی بھی فرد کے انتقال پر مولانا کی تحریر دیکھنے اور پڑھنے کے لائق ہوتی تھی، عام طور سے ہم کو سنین یادرکھنے میں دقت پیش آتی ہے، لیکن مولانا کا معاملہ اس باب میں قابل رشک تھا، کسی بھی شخصیت سے متعلق مختلف سنین ان کی نوک زبان پر ہوا کرتے تھے، خاص طور سے خاندان کے افراد کے متعلق، تکیہ کے قبرستان میں قبروں پر کتبات نہیں لگے ہیں، لیکن مولانا کسی بھی قبر کے متعلق بتاسکتے تھے کہ وہ کس کی ہے اور کسی بھی شخصیت کی قبر کی نشان دہی کر سکتے تھے۔

مولانا کا تعلق ہندوستان کے مایہ ناز حسنی خاندان سے تھا، وہ یہاں کے بزرگوں کے منظور نظر تھے، ہندو پاک کے اکثر علماء اور بزرگ ان سے واقف تھے، درجنوں کتابوں کے مصنف تھے، لیکن مولانا حد درجہ متواضع تھے، اپنے قول وفعل سے کبھی بھی اس کا اظہار نہیں کرتے تھے، بلکہ چونکہ راقم مولانا بلال صاحب کا ساتھی تھا اور وہ مولانا بلال صاحب کو ماموں کہتے تھے اور ان کا احترام کرتے تھے تو بلال صاحب کا ساتھی ہونے کے سبب وہ ہمارا بھی بہت خیال کرتے تھے۔

سفر میں کسی کا ساتھ ہو تو بڑی حد تک اس کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، مولانا کے ساتھ

مغربی یوپی کے ایک سفر کا ایک پورے وفد کے ساتھ موقع ملا، اس میں مولانا کی خوبیاں اور کمالات نظر آئے، ایک دو بار مولانا راقم کے وطن بارہ بنکی کے گاؤں بھی تشریف لے گئے۔

جب میری تالیف کردہ کتاب ''الفقہ المیسر فی المعاملات''شائع ہوئی، تو مولانا نے ''تعمیر حیات'' میں اس پر ایک بسیط تبصرہ کیا اور کتاب میں واقع کچھ خامیوں کی طرف خاص طور سے توجہ دلائی، اس تبصرہ سے کتاب کا بڑے حلقہ میں تعارف ہوا اور اگلے ایڈیشن میں تصحیح کے وقت ان کے تبصرہ سے بڑی مدد ملی۔

ان کا قلم بہت رواں تھا، بہت ساری کتابیں لکھیں، امید تھی کہ اللہ ان سے خوب کام لے گا اور بہت دور تک جائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں، پھر بھی مولانا مرحوم نے اتنی عمر میں بھی خوب لکھا ہے، حضرت مولانا رابع صاحب کے اسفار وہی لکھتے تھے، تعمیر حیات کے کئی کالم مستقل انہی کے ذمہ تھے، ان سب کو بھی کتابی شکل دی جائے تو مولانا کی تصانیف کی تعداد کافی بڑھ جائے گی۔

مولانا مرحوم کی ایک بہت امتیازی خوبی جس کا ذکر پہلے آنا چاہیے تھا، یہ تھی کہ مولانا اسفار میں ہر طرح کی مشقت برداشت کرلیا کرتے تھے، ریزرویشن نہ ہوتو چالو ڈبہ میں، بیٹھنے کی جگہ نہ ہوتو کھڑے کھڑے سفر کرلیا کرتے تھے، اس صفت میں ہم بلاتردد ان کی تشبیہ حضرت قاری صدیق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دے سکتے ہیں، ورنہ ہم میں سے اکثر لوگوں کے لیے اس طرح مشقت برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے۔

ہم اخیر میں اللہ تعالیٰ کے حضور دست بدعا ہیں کہ یا اللہ! آپ کا یہ بندہ آپ کے پاس حاضر ہے، یا اللہ! اس کے حسنات کو قبول فرما، درجات بلند فرما، جنت الفردوس نصیب فرما، یا اللہ! ان کے تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرما۔ آمین!

خانوادۂ حسنی کا ایک چراغ بجھ گیا

مولانا محمد ناصر سعید اکرمی
(ایڈیٹر نقوش طیبات- بھٹکل)

مولانا محمود حسن حسنی ندوی کا انتقال مؤرخہ ۱۳؍محرم الحرام ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۲؍اگست ۲۰۲۲ء بروز جمعہ کو ہوا، انا للہ وانا الیہ راجعون!

مولانا محمود صاحب کی بیماری کی خبریں کئی دنوں سے مل رہی تھیں، گردے کام نہیں کررہے تھے، ڈائلیسس کے مراحل سے بھی گذر رہے تھے، کئی دن ہسپتال میں زیر علاج رہے، نلکیوں سے دوا پہنچائی گئی، ہاتھ کے اشاروں سے باتیں کرنے لگے، مولانا سید بلال حسنی اور مولانا سید جعفر حسنی مدظلہ سے فون کے ذریعہ مولانا مرحوم کی صحت کے بارے میں راقم معلومات حاصل کرتا رہا، انسان اپنی کوشش کرتا ہے لیکن جب وقت موعود آجاتا ہے تو علاج معالجہ کچھ بھی کام نہیں آتا، ڈاکٹر بھی عاجز آجاتے ہیں، جمعہ کے دن صبح ۹؍بجے یہ خبر آئی کہ مولانا نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی اور یہ خبر واٹس ایپ پر پھیل گئی کہ مولانا محمود صاحب اس دار فانی سے کوچ کر گئے، لوگوں کی سوانح لکھنے والا قلم خاموش ہو گیا، ہر ایک کے لیے مسکراتے چہرے کے ساتھ

ملاقات کرنے والے کا چہرہ رخصت ہوگیا، اپنے اور پرائے سب کے ساتھ یکساں سلوک کرنے والا اور خندہ پیشانی سے ملنے والا ہمیشہ کے لیے ساکت وجامد پڑا ہے اور تغسیل وتکفین کے بعد اپنی آخری آرام گاہ میں محو استراحت ہے، ''إنا للہ و إنا إلیه راجعون، إن للہ ما أعطی و له ما أخذ و کل شيء عنده بأجل مسمی'' اللہ تعالیٰ کے پاس ہر ایک کی اجل مقرر ومتعین ہے، انسان اپنی اجل پوری کر کے دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے، انسان کی آرزوئیں، تمنائیں انسان کے عزائم اور منصوبے سب دھرے رہ جاتے ہیں اور آدمی اٹھ جاتا ہے۔

رب ذوالجلال نے مولانا مرحوم کو ڈھیر ساری صفات وکمالات سے نوازا تھا، سب کے ساتھ حسن اخلاق سے ملتے تھے، خاموش طبیعت کے مالک تھے، حسنی خاندان کے چشم وچراغ تھے، اس لیے حسنی خاندان کی وہ تمام صفات وکمالات مرحوم کے اندر پائی جاتی تھیں، علم وعمل دونوں میں آپ ممتاز تھے۔

مرحوم محمود حسنی صاحب کی تاریخ پیدائش ۲۲/جولائی ۱۹۷۱ء کی ہے، گھر کا ماحول علمی تھا، ابتدائی تعلیم رائے بریلی میں حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لیے ندوہ کا رخ کیا، وہاں عالمیت پھر فضیلت میں اعلیٰ نمبرات سے کامیابی حاصل کی، پھر ایک سال المعہد العالی میں داخلہ لیا اور وہاں ایک سالہ کورس مکمل کیا۔

مولانا مرحوم کو بچپن ہی سے کتب بینی کا بڑا شوق تھا، اپنا اکثر وقت کتابوں کے مطالعہ میں لگاتے، جس سے ان کی صلاحیت پختہ ہوتی گئی، درحقیقت آدمی ماحول سے بنتا ہے، ماحول اچھا ہوتو اچھا اور ماحول صالح نہ ہوتو آدمی بگڑ جاتا ہے، ماحول اگر علمی ہوتو آدمی پختہ عالم بن کر ملت کے لیے کارآمد بنتا ہے، اس سے انسانیت کو فائدہ پہنچتا ہے، اس لیے شروع ہی سے علمی ودینی ماحول میں خود کو ڈھالنا چاہیے، دنیا میں جو بھی

بڑے بنے ہیں اور جن سے ملت کو فائدہ پہنچا ہے وہ صالح ماحول میں پنپنے کی وجہ سے بنے ہیں، اس میں ایک طرف والدین کا بڑا دخل ہے تو دوسری طرف اساتذہ کا بھی اس میں بڑا رول ہوتا ہے۔

مولانا مرحوم کو اچھا ماحول ملا، علمی فضا میں آنکھیں کھولیں، اس لیے خوب پھلے پھولے، خوب چمکے، ظاہر و باطن دونوں میں نمایاں رہے، ادھر راقم کا چند ماہ پہلے استاذ محترم حضرت مولانا محمد صادق اکرمی ندوی دامت برکاتہم کی معیت میں ندوہ کا سفر ہوا تھا، پورے پانچ دن ندوہ کے ماحول میں گزرے اور مرشد الامت حضرت مولانا کی صحبت میں رہنے کے مواقع ملے، ان ایام میں مرحوم مولانا محمود صاحب سے کئی ملاقاتیں رہیں، مہمان خانہ میں، مسجد میں، حضرت والا کی مجلس میں، دسترخوان پر، ہر وقت آمنا سامنا ہوتا، وہی ملنساری و خندہ پیشانی اور منکسر المزاجی، وہی تواضع و خاکساری ہر وقت دیکھنے میں آئی، حضرت کی مجلس میں کچھ بولتے ہی نہیں تھے، بات بھی کرتے تو نہایت دھیمی آواز میں، دسترخوان پر ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے کے مواقع ملے، معمولی اور نہایت قلیل مقدار میں کھانا تناول کرتے، ہم وجہ پوچھتے تو ہنس کر ٹال دیتے، مولانا سال بھر سے بیمار ہی چل رہے تھے، غالباً بیماری کے ان ایام میں ایک مرتبہ بھٹکل بھی تشریف لائے تھے اور یہ سفر بغرض علاج ہوا تھا، تین روز جامعہ اسلامیہ میں مولانا کا قیام رہا، اساتذہ کے درمیان مولانا کا خطاب بھی ہوا، اس موقع پر مولانا نے بڑے درد کے ساتھ علماء کی کیا کیا ذمہ داریاں ہیں اس کی طرف خصوصی توجہ دلائی، اس فتنہ کے زمانہ میں جب کہ مساجد اور مدارس دشمنوں کے نشانہ پر ہیں، ہماری مساجد محفوظ نہیں ہیں، ہماری خانقاہیں محفوظ نہیں ہیں، تو علماء کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے، اب یہ وقت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے کا نہیں ہے، کچھ اس طرح کی باتیں

مولانا نے اپنے خطاب میں فرمائی تھیں، ایسا لگا کہ مولانا نے کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہو، میں اگرچہ اس وقت موجود نہیں تھا لیکن سننے والوں نے مجھے بتایا کہ مولانا کی وہ تقریر پرسوز تھی، ایک کڑھن اور بے کلی و بے چینی کی سی کیفیت مولانا کی باتوں سے ظاہر ہو رہی تھی، کسی نے ریکارڈ کیا ہو تو وہ تقریر ضرور شائع ہونی چاہیے۔

مولانا مرحوم بھٹکل کئی بار آئے، حضرت مفکر اسلام کے ساتھ آئے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے ساتھ آئے، آخری مرتبہ وفات سے پہلے جب تنہا آئے تھے تو اس موقع پر کھل کر بات بھی کی تھی، جو دین کا کام کرتا مولانا اس سے بہت خوش ہو جاتے تھے، ہمت بڑھاتے، مشورے دیتے، حتی الامکان ساتھ بھی دیتے، دوسروں کے کاموں سے خوش ہوتے، تشجیعی کلمات سے نوازتے، قدر کرنا، ہمت بڑھانا یہ حسنی خاندان کا طرۂ امتیاز رہا ہے، راقم یہ بات یوں ہی نہیں کہہ رہا ہے بلکہ علی بصیرۃ کہہ رہا ہے، ان کے اکابر کو ہم نے دیکھا ہے، حضرت مفکر اسلام سے لے کر مرشد امت تک، مولانا عبداللہ حسنی مرحوم اور مولانا حمزہ حسنی سے لے کر مولانا سید بلال حسنی اور محمود حسنی تک اسی طرح دیگر حضرات کو سب کو دیکھا اور دیکھ رہا ہوں، سب کے سب اللہ والے، نیک دل، نیک طینت، سب کے سب اسلاف کے نمونے اپنی سادگی میں، رہن سہن میں، علم و عمل میں سب میں ممتاز و فائق ہیں۔

مرحوم محمود صاحب کے بارے میں لکھنے والوں نے بہت لکھا ہے اور لکھ رہے ہیں، ان کے بارے میں مولانا عمر عابدین نے لکھا ہے:

''مولانا مرحوم اخلاقی قدروں کے آئینہ دار، خاندانی روایتوں کے پاسدار اور حسنی نسبتوں کے تاجدار تھے، تواضع وانکساری کے پیکر اور مہمان نوازی کے خوگر تھے، جو ان سے ملتا ان کا ہو جاتا تھا، سادگی و درویشی میں ڈھلے اور قلندرانہ رنگ

وآہنگ میں سجے سجائے تھے، سنجیدگی ومتانت کے ساتھ ساتھ تبسم آمیز لب ولہجہ ان کی شخصیت کا عکس خاص تھا، یہی مولانا مرحوم کی زندگی کا عکس اور نچوڑ تھا۔‘‘

معہد امام حسن البنا میں بھی مولانا تشریف لائے تھے، اس کی سرگرمیوں سے آگاہی حاصل کی اور اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار بھی معائنہ کاپی میں تحریر فرمایا، معہد سے نکلنے والے رسالہ ’’نقوش طیبات‘‘ کے خصوصی شماروں میں مولانا کے مضامین شائع ہوئے ہیں، جب بھی مضمون کے لیے فون پر درخواست کی جاتی، مضمون بھیج دیتے، ادھر وفات سے دو ماہ پہلے ’’مولانا شہباز اصلاحی اور تصوف‘‘ کے عنوان پر ۲۰/۲۲ صفحات پر مشتمل مضمون ارسال فرمایا تھا، معہد میں جو کتاب بھی شائع ہوتی مولانا کی خدمت میں ارسال کی جاتی، مولانا اس کو سراہتے اور تشجیعی کلمات سے نوازتے، وفات سے چند ماہ پہلے معہد سے چار کتابیں شائع ہوئی تھیں، ’’ذکر ندوہ‘‘ ’’مکتوبات شہباز‘‘ ’’سوئے حرم‘‘ ’’ڈاکٹر حمید اللہ‘‘ یہ سب مولانا کی خدمت میں ارسال کی گئیں تو مولانا نے فون پر ملنے کی اطلاع دی اور مکتوبات شہباز کی روشنی میں اپنا مضمون ارسال فرمایا اور جابجا اس کے حوالے بھی دیے۔

مولانا مرحوم کو سوانح عمری لکھنے میں ید طولیٰ حاصل تھا، ان کے رواں قلم سے کئی کتابیں معرض وجود میں آئی ہیں، ’’تذکرہ مولانا زبیر الحسن کاندھلوی‘‘ ’’تذکرہ سید عبداللہ حسنی‘‘ ’’تذکرہ مولانا یونس جونپوری‘‘ ’’تذکرہ مولانا عبدالباری ندوی بھٹکلی‘‘ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

استاذ محترم مولانا محمد اقبال ملا ندوی پر ’’ذکر اقبال‘‘ کے نام سے کتاب معہد سے شائع ہوئی تو اس میں مولانا کا طویل مضمون ہے، مولانا لکھتے ہیں:

’’سال رواں میں برصغیر کی جن ذی علم وعمل شخصیات نے وفات پائی، ان میں

ایک اہم نام بھٹکل کے مولانا احمد اقبال ملا ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے، جنھوں نے سخت حالات میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی تھی کہ ان کے معاشی حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ تعلیم یکسوئی سے حاصل کر پاتے، دین اور علم دین کا شوق تو انہیں ندوہ لے آیا تھا، یہ ۱۹۶۵ء-۱۹۶۶ء کا سن رہا ہوگا، یہ اور ان کے دو اہم اور بعد کے بزرگ ساتھی محمد صادق اکرمی ندوی، مولانا محمد غزالی ندوی بھی تھے، ندوہ میں ان کے ساتھیوں میں عالی مکرم و محترم مولانا حمزہ حسنی ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء، مولانا محمد حسان نعمانی صاحبزادۂ گرامی منزلت حضرت مولانا منظور نعمانی، مولانا محمد عمر ٹونکی وغیرہ تھے۔'' (ذکر اقبال:۱۲۱)

جامعہ کے یکے از بانیان، بھٹکل کی روحانی شخصیت، حضرت مولانا سید ابرارالحق کے خلیفہ اجل حضرت ڈاکٹر علی ملپا رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر ملال پر معہد حسن البنا سے ۴۰۵ رصفحات پر مشتمل ''نقوش طیبات'' کا خصوصی نمبر شائع ہوا تو اس میں مرحوم محمود صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے اپنے روابط کا اظہار کرتے ہوئے تفصیلی مضمون ارسال فرمایا تھا، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں:

''عارف باللہ حضرت ڈاکٹر علی ملپا بھٹکلی رحمۃ اللہ علیہ سلسلۂ تھانوی کی عظیم المرتبت شخصیت اور یادگار اسلاف تھے، جن کے پاس بیٹھ کر اللہ یاد آتا تھا، جن کو دیکھ کر ایمان تازہ ہوتا تھا، مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری الہ آبادی کے اور محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرارالحق حقی ہردوئی کے خلیفہ اور ایک صاحب دل اور قوی النسبت بزرگ تھے، جامعہ اسلامیہ کے بانی اور صدر اور سرپرست تھے۔'' (نقوش طیبات ڈاکٹر علی ملپا نمبر:۱۸۹)

''ان کی یعنی حضرت شاہ ابرارالحق صاحب کی وفات کے بعد اسی فہرست کے

اہم رکن حاجی حقداد خان علیہ الرحمہ سے رجوع کیا اور بیعت کی، حضرت حاجی صاحب کا تعلق لکھنؤ سے تھا، لکھنؤ کے اس سفر میں حضرت ڈاکٹر صاحب نے لکھنؤ کی برگزیدہ شخصیات اور ندوہ کے اکابرین کی زیارت کی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی اور دوسری بڑی شخصیات تھیں، جہاں تک مولانا عبدالماجد دریابادی کا تعلق ہے وہ ان کی محسن شخصیت ہیں جن سے ان کو اس راہ میں چلنے کا حوصلہ کلکتہ کے زمانۂ قیام میں ملا تھا، جب وہ کلکتہ میں مقیم تھے، پھر یہ تعلق اتنا بڑھا کہ ڈاکٹر صاحب نے دریاباد کے بھی سفر کیے اور مولانا دریابادی جن کے یہاں اوقات کی تقسیم تھی اور ملاقات کے لیے محدود وقت دیا کرتے تھے تاکہ علمی و تصنیفی مشاغل متاثر نہ ہوں، آپ کے لیے دوسرے خانگی اوقات میں کمی کر کے وقت فارغ کرتے اور ہر ہر قدم پر آپ کو مولانا دریابادی کی رہنمائی حاصل رہی۔'' (ڈاکٹر علی ملپا نمبر: ۱۹۰)

مولانا محمد غزالی ندوی مرحوم پر مولانا محمود نے خوب تحریر فرمایا ہے، چنانچہ معہد سے جب مولانا غزالی پر ضخیم خصوصی شمارہ نکلا جو ۲۶۷ صفحات پر مشتمل ہے، یہ خصوصی نمبر بڑے آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا تھا اور اس کا اجراء حضرت مولانا سید رابع حسنی ندوی کی مجلس میں ہوا تھا۔

اس میں بھی مولانا محمود مرحوم کا مضمون شائع ہوا ہے، مولانا مرحوم کے مولانا غزالی صاحب سے اچھے روابط تھے، مولانا نظام الدین دہلی جاتے تو انہی کے پاس رکتے، مولانا غزالی اپنی مادر علمی ندوۃ العلماء تشریف لاتے تو مولانا محمود صاحب فرط محبت میں آنکھیں بچھاتے نظر آتے، مولانا محمود صاحب کو مولانا غزالی صاحب سے غیر معمولی تعلق تھا، اس خصوصی نمبر میں مولانا کا کئی صفحات پر مشتمل مضمون شائع ہوا

ہے جس کا ایک اقتباس یہاں ملاحظہ فرمائیں:

''مخدوم گرامی حضرت مولانا محمد غزالی خطیبی ندوی نوراللہ مرقدہ کی ایمان وتقویٰ کی حامل ولایت والی زندگی نے ربوبیت کاملہ پر وہ یقین پیدا کردیا تھا کہ زندگی کے سخت حالات، نشیب وفراز سب میں وہ اس اطمینان کے ساتھ کمال شکر وصبر سے آگے بڑھتے چلے گئے کہ نہ ان کا دامن داغ دار ہوا، نہ زبان پھسلی، نہ دل میلا ہوا۔''

(نقوش طیبات مولانا غزالی نمبر: ۲۱۴)

''ہم کفش برداروں کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے تھا کہ وہ نہ صرف انھیں بلکہ ان سے نسبت رکھنے والوں کو بھی عزیز رکھتے تھے، انھیں مثل فرزند کے اور ان کے فرزندان واخلاف کو مثل احفاد واسباط کے دیکھتے اور خیال فرماتے تھے، مرکز نظام الدین دہلی میں انھیں اپنا نمائندہ اور نائب خیال کرتے اور باعث تقویت وتسکین الفاظ کہتے اور حوصلہ دلاتے اور ان سے اپنی چاہت کا اظہار بھی فرماتے۔'' (نقوش طیبات مولانا غزالی نمبر: ۲۱۵)

نقوش طیبات کا خصوصی نمبر مولانا عبدالباری صاحب فکردے ندوی کی وفات پر نکلا تھا، اس میں مرحوم نے مولانا مرحوم سے اپنے تعلقات اور ملاقات کا اور ان سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے، مولانا مرحوم کی کتاب سے اور اس خصوصی نمبر سے ایک ایک اقتباس یہاں نقل کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) مولانا محمود صاحب نے ان کی وفات پر ''تذکرہ مولانا عبدالباری ندوی بھٹکلی'' کے نام سے مستقل کتاب شائع کی، یہ کتاب دوسو صفحات پر مشتمل ہے، کتاب کی ابتدا میں تحریر کرتے ہیں:

''کوئی ادارہ قائم ہوتا ہے تو اس کے لیے کچھ آئیڈیل شخصیتیں ہوتی ہیں اور ادارہ کی

کامیابی اس صورت میں نظر آتی ہے، جب اس کے پروردہ لوگوں میں کوئی جامع صفات شخص سامنے آئے، ایمان و عمل، صلاح و اصلاح، دعوت و ارشاد، تعلیم و تربیت ان تمام کاموں کو بہتر طور پر انجام دینے کی حیثیت سے دیکھا جائے تو جامعہ اسلامیہ بھٹکل مولانا عبدالباری ندوی کو پیش کرسکتا ہے اور جامعہ اسلامیہ کا پیش کرنا دارالعلوم ندوۃ العلماء کا پیش کرنا ہے، وہ جامعی تھے اور ندوی بھی اور سب سے بڑھ کر وہ اپنے عمل و کردار سے محمدی تھے۔" (تذکرہ مولانا عبدالباری: ۲۵)

(۲) "مولانا مرحوم نے اجتماعی و سماجی زندگی اختیار کی، استاد ہونے کی حیثیت سے طلبہ و اساتذہ سے اور پھر مہتمم ہو جانے سے طلبہ اساتذہ اور دیگر کارکنان ادارہ سے ذمہ دارانہ تعلق اور ان کے ساتھ نشست و برخواست، جامع مسجد کے امام وخطیب کی حیثیت سے عوامی زندگی سے ربط بڑھا اور لوگوں کے مسائل و حالات کو سننے اور ان کا حل پیش کرنے کا زیادہ موقع ملا، جب بھی کوئی طالب و سائل آتا تو اپنی کسی مشغولیت کو اس کے لیے مانع نہیں بننے دیا، اس کے علاوہ مغرب سے عشاء کے درمیان کا وقت مسجد میں گذارتے کہ جس کو جو پوچھنا پاچھنا ہو وہ بہ آسانی اور بے تکلف اپنی یہ ضرورت پوری کرلے۔ مسئلہ کا صحیح حل پیش کرنے اور نرمی سے پیش آنے سے ان کا دائرہ محبت وعقیدت بڑھتا گیا اور ان کا یہ خیر ان مقامی افراد کے ذریعہ دوسرے ممالک میں رہنے والوں میں بھی متعدی ہونے لگا تھا جہاں بسنے والے ان کے جمعہ کے خطبات و مواعظ سے جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے مستفید ہوتے تھے، اپنے خطبات میں بہت اونچی باتیں کرنے کے بجائے عام زندگی سے متعلق ایسی مؤثر گفتگو کرتے جس سے وہ لوگوں کے دلوں کو موہ لیتے تھے، ان کے مواعظ وخطبات میں خواتین ومستورات

کے لیے بڑی رہنمائی کا سامان ہوتا تھا، ایک طرف وہ اچھی زندگی گزارنے کے لائحہ عمل دیتے، دوسری طرف اس مایوسی کو دور کرتے جو عموماً زندگی کے نشیب و فراز میں کبھی اپنی غلطیوں سے اور کبھی حالات کی ناسازگاری سے پیدا ہو جاتی ہے۔" (نقوش طیبات مولانا عبدالباری نمبر:۶۹)

مولانا محمود حسنی مرحوم کی عین خواہش تھی جس کا اظہار بھی فون پر راقم سے کیا تھا کہ معہد امام حسن البنا سے مولانا سید واضح رشید ندوی پر ایک خصوصی نمبر نکلے، وہ چاہتے تھے اور کہتے تھے کہ جس شان کے ساتھ معہد سے نمبرات نکلے ہیں اس طرح کا ایک نمبر حضرت مولانا واضح پر بھی نکلے، لیکن بات آئی گئی ہوگئی، کام آگے بڑھ نہ سکا، جس کا ہمیں افسوس بھی ہے قلق بھی۔

مولانا واضح صاحب محمود صاحب کی بڑی تعریف کرتے تھے، کہتے تھے کہ محمود صاحب کو اپنے آباء و اجداد کی تاریخ پر اچھی خاصی نظر ہے، ان کو تاریخ و سنین خوب یاد بھی رہتے ہیں۔

مولانا مرحوم نے ندوہ سے فراغت کے بعد اپنے آپ کو علم کے لیے فارغ کر دیا تھا، صبح و شام اپنے علم کو ترقی دینے اور اس میں کمال پیدا کرنے کی فکروں میں لگے رہتے، ابتداء میں مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی میں مدرس کی حیثیت سے خدمت انجام دی، چونکہ مولانا کو تصنیف و تالیف کا خاص ذوق تھا اس لیے دار عرفات رائے بریلی کے شعبۂ تحقیق و تصنیف سے منسلک ہو گئے، ندوہ سے نکلنے والے رسالہ "تعمیر حیات" کے نائب ایڈیٹر کی حیثیت سے سالوں کام کیا، اس میں برابر مضامین لکھتے رہے، اسی طرح "پیام عرفات" اور رسالہ "رضوان" میں ادارت کی حیثیت سے خدمات پیش کیں، مولانا مرحوم نے چونکہ سنجیدگی و متانت، وقار و شائستگی کا وافر حصہ پایا

تھا اور یہی چیز آدمی کو علم و عمل، تصنیف و تالیف، تحقیق و تفتیش کی بلندی تک پہنچا دیتی ہے، اس لیے اس ناحیہ سے بہت کام انجام دینے لگے، ان کے رواں قلم سے نکلے ہوئے تمام مضامین کو یکجا کرنے اور شائع کر کے عام کرنے کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے تاکہ آئندہ آنے والی نسل ان سے استفادہ کرے۔

مولانا مرحوم نے ایک درجن سے زائد کتابیں اپنے پیچھے یادگار چھوڑی ہیں اور مزید کتابیں اور تحقیقی مضامین ان کے اشہب قلم سے نکلتے، لیکن زندگی نے وفا نہیں کی، پتہ نہیں ان کے کیا کیا عزائم اور ارادے تھے اور کیا کچھ لکھنا چاہتے تھے، دنیا میں کہاں کس کی آرزو پوری ہوئی ہے، یہ آرزوؤں کے پوری ہونے کی جگہ نہیں ہے، دنیا میں آدمی مختصر وقت لے کر آتا ہے اور تقدیر نے جو کام اس کے ذمہ لکھ دیا ہے اس کو پورا کر کے وہ دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔

اس سال کے ماہ فروری کے ''تعمیر حیات'' میں آپ نے اداریہ تحریر فرمایا یعنی وفا سے ۵ / ۶ ماہ پہلے کا یہ اداریہ ہے، لکھتے ہیں:

''یہ وہ مہینہ ہے جو یاد دلاتا ہے طائف کے سفر کی...... جو واقعۂ معراج سے پہلے پیش آیا تھا...... اور جس کے غم و آلام اور مشقت و کدورت کی تلافی حق تعالیٰ نے اپنے محبوب کو اپنے پاس بلا کر کی۔ کس جذبہ و تعلق سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ سے طائف گئے تھے کہ ان کو حق کی راہ دکھائیں...... ہول ناک اندھیروں سے نکالیں اور دل کش و حسین روشنی میں لے آئیں...... دوزخ کی آگ اور اس کے عذاب سے بچائیں اور جنت کی لازوال اور پُر تعیش نعمتوں میں پہنچا دیں۔ راستہ کی کن مشکلات سے گذر کر وہاں پہنچا تھا...... جس میں تپتا ہوا صحرا بھی تھا...... لُو کے تھپیڑے بھی تھے...... پیروں کے نیچے دہکتے ہوئے سنگ ریزے تھے تو سر کے اوپر آگ اگلتا ہوا سورج تھا...... راستہ کی ناہمواریاں تھیں

اور بلندی کی جاں گسل مسافت تھی۔کیسی امیدوں کے ساتھ گئے تھے...... کیسے خوابوں کو آنکھوں میں سجائے ہوئے......کیسی آرزوؤں کو دل میں بسائے ہوئے کہ اہل مکہ نے ناسمجھی کا ثبوت دیا تو کیا ہوا، دُھتکار دیا تو کیا ہوا...... ظلم وعناد کی حد کر دی تو کیا ہوا...... حیوانیت پر اتر آئے تو کیا ہوا...... اہل طائف ضرور استقبال کریں گے...... محبت سے نوازیں گے...... استقبال کریں گے اور مہمان بنائیں گے، پھر ان کے ساتھ مل کر حق کی صدا بلند کی جائے گی...... اور حق پسندوں کی جماعت تیار کی جائے گی...... حق کا بول بالا ہوگا...... اور اہل حق پر ظلم وستم کا خاتمہ ہوگا، مگر وہاں کے شر پسندوں نے اوباش لڑکوں اور لوفروں کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف اُکسایا اور بھڑکایا، جس کے نتیجہ میں انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نشانہ پر لے لیا...... جسم اطہر بھی لہولہان...... قلب مبارک بھی ریزہ ریزہ...... ایسی ذہنی اذیت اور نفسیاتی چوٹ کہ الامان...... الحفیظ' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیفیت کی اگر سب سے اچھی اور سچی منظر کشی اگر کوئی فصاحت و بلاغت کے میدان کا شہسوار کر سکتا ہے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہیں جن کی یہ فصیح و بلیغ دعا اس کیفیت کی بھرپور غمازی کرتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے رب کریم کے حضور شکوہ کناں ہیں۔"

(تعمیر حیات: ۵/۶، ۱۰ر فروری ۲۰۲۲ء)

یہ ماہ رجب کا رسالہ تھا اور اسی ماہ رجب میں معراج ہوئی تھی، واقعہ معراج کو اور طائف میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو بیتی تھی اس کو کس قدر اچھے اسلوب میں مولانا مرحوم نے پیش کیا ہے، انداز تحریر سے اسلوب ماجدی کی یاد بھی تازہ ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے اور قوم وملت کو آپ کا نعم البدل نصیب کرے۔

ربنا تقبل منا انک أنت السمیع العلیم وتب علینا انک أنت التواب الرحیم، وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقه سیدنا محمد و آله و صحبه أجمعین!

زندگانی خوب تھی تیری مہتاب سے تابندہ تر

مولانا بدیع الزماں ندوی قاسمی
(چیئرمین انڈین کونسل آف فتویٰ اینڈ ریسرچ ٹرسٹ بنگلور)

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے حادثہ ارتحال نے دلوں پر بجلی گرادی، آج ہر جانے والا اپنے پیچھے ایسا مہیب خلا چھوڑ کر جارہا ہے جس کے پُر ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جن کی یادان لوگوں کے دل میں بھی ایک ہوک پیدا کردے جوان سے رشتہ داری کا رسمی رابطہ نہیں رکھتے۔ مولانا محمود مرحوم کی وفات یوں تو پوری ملت کے لیے ایک سانحہ ہے، لیکن احقر کے لیے یہ ایسا ہی ذاتی نقصان ہے جیسے مولانا مرحوم کے قریبی اعزہ کے لیے۔ اس لیے کہ مولانا مرحوم سے میرا ایسا گہرا اور مخلصانہ تعلق تھا کہ الفاظ کے ذریعہ اس کا بیان ممکن نہیں۔

مولانا مرحوم مفکر اسلام شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے نورِ نظر، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم وآل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مفکر ملت مرشد الامۃ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے قلب وجگر، حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے، سابق نائب ناظم ندوۃ العلماء

لکھنؤ حضرت مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے اور خانوادۂ حسنی کے چشم و چراغ، معروف صاحبِ قلم وقرطاس، ماہنامہ ''رضوان'' لکھنؤ کے معاون مدیر، دارِ عرفات رائے بریلی کے ترجمان ''پیام عرفات'' کی مجلس ادارت کے رکن خاص، مجلہ ''تعمیر حیات'' لکھنؤ کے نائب مدیر، حضرت مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ۲۸ / جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۲ / جولائی ۱۹۷۱ء کو سرزمین لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ایک مکتب میں حاصل کی۔ ابتدائی عربی درجات کی تعلیم مدرسہ ضیاء العلوم تکیہ کلاں رائے بریلی میں حاصل کی اور ثانویہ اور عالمیت کی تکمیل دار العلوم ندوۃ العلماء سے کی۔ حدیث شریف کا دو سالہ کورس ۱۴۱۲ھ / ۱۹۹۲ء میں کیا اور پھر ''المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی'' کا ایک سالہ کورس کر کے مدرسہ ضیاء العلوم سے تدریس کا آغاز کیا۔

حضرت مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد اہم کتابیں تالیف فرمائی ہیں، جن میں چند مشہور کتابیں یہ ہیں:

(۱) عائشہ بی

(۲) تذکرہ حضرت مولانا محمد زبیر الحسن کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

(۳) سیرت داعی اسلام حضرت مولانا سید عبد اللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

(۴) تذکرہ مولانا عبد الباری ندوی بھٹکلی رحمۃ اللہ علیہ

(۵) سوانح محی السنہ حضرت مولانا ابرار الحق حقی رحمۃ اللہ علیہ

(۶) تاریخ اصلاح وتربیت

(۷) تجدید معاشرت

آپ رحمۃ اللہ علیہ گزشتہ کئی مہینوں سے بیمار چل رہے تھے۔ ادھر آپ کے

متعلقین، اہل خانہ، آپ کے چاہنے والے، آپ کے اساتذہ اور آپ کے شاگرد برابر آپ کی صحت یابی کے لیے دعا کرتے رہے، لیکن اللہ کے یہاں فیصلہ ہو چکا تھا اور قضا کے فیصلے پر رضا ہی ہمارا ایمان ہے اور ۱۳؍محرم الحرام ۱۴۴۴ھ ۱۲؍اگست ۲۰۲۲ء بروز جمعہ آپ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ مولانا مرحوم نے اہلیہ کے علاوہ ایک صاحبزادی سوگوار چھوڑی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے، مولانا مرحوم کے اہل خانہ کے علاوہ یہ دار العلوم ندوۃ العلماء کا نا قابلِ تلافی نقصان ہے۔

کسے معلوم تھا کہ یہ ''شعلہ مستعجل'' جس کی ابھرتی ہوئی روشنی سے بہت کچھ توقعات وابستہ تھیں، اتنی جلدی نگاہوں سے روپوش ہو جائے گا۔

اللّٰھم أکرم نزله ووسع مدخله وأبدله دارا خیرا من داره وأھلا خیرا من أھله.

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں درجات عالیہ سے نوازے، ان کی دینی خدمات کو قبول فرمائے اور پسماندگان کو اس صدمہ کے سہنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

خوشبوان کی یادوں کی

مولانا رضوان احمد ندوی
(سب ایڈیٹر ہفتہ وار نقیب - پٹنہ)

۲۱/اگست ۲۰۲۲ء کی تاریخ تھی، جمعہ کا مبارک دن تھا، نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے قیام گاہ لوٹا، کھانے کے دستر خوان سجائے جا رہے تھے، ادھر میں اپنے موبائل کے واٹس ایپ پر مواصلاتی پیغامات پر نظر جمائے بیٹھا ہوا تھا، اچانک ایک غم ناک خبر پر نگاہ ٹھہر گئی: ''مولانا محمود حسن حسنی ندوی اللہ کے پیارے ہو گئے ہیں،'' اس کے معاً بعد دوسری خبر اس کی تردید کی بھی آ گئی، اسی ردوقدح میں تسلسل سے خبریں آتی رہیں، میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی، میں نے صحیح صورت حال تک پہنچنے کے لیے شاہد بھائی کو لکھنؤ فون کیا، انہوں نے غم ناک لہجہ میں اس سانحہ کی تصدیق کی اور یہی جواب دیا کہ ''ہاں بھائی! آج صبح ۹/بجے مولانا کا وصال ہو گیا ہے۔'' اب دل پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا اور زبان پر انا للہ وانا الیہ راجعون کا ورد جاری ہو گیا، یہ خبر غیر متوقع نہ تھی، مگر پھر بھی ایسا لگا جیسے افق سے ایک تاب ناک ستارہ ٹوٹا اور فضا میں ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ ع

آدمی نشہ غفلت میں بھلا دیتا ہے
ورنہ جو سانس ہے پیغام فنا دیتا ہے

اس سانحہ کے بعد مولانا کی شرافت وسنجیدگی، تواضع وانکساری، حلم وبردباری اور وضع داری کے نقوش ذہن ودماغ کے پردے پر ایک ایک کرکے ابھرنے لگے، عرصہ تین دہائیوں سے ان سے دوستانہ بلکہ بے تکلفانہ مراسم تھے، دہلی، لکھنؤ، پٹنہ اور نہ جانے کہاں کہاں ملاقاتیں ہوتی رہیں، سیمیناروں اور کانفرنسوں کے موقع پر دوستوں کی مجلسیں سجتیں، خوش گپیاں ہوتیں، مولانا سے علمی مذاکرے ہوتے، نئی مطبوعات پر تبصرے اور تجزیے ہوا کرتے پھر مجلس برخواست ہوجاتی، ابھی مارچ کے اواخر میں آخری ملاقات ہوئی، بورڈ کی مجلس عاملہ میں شرکت کے لئے لکھنؤ گیا ہوا تھا، معلوم ہوا کہ مولانا ان دنوں سخت علیل ہیں اور اپنی قیام گاہ خاتون منزل میں آرام فرما ہیں، ان کی عیادت ومزاج پرسی کے لیے قیام گاہ پر حاضر ہوا، ان سے دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، البتہ ان کے چہرہ وبشرہ سے نقاہت وضعف ظاہر ہورہا تھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کا ایک گردہ کام کرنا بند کردیا ہے، جس کی دوائیں مسلسل چل رہی ہیں، اس میں اتار چڑھاؤ ہے، میں انہیں وقفہ وقفہ سے تسلی کے کلمات کہتا رہا، مگر ان کی شکن آلود جبیں سے عیاں تھا کہ وہ اپنا وقت قریب دیکھ رہے ہیں، میں دعائیہ کلمات کے بعد اٹھ کھڑا ہوا کہ اب اجازت دیجیے، انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا کہ ٹھہریئے، آپ کو جانے کی ایسی کیا جلدی ہے، آپ کے آنے سے طبیعت میں نشاط پیدا ہوگیا۔ ع

چاہا بھی اگر ہم نے تیری بزم سے اٹھنا
محسوس ہوا پاؤں میں زنجیر پڑی ہے

بہرحال تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد لوٹ آیا، مگر میں بھی یہ محسوس کرتا رہا کہ یہ مسافر منزل سے بہت قریب ہوچکا ہے، آخر وہ وقت آہی گیا جس سے کسی کو مفر نہیں، اللہ کی مشیت میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، وہ حاکم بھی ہیں حکیم بھی، ان کا ہر فیصلہ

حکمت کے عین مطابق ہے، ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، لیکن ہم کوتاہ بینوں کے لیے تو بظاہر ایک عظیم نقصان ہے، ابھی ان سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں، مگر یہ ساری باتیں کوتاہ بینی کی ہیں، حکمت کا تقاضا یقیناً وہی تھا جو مشیت باری کے تحت عمل میں آیا، اللہ ان کی مغفرت فرمائے اوران کے درجات کو بلند کرے۔ ع

روئے گل سیر نہ دیدیم بہار آخر شد

محمود بھائی ۲۲؍جولائی ۱۹۷۱ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ان کے دادا سید محمد مسلم حسنی اور والد ماجد سید حسن حسنی بڑے صاحب تقویٰ لوگوں میں تھے، ان کی والدہ بھی خدا رسیدہ خاتون تھیں، اس طرح ان کا پورا گھرانہ علم وتہذیب کا گہوارہ تھا، اسی علمی ماحول میں ان کی تعلیم وتربیت ہوئی، انہوں نے ابتدائی عربی درجات کی تعلیم مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی میں حاصل کی، اس کے بعد ثانویہ اور عالمیت کی تکمیل دار العلوم ندوۃ العلماء سے کی، حدیث شریف کا دوسالہ کورس ۱۹۹۲ء میں کیا، پھر المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی کا یک سالہ کورس کیا، تعلیم مکمل کرنے کے بعد مدرسہ ضیاء العلوم سے تدریس کا آغاز کیا اور دار عرفات میں تصنیف وتحقیق سے وابستہ ہوگئے، ۲۰۰۱ء میں پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' لکھنؤ کی مجلس ادارت سنبھالی، ''پیام عرفات'' اور ماہنامہ ''رضوان'' کے بھی کالم نویس رہے، ابتدا ہی سے انہیں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کی توجہات اور دعائیں حاصل رہیں، ان بزرگوں کے سایہ شفقت اور رفاقت سے ان کے فکر وفن میں پختگی اور عمل وکردار میں نورانیت پیدا ہوئی، میں نے محسوس کیا کہ مولانا کے علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف پر ان کے اپنے خاندانی بزرگوں کا رنگ وہم ہنگ غالب تھا، محمود بھائی گرچہ مجھ سے عمر میں تقریباً پانچ سال چھوٹے تھے، تاہم فضل وکمال، ذہانت وفطانت اور مرتبہ ومقام میں مجھ سے بدرجہا فائق تھے، ان کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا

اور فکر ونظر میں بھی بڑی وسعت تھی، انہوں نے درجن بھر دینی وعلمی کتابیں تصنیف کیں، بنیادی طور پر سیرت نگاری میں انہیں کمال درجہ کا درک حاصل تھا، متعدد بزرگان دین اور اولیاء کرام کے شخصی احوال وکوائف پر گرانقدر کتابیں لکھیں، تاریخ اسلام کے مختلف ادوار کی مرکزی شخصیتوں پر ''تاریخ اصلاح وتربیت'' کے نام سے ایک جامع کتاب مرتب کی، اس کے علاوہ سوانح حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئی، عائشہ بی (ہمشیرہ مولانا علی میاں ندوی) تذکرۂ حضرت مولانا زبیر الحسن کاندھلوی، سیرت داعی اسلام حضرت مولانا عبداللہ حسنی ندوی اور سفرنامہ دیارحرم وغیرہ کتابوں نے بڑی مقبولیت وشہرت حاصل کی۔ ؏

وہ ادائے دلبری ہوکہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

اس ہمہ گیر قابلیت کے باوجود طبیعت میں بڑا انکسار تھا، جس کسی شخص سے کوئی تعلق قائم ہوگیا اسے آخر وقت تک نبھایا، انہوں نے نہ کبھی اپنی بڑائی جتائی اور نہ اپنے علم وفضل کا مظاہرہ کیا، میں نے ان کی زبان سے کبھی کسی پر طنز وتعریض نہیں سنی، ان کی زبان وقلم سے کسی شخص کو دکھ نہیں پہنچا، ان کے ملنے جلنے کا انداز بھی بڑا نرالا تھا، چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی، بڑی بشاشت اور خندہ پیشانی سے ملتے اور بغل گیر ہوجاتے، اس حقیر پر بے پناہ شفقتیں فرماتے تھے، مگر افسوس کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے، بس ان کی یادوں کی خوشبورہ گئی۔ ؏

ڈھونڈیں ہم اب نقوش سبک رفتگاں کہاں
اب گرد کارواں بھی نہیں کارواں کہاں

دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ قبر سے لے کر روز جزا تک ہر مرحلہ کو ان کے لیے آسان بنائے۔ ربنا تقبل منا انک أنت السمیع العلیم۔

مردقلندر

مولانا سعود الحسن ندوی
(مدرسہ دینیہ-غازی پور)

جناب مولانا محمود حسن حسنی رحمۃ اللہ علیہ علم و معرفت، ورع وتقویٰ میں ممتاز، خانوادۂ حسنی کے چشم و چراغ تھے۔قدرت نے جن کی رہبری کی، علم وعمل اور صلاح وتقویٰ میں معروف گھرانہ کا پاکیزہ ماحول ملا، خاندان کے بزرگوں کی سرپرستی حاصل ہوئی، جن سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ ان کا قلم سیال بنا، تو انھوں نے دل کی انگیٹھی بھی گرم کی اوراب روشن خاندانی روایات کے امین اور ممتاز فرد کی حیثیت سے ان کی شناخت قائم ہو رہی تھی اوروہ اس امانت کو اگلی نسلوں میں منتقل کررہے تھے۔خوش اخلاقی، تواضع اور منکسر المزاجی کا پیکر، اہل اللہ اور علماء کے قدرداں، دنیااوراس کے جھمیلوں سے بڑی حدتک بے نیاز، قلندرانہ صفت کے حامل تھے۔

تدریسی ذمہ داری کے ساتھ قلم بھی رواں دواں تھا، بالخصوص سوانحی اور تاریخی تصنیفات پر مشتمل گراں قدر سرمایہ ان کی یادگار ہے، یہ ان کے پسندیدہ موضوع بھی تھے۔ نیز اہل علم وتقویٰ سے والہانہ محبت، قلبی وابستگی اور تعلق کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے

اپنے دور کے نصف درجن سے زائد اہل اللہ اور بزرگوں کی سیرت سے زمانہ کو روشناس کرایا۔ ''پندرہ روزہ تعمیر حیات'' ''ماہنامہ پیام عرفات'' اور ''ماہنامہ رضوان'' کے ادارتی بورڈ سے وابستہ رہے۔ دیگر تصانیف بھی یادگار چھوڑیں۔ نیز ''تاریخ اصلاح وتربیت'' کی ترتیب کا بیڑہ اٹھایا، ابھی منصوبہ کا کچھ حصہ طبع اور کچھ حصہ کی تیاری کر سکے تھے کہ وہ راہی ملک عدم ہوئے۔ حافظہ قوی تھا، خصوصاً سنین کا بہت استحضار تھا۔ راقم نے سنین کے تعین کے بارے میں حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو فرماتے ہوئے سنا: ''اس سلسلہ میں مولوی محمود سے معلوم کرو وہ صحیح بتائیں گے۔'' ان سے بڑی امیدیں قائم ہو رہی تھیں۔ افسوس کہ اجل کے ہاتھوں نے ۱۳ر محرم الحرام ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۲ر اگست ۲۰۲۲ء بروز جمعہ انھیں ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

علالت کا سلسلہ عرصہ سے چل رہ تھا، علاج ومعالجہ کا سلسلہ بھی جاری تھا، بغرض علاج متعدد مقامات کا سفر بھی کیا، لیکن مرض شدت اختیار کرتا گیا اور بالآخر تمام تدابیر پر تقدیر غالب رہی، دوران مرض جب تک قوت بحال رہی علمی اشتغال قائم رہا، بلکہ شدت مرض میں بھی عیادت کے لیے آنے والوں میں اہل علم سے لکھنے پڑھنے سے متعلق ہی گفتگو ہوا کرتی۔ یقیناً ان کی وفات سے تصنیف وتالیف اور علمی دنیا کا بڑا خسارہ ہوا ہے۔

مولاناؒ نے عمر کم پائی، مگر کام اتنے کر گئے کہ عرصہ تک یاد رکھے جائیں گے۔ نیز وہ خوش قسمت رہے کہ انھیں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی بافیض صحبت حاصل ہوئی، مفکر اسلامؒ کے وصال کے بعد انھوں نے خود کو حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ اور حضرت مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی

رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے کر دیا، ان دو حضرات کے مشورہ و راہنمائی میں زندگی گزاردی، سفر وحضر میں ان کے رفیق رہے، علمی معاونت کی سعادت بھی حاصل کی۔خاندان کے ان دو بزرگوں کے علاوہ حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی بڑا اور سرپرست تسلیم کرتے رہے۔ان کی رائے کا احترام کرتے، اہم امور میں مشورہ لیتے، مولانا کسی طویل سفر پر جاتے تو مولانا محمود صاحب اسٹیشن پر موجود رہتے۔

۱۹۹۴ء میں راقم ندوہ میں نیچے درجے میں زیرِ تعلیم تھا، کمرے کے ایک ساتھی مولانا اطہر مئوی ثم بھٹکلی صاحب بھی تھے، یہ مولانا محمود صاحب کے ہم سبق اور بے تکلف دوست تھے، فضیلت سے فراغت کے بعد شعبہ حفظ قرآن مجید میں داخل ہوئے تھے۔انھوں نے کچھ ہی دنوں قبل منعقد ہونے والی مولانا محمود صاحب کی تقریب نکاح کا ذکر کیا جس میں وہ شریک تھے۔وہیں پہلی بار مولانا محمود صاحب کا غائبانہ تعارف ہوا۔کچھ ہی دنوں بعد مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا تقریباً دس افراد پر مشتمل ایک جماعت کے ساتھ جودھ پور (راجستھان) کا سفر ہوا، جس میں حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک سفر تھے، حسن اتفاق انہی کے حکم سے راقم کو بھی شرکت کا موقع میسر آیا، مولانا محمود صاحب بھی شریک سفر تھے، اسی سفر میں مولانا مرحوم سے تعارف حاصل ہوا۔بہت سے تاریخی مقامات کی سیر میں ہم کو بھی ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔رکھ رکھاؤ میں انتہائی سادگی، خورد نوازی، شرافت طبعی، مزاج کی بے تکلفی کا مشاہدہ ہوا اور دل متأثر ہوا، یہیں سے تعلق و محبت میں اضافہ ہوتا گیا۔

دوسرا طویل سفر ان کے ساتھ اس وقت ہوا جب حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی

ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد حضرت مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی صاحب کی معیت میں پیام انسانیت کا مہاراشٹر کے کئی شہروں کا دورہ ہوا تو اس میں مزید مولانا مرحوم سے قربت ہوئی۔اس سفر کے آغاز میں ہی مولانا مرحوم کی صلاحیتوں کا مشاہدہ ہوا۔ہوا یہ کہ اس وعدہ پر ہم سب اسٹیشن پہنچ گئے کہ ٹکٹ کنفرم ہو جائیں گے مگر عین وقت تک لوگوں کا وعدہ پورا نہ ہو سکا، یہاں تک کہ ٹرین آ گئی۔رات کے تقریباً گیارہ بج رہے تھے،اب فیصلہ کی گھڑی تھی، رات کا آرام قربان کیا جائے، بغیر سیٹ سفر کیا جائے یا سفر ملتوی ہو۔مولانا محمود صاحب نے جو خاموش تھے یہ کہہ کر گومگو کی کیفیت ختم کی کہ یہ دیکھئے ٹرین کھلنے والی ہے، پہلے بیٹھیے پھر کان پور تک کوئی فیصلہ ہو جائے گا ان شاء اللہ۔ہوا بھی ایسا ہی، سفر قسطوں میں تو ہوا،مگر بروقت ہم سب منزل تک پہنچ گئے ۔ورنہ کئی پروگرام متأثر ہوتے۔منتظمین پریشان ہوتے۔لیکن اصل چیز جو مولانا مرحوم کی مشاہدہ میں آئی،ان کا بروقت فیصلہ جس سے سفر ملتوی نہ ہوا اور طبیعت کی سادگی،قلندرانہ مزاج یوں دیکھنے میں آیا کہ اس وقت جب کہ سبھی کے ذہن پر سفر کی مشکلات سوار تھیں لیکن محمود صاحب بیٹھتے ہی دیوار سے سر ٹکا کر نیند کی آغوش میں جا چکے تھے۔

یہاں مدرسہ کے جلسوں یا رابطہ ادب اسلامی کے سیمیناروں میں شرکت کے لیے متعدد بار غازی پور تشریف لائے اور کئی اسفار کی روداد سفر بھی قلم بند کی ۔بہت سادہ مزاج پایا تھا،تکلف تو نام کو نہ تھا۔ایک واقعہ سنتے چلئے،ایک پروگرام میں شرکت کے لیے غازی پور آئے ۔ایک شب راقم نے دیکھا کہ وہ اپنی قیام گاہ کے علاوہ دوسری جگہ آرام کر رہے ہیں،تردد ہوا کہ جگہ کیوں تبدیل ہوئی،کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔صبح سبب دریافت کیا۔بہت پرسکون انداز میں مسکراتے ہوئے کہا،ارے آپ کو کیسے

معلوم ہوا؟ اور اس میں حرج ہی کیا ہے۔ کل وہاں تھا آج یہاں لیٹ گیا۔ مختصر جواب دے کر میری ہی خیریت دریافت کرنے لگے اور آپ بتایئے آپ تو ان دو دنوں میں بہت تھک گئے ہوں گے؟۔ یہ تھا ان کا اخلاق اور طبیعت کی سادگی۔ میں سوچنے لگا ایسے مواقع پر تو لوگ معمولی سی بات پر کتنے مسائل پیدا کر دیتے ہیں۔

ایک سفر عشرہ ذی الحجہ میں ہوا، اس عشرہ میں غالباً روزوں کا معمول تھا۔ رات ہوئی تو خاموشی سے ایک بچہ سے کہا کہ ممکن ہو تو سحری کا نظم کر دینا، گھر والوں نے سعادت سمجھا اور مختصر انتظام ہو گیا۔ مولانا اس قدر خوش ہوئے، یہ کہتے ہوئے بہت دعائیں دیں کہ جو کچھ اور جیسا مجھے پسند ہے وہ تم لوگوں نے حاضر کر دیا، حالانکہ یہ محض مولانا کی شرافت نفسی تھی، ورنہ ظاہر ہے کہ بعجلت کیا انتظام ہوا ہوگا۔

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ سے غازی پور کو جو نسبت حاصل ہے، جس کی بنا پر خانوادۂ حسنی کے اکابرین نے ہمیشہ اہالیان غازی پور پر توجہ و عنایت کی نظر فرمائی ہے، مولانا مرحوم بھی خیال رکھتے تھے اور بوقت ملاقات نیز تحریروں میں بھی اس تعلق کا اظہار کرتے تھے۔ استاذ گرامی قدر حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح ''سیرت داعی اسلام'' لکھی تو ایک نسخہ عنایت کرتے ہوئے کہا کہ ''آپ کی کاروان انسانیت (حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے دورہ پیام انسانیت کی روداد) کے اقتباسات اس کتاب میں میں نے شامل کیے ہیں۔'' ایک ملاقات میں حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی ''صادقین صادق پور'' جو نئی چھپ کر آئی تھی عنایت کی اور مسکراتے ہوئے کہا: ''یہ لیجیے والد صاحب کو دیجیے گا اور آپ غازیان غازی پور لکھیے۔''

تا دم تحریر ان کا ہر دم مسکراتا ہوا چہرہ نگاہوں کے سامنے ہے اور وہ آواز کانوں

میں گونج رہی ہے جب وہ بوقت ملاقات کہا کرتے ’’سعود بھائی! بہت دنوں بعد آئے؟‘‘ پھر ہاتھوں میں ہاتھ لے کر اپنائیت اور محبت کے ساتھ خیریت دریافت کرتے۔مشغولیت پوچھتے ،مشورے دیتے ،کام کے لیے مہمیز کرتے۔چند ماہ قبل دائرہ شاہ علم اللہ کی مسجد میں ملاقات ہوئی،ایک گوشہ میں بیٹھ کر دیر تک باتیں کیں۔اس وقت مرض کی شدت سے محفوظ تھے۔حضرت سید شاہ نفیس الحسینی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر نکل آیا،دیر تک ان کے متعلق باتیں کرتے رہے۔کیا پتہ تھا کہ ان کے ساتھ یہ آخری نشست اور آخری ملاقات ہے۔

راقم وہ لمحہ نہیں بھول سکتا جب استاذ محترم حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے جسد مبارک کو چاہنے والوں نے غم زدہ دل اور نم آنکھوں کے ساتھ سپرد خاک کیا،مجمع کم ہونے لگا اور مولانا محمود صاحب سے سامنا ہوا تو مولانا مرحوم بغل گیر ہو کر درد انگیز لہجہ میں استاذ محترم کی راقم پر نوازشوں کے حوالے سے یوں گویا ہوئے’’ آیئے سعود بھائی آپ کے محبوب چلے گئے،آپ بھی تو ان کے محبوب تھے‘‘ اللہ ! کیسے درد بھرے انداز میں انھوں نے یہ جملہ کہا تھا،ایسا محسوس ہوا گویا زمانہ بھر کا کرب اس جملہ میں سمٹ آیا ہو۔چند لمحوں تک دونوں بغل گیر رہے،کیونکہ دونوں ہی تسلی اور دلجوئی کے مستحق تھے اور دراصل انھوں نے مخاطب مجھے کیا لیکن حال اپنا بیان کیا۔کیونکہ استاذ محترم نور اللہ مرقدہ کے ساتھ ان کے تعلقات کچھ ایسے ہی تھے۔

کسی کا کوئی کام ہو،کوئی مسئلہ ہو،وہ بڑوں کے درمیان واسطہ بن جاتے۔اہل تعلق کے حافظہ میں ایسے بے شمار واقعات محفوظ ہوں گے۔راقم کے ساتھ بھی ایک واقعہ پیش آیا۔ایک صاحب کو حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں بھیجا۔انتظامی معاملات میں کچھ مسائل پیدا ہو گئے،جس کی تفصیل مولاناؒ تک

خلاف واقعہ پہنچی۔ کچھ عرصہ بعد راقم لکھنؤ گیا اور حسب معمول عصر بعد خاتون منزل حاضر ہوا، مولانا محمود صاحب سے ملاقات ہوئی تو علیک سلیک کے بعد جو کچھ انھوں نے کہا راقم نے جواباً صرف یہ عرض کیا کہ مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا۔ لیکن (اللہ مولانا کے درجات خوب بلند فرمائے) مولانا کہاں مطمئن ہونے والے تھے، جیسے ہی حضرت مولانا سید عبد اللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ملاقاتی کمرہ میں تشریف لائے، انھوں نے بلا تاخیر یہ کہہ کر گفتگو شروع کردی ''دیکھئے سعود بھائی کیا کہہ رہے ہیں'' اگرچہ راقم نے اس موضوع پر صفائی نہ پیش کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا، لیکن بالآخر صورت حال کی وضاحت کرنی پڑی۔ جسے سن کر استاذ محترم نے مولانا محمود صاحب سے فرمایا: ''اسی لیے کہا گیا ہے دوسرے فریق کی بات سنے بغیر کبھی یک طرفہ رائے نہیں قائم کرنی چاہیے۔''

مجلس کے اختتام پر نماز مغرب کے لیے مسجد جاتے ہوئے مولانا مرحوم اپنے مخصوص انداز میں مجھ سے کہنے لگے ''بہت اچھا ہوا، موقع نکل آیا، وضاحت ہوگئی، مجھے فکر تھی کہ آپ کی پوزیشن واضح ہونا ضروری ہے۔'' اس واقعہ سے مولانا مرحوم کا کوئی تعلق نہیں تھا، نہ انھیں کسی فکرمندی کی ضرورت تھی۔ لیکن دوسروں کے کام آجانے، دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کردینے کا انھوں نے ایسا مزاج پایا تھا جس نے انھیں اس معاملہ میں دلچسپی لینے پر مجبور کیا۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین!

دنیائے علم واخلاق کا ایک بڑا حادثہ

مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی
(استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

محمود حسنی: آہ! مولانا محمود حسنی چل بسے، سینکڑوں کو غم زدہ چھوڑ چل بسے! موتیں تو ہر وقت ہوتی ہیں، لیکن کسی کسی کی موت کی کسک انسان اپنے دل میں محسوس کرتا ہے اور موت کی کوئی خبر اس کو نڈھال اور بے حال کر دیتی ہے، کبھی اس کو لگتا ہے کہ کوئی فردخاندان اس سے جدا ہو گیا اور کبھی تو احساس ہوتا ہے کہ اس کا بازو کٹ گیا اور اس کی زندگی میں ایک خلا ہو گیا! برادرِ معظم مولانا محمود حسنی کی موت بلا مبالغہ ہمارے لیے یہی حیثیت رکھتی ہے۔

وہ ہمارے لیے ایک بڑے بھائی کی طرح تھے، اس لیے بھی کہ ان کے چھوٹے بھائی مولانا مفتی مسعود حسنی ہمارے رفیق درس تھے اور اس لیے بھی کہ جب سے ان سے تعارف ہوا، انہوں نے ایک بڑے بھائی کی محبت دی اور اسی خلوص کا ثبوت دیا۔ ۱۹۹۵ء کے اوائل میں ہم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ کے لیے لکھنؤ آئے۔ شناسائی تو اسی کے وقت سے ہے، لیکن قربت اس وقت ہوئی اور ان کو قریب

سے دیکھنے کا موقع اس وقت ملا جب اگلے سال رمضان کا مہینہ ہم نے تکیہ رائے بریلی میں حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گزارا، پھر حضرت مولانا علی میاںؒ کی زندگی میں مسلسل کئی رمضان اور ان کے بعد وقفے وقفے سے متعدد رمضان تکیہ کلاں میں گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی اور اس خاندان حسنی وحسینی سے ایسا گہرا رشتہ قائم ہوا اور ایسا تعلق محسوس ہوا گویا یہ ہمارا ہی خاندان ہے، خاندان کا ہر فرد، کیا بڑا، کیا چھوٹا، کیا جوان، کیا بچہ، سب نے محبت اور اپنائیت کا برتاؤ کیا، لیکن ان میں سب سے زیادہ پہلے دن سے جس نے سب سے زیادہ اپنائیت کا معاملہ کیا، وہ ہمارے مرحوم برادر معظم مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی کی ذات گرامی تھی، وہ ان کا بزرگوں کی باتیں کرنا، گھر لے جانا، کھانا کھلانا، بے تکلفی سے ملنا جلنا سب سے مختلف تھا، بقول دیگر: ان میں وہ تمام صفات تھے جن سے دوسرا بہت جلد ان سے مانوس ہوتا تھا۔

ان کے اندر متعدد خصوصیات تھیں، جو ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی تھیں:

ایک تو وہی محبت اور اپنائیت کا رویہ، ہر شخص جس کو محسوس کرتا اور جس کا اعتراف کرتا تھا۔

تصوف وسلوک سے ان کو طبعی مناسبت تھی، نظری بھی، عملی بھی۔ تصوف کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ''تاریخ اصلاح وتربیت'' کے نام سے وہ اس کی مفصل تاریخ مرتب کر رہے تھے، جس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان کے ذکر کا انداز بھی نرالا تھا، رمضان میں جب لوگ عصر کے بعد دائرۂ شاہ علم اللہ کی مسجد میں ذکر میں مشغول ہوتے، تو مولانا محمود کے ذکر کی آواز دور دور سے سنائی دیتی، وہ مخصوص لہجے میں ''لا الہ الا اللہ'' کا ورد کرتے جو کانوں کو بھلا لگتا۔ مجمع میں ذکر

جہری میں ریا کا بہت امکان ہوتا ہے، لیکن سب اس کو محسوس کرتے کہ مولانا محمود صاحب اس سے بہت دور تھے۔

وہ لوگوں کو بزرگوں سے جوڑنے کے بڑے خواہش مند تھے، اپنے کتنے دوستوں اور عزیز شاگردوں کو انھوں نے حضرت مولانا علی میاںؒ سے اور ان کے بعد ان کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب سے جوڑا، اسی طرح دوسرے بزرگوں کے پاس حاضر ہونے کی بھی وہ ترغیب دیتے تھے۔

ان کی سعادت مندی کی بات تھی کہ نوعمری سے وہ حضرت مولانا علی میاںؒ کی خصوصی توجہات سے محظوظ ہوتے رہے اور بہت جلد حضرت مولانا کا اعتماد حاصل کیا۔ حضرت مولانا سے اس قرب کی وجہ سے بہت سے موقعوں پر حضرت کی فرمائی ہوئی باتوں سے وہ تنہا واقف تھے اور ان میں سے اکثر باتیں وہ ڈائری میں نوٹ بھی کرتے تھے۔

تواضع ان میں طبعی تھی، گویا ان کے مزاج کا حصہ، وہ ان کی ہر حرکت سے ظاہر ہوتی تھی۔

ہمت افزائی بھی ان کی سرشت میں داخل تھی، کتنے خوردوں سے انھوں نے مضامین لکھوائے اور مسلسل ان کی تربیت اور ہمت افزائی کرتے رہے۔ ہمارے ساتھ ان کی ہمت افزائی کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ بڑے علماء اور بزرگوں سے ہمارا تعارف کرواتے، مفتی احمد خان پوری صاحب تشریف لائے تو ہم اپنے مزاج کے مطابق بھیڑ میں مصافحہ کرکے پیچھے آگئے، اتنے میں محمود صاحب ملے، کہا: ''آیئے ہمارے ساتھ آیئے، وہ آپ کی کتاب پڑھ چکے ہیں، آپ کو جانتے ہیں۔'' حضرت مولانا قمر الزماں صاحب الہ آبادی سے بھی اول اول ہمارے تعارف میں انھوں نے

یہی انداز اختیار کیا۔

کوئی حضرت مولانا سے خلوت میں ملنا چاہتا تو وہ اس کے لیے خود سعی کرتے اور موقع دلاتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ہم حضرت مولانا سے ملنا چاہتے، لیکن خلوت میں حرج کے اندیشے سے تکلف ہوتا، یا کبھی دو چار لوگ بیٹھے کوئی خصوصی بات کرتے محسوس ہوتے تو ہم رک جاتے، ایسے متعدد موقعوں پر باصرار محمود بھائی نے ہمیں اندر بھیجا کہ کوئی مسئلہ نہیں، آپ جائیے حضرت کو خوشی ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کو دنیا سے کوئی مطلب ہی نہیں تھا، اٹھائیس سالہ اس طویل مدت میں سینکڑوں دفعہ ان کے ساتھ بیٹھنا ہوا، طویل طویل گفتگو ہوئی، متعدد باتوں پر تبادلہ خیال ہوا، یاد نہیں کہ کبھی کسی دنیاوی معاملے سے متعلق انھوں نے بات کی ہو، یا اس سے کوئی دل چسپی لی ہو! ان کو فکر تھی تو دینی اور روحانی ترقی کی فکر تھی، اپنی اور احباب و رفقاء کی، ان کی زبان کھلتی تو دینی و علمی کسی باب ہی میں، ان کا قلم چلتا تو کسی ایسے ہی موضوع پر۔ ہمارے حاجی عبد الرزاق صاحب اسی لیے ان کو ''قلندر'' کہتے تھے اور یہ مسکرا دیتے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دین ان کی طبیعت اور علم و کتاب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

اے ہم نفسانِ محفلِ ما
رفتید، مگر نہ از دلِ ما

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کی چند نوازشات

مولانا عبدالسلام خطیب بھٹکلی ندوی
(استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی اپنی طالب علمی کے زمانہ سے مولانا مرحوم کی وفات حسرت آیات تک ایک اچھا خاصا عرصہ ۱۹۹۴ء کے اواخر سے مولانا کے انتقال تک گاہے بگاہے مختلف موقعوں پر متنوع عنوانات اور مختلف مجالس میں ملنے سننے اور ان سے استفادے کا موقع ملا۔

ویسے تو خانوادہ علم اللہی کے مشائخ وعلماء کرام اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اکثر اساتذہ وذمہ داران کی محبت وشفقت ہم لوگوں کو وراثتاً حاصل ہوتی تھی، ہمارے مادر علمی جامعہ اسلامیہ بھٹکل کے ابتدائی دور کے طلباء وفارغین جامعہ کا ان حضرات سے تعلق اور ان سے ادب واحترام کے ساتھ استفادہ کے جذبہ وکوشش کا اثر تھا کہ ان کے بعد آنے والوں کو اس کا فائدہ ملتا رہا۔

جامعہ اسلامیہ بھٹکل سے آنے والے طلبہ کی سب سے پہلی جماعت جو بھٹکل کے سابق قاضی جناب مولانا محمد اقبال صاحب ملا ندوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا غزالی

صاحب خطیب ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا صادق صاحب اکرمی ندوی مدظلہ العالی (تلامیذ وخلفاء مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی دامت برکاتہم) پر مشتمل تھی، وہ سابق نائب ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد حمزہ صاحب حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھیوں میں تھے، اسی طرح ہمارے مخدوم ومربی جناب مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اوران کے قریب العمر معاصرین کے ساتھ بھی بھٹکل کے طلباء کی ایک تعداد تھی، اس کے بعد ہمارے دیار کی ایک مقبول ومحبوب شخصیت ہمارے استادومربی سابق مہتمم جامعہ اسلامیہ بھٹکل وخطیب جامع مسجد مولانا عبدالباری صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہؒ مولانا سید جعفر مسعود صاحب حسنی ندوی زید مجدہ کے ساتھیوں میں تھے، اس طرح کا یہ سلسلہ چلتا رہا تو مولانا محمود صاحب کے درسی ساتھیوں میں بھی ہم سے تقریباً چار سال سینئر بھٹکلی طلباء کا ایک گروپ تھا جو مولانا مرحوم کے ساتھیوں میں بھی تھا اور مولانا سے بہت بے تکلف بھی!

یہی وجہ تھی کہ جب ہم لوگ ندوہ پہنچے تو مولانا کی محبت وشفقت ہم لوگوں کو بھی حاصل ہوئی اور مولانا نے اپنے ان سب تعلقات کے پیش نظر ہم نو وارد طلبہ سے تعلق اوران کی رہنمائی ایک طرح سے اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھی۔

مولانا سے جب بھی ملاقات ہوتی، ندوہ سے اور یہاں کے بزرگوں سے استفادہ کی ترغیب دیتے، ہم لوگوں کے مزاج اور خود سے آگے بڑھ کر ملاقات کرنے میں تکلف کی کیفیت دیکھ کر بذاتِ خود اپنے بزرگوں کے پاس لے جاتے، تعارف کراتے، ہم لوگوں کی طرف سے خود ہی نصیحت ودعاؤں کی درخواست کرتے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں لے گئے، حضرت کے پاس بٹھایا، آپ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں بیٹھنے کی ترغیب دی، استفادہ

اوران سے فیض حاصل کرنے کے آداب بتائے۔

یہ تو مولانا محمود صاحب کا خاص موضوع تھا کہ بزرگوں سے کسب فیض کیسے کیا جائے؟ مجھے تو مولانا سے اس موضوع پر سننا بہت اچھا لگتا اوراس سے دل میں بڑوں کے ادب واحترام اوران سے استفادہ کا جذبہ پیدا ہوتا، جب بھی میرا ندوہ کے علیا ثانیہ کے طلباء کے ساتھ تکیہ کلاں رائے بریلی ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی دامت برکاتہم سے استفادہ اورآپ کے محاضرات سننے کی نیت سے جانا ہوتا تو اس موقع پر ایک دو محاضرات یا طلبہ علیا ثانیہ سے گفتگو طلبہ کے اصرار ومطالبہ پر مولانا مرحوم کی ہوتی ،تو آپ ایک محاضرہ میں تو عام طور پر تکیہ اور وہاں کے علماء ومشائخ کی تاریخ بتاتے ،جس کے آپ متخصص تھے اور آپ کے خاندان کے بزرگوں کو بھی آپ کے اس اختصاص کا اعتراف تھا، دوسرے عنوان کے تعلق سے مولانا سے میری درخواست یہی رہتی کہ مولانا آپ بزرگوں سے کیسے استفادہ کیا جائے اس کے آداب بتائیے۔

اس عنوان پر مولانا کا مطالعہ تھا اور عملی مشق بھی اوراپنے بڑوں کو دیکھنا اوران سے سننے کا تجربہ بھی! مولانا اس موضوع پر مثبت ومنفی دونوں انداز سے بات کرتے اورآپ کو دونوں طرح کے واقعات وحالات کا علم تھا کہ ادب واحترام کرنے والوں نے کیا پایا، کیسی ترقی کی، کتنا زبردست کام کیا اور بے ادبی کرنے والوں اور اپنے بڑوں کی ناقدری کرنے والوں کا کیا انجام ہوا اور کیسے آگے بڑھتے بڑھتے اچانک راستے سے غائب ہوگئے۔

مولانا مرحوم کا ایک خاص وصف اپنے چھوٹوں کی ہمت افزائی کا بھی تھا، آپ اپنی علمی وتحقیقی تصنیفات میں ان کو ساتھ رکھتے، ان سے پروف ریڈنگ یا اس طرح

کے کچھ آسان سے کام لیتے، جس سے ان طلبہ میں لکھنے پڑھنے اور کچھ کام کرنے کا سلیقہ آجاتا اور آپ اپنے پیش لفظ میں اچھے الفاظ میں ان کا تذکرہ کر کے ان کی ہمت افزائی کرتے، اپنی علمی کتابوں میں اپنے خوردوں کے اقتباسات شامل کر کے ان کی ہمت بندھاتے، ان کو لکھنے پر آمادہ کرتے اور اچھے الفاظ میں ان کے مضامین کی تعریف کرتے۔

مولانا مرحوم کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں میں کئی شخصیات ایسی ہیں جن کو قریب سے دیکھنے اور ان سے استفادہ کا ہم طلبہ کو بھی موقع ملا اور مولانا نے اپنی تصنیفات سے ہم لوگوں کو بھی نوازا، لیکن مولانا کی کتاب پڑھنے پر یہ احساس پیدا ہوتا کہ ہم نے تو ان بزرگوں سے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھایا، بلکہ ان بزرگوں کو صحیح طور پر سمجھ بھی نہ سکے، اوفوہ! فلاں بزرگ میں یہ صفات تھیں اور فلاں کی یہ خصوصیات تھیں! ہم تو بس دور ہی دور سے تکتے رہے اور خوش ہوتے رہے کہ الحمدللہ خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں، کاش! مولانا یہ کتاب ان کی زندگی ہی میں لکھتے تو ہم لوگ ذرا اچھے انداز سے استفادہ کی کوشش کرتے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحب جونپوری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبدالباری صاحب بھٹکلی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا زبیرالحسن صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ، کتنی شخصیات ایسی ہیں جن سے بار بار ملاقات کا موقع ملا، ان حضرات کی مجالس اور بعض کے دروس میں بھی شرکت کا موقع ملا اور ان میں سے بعض حضرات سے تعلق اور ان بزرگوں کی اس عاجز پر شفقت و محبت پر خود مولانا محمود صاحب نے میری ہمت افزائی کی اور اس تعلق و استفادہ کے سلسلہ کو میرے لیے بہت مفید قرار دیا، لیکن انہی شخصیات پر ان کے انتقال کے بعد

مولانا مرحوم کے قلم سے جوان کی خصوصیات وصفات سامنے آتیں تو ایسا لگتا کہ ہم تو بس دریا کے کنارے کنارے ہی رہے۔

بہر حال مولانا نے اپنی مختصر سی زندگی میں تصنیفی وتالیفی اور تدریسی خدمات کے ساتھ جو اپنے معاصرین وخوردوں کی ہمت افزائی کی اور ان کو بڑوں سے جوڑنے اور ان کی علمی واصلاحی رہنمائی کا جو کام انجام دیا ہے، وہ بہت بڑی اور بہت اہم خدمت ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو ان خدمات کا اجر عظیم عطا فرمائے اور آپ نے ہم خوردوں کی جو رہنمائی کی ہے اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین!

ایک چراغ اور بجھا

مولانا محمد نصر اللہ ندوی
(استاد دار العلوم ندوۃ العلماء-لکھنؤ)

خانوادۂ حسنی کے گوہر علم وادب مولانا محمود حسنی صاحب ندوی آخر کار اس دار فانی سے کوچ کر گئے، وہ ایک عرصہ سے علیل تھے، آزمائشوں سے گزر رہے تھے، موت وحیات کی کشمکش میں تھے، کافی علاج ومعالجہ کیا گیا، لیکن تقدیر تدبیر پر غالب آ کر رہی اور وہ اپنے چاہنے والوں کو چھوڑ کر آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

یہ دنیا فانی ہے اور جان سب کی جانی ہے، تاہم مولانا محمود حسنی کی ناگہانی موت کا صدمہ گہرا ہے، وہ خانوادۂ حسنی کے چشم و چراغ تھے، علم وادب کے گوہر آبدار تھے، قلم وقرطاس کے شہ سوار تھے، لکھنا پڑھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا، حافظہ قوی تھا اور مطالعہ بہت مستحضر تھا، چلتے پھرتے مضامین تحریر کرتے اور طالبان علم کی رہنمائی کرتے، ان کے قلم گہر بار سے کئی وقیع کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں، تصوف وتاریخ ان کے پسندیدہ موضوعات تھے، سیرت نگاری میں باکمال تھے، بزرگوں سے انہیں

عشق تھا، ان کی سوانح نگاری کو اپنے لیے سرمایہ سعادت سمجھتے تھے، انھوں نے متعدد بزرگوں کی سیرت لکھی اور اتنے کم وقت میں لکھی کہ یقین کرنا مشکل ہے، خانوادۂ علم اللہ کے بزرگوں کی تاریخ کے گویا حافظ تھے، ندوۃ العلماء کے ترجمان ''تعمیر حیات'' کے نائب مدیر تھے، نئی کتابوں پر خوب تبصرہ کرتے، جب تک صحت قائم رہی، علم وفن کے گیسو سنوارتے رہے اور جب بستر مرض پر دراز ہو گئے، تب بھی علمی افادات کا سلسلہ جاری رہا، علم وتحقیق سے ان کی دلچسپی اسلاف کی یاد تازہ کرتی تھی، وہ حقیقی معنی میں طالب علم تھے اور آخر دم تک علم سے وابستہ رہے، ان کی زندگی آج کے طلبہ اور علماء کے لیے ایک نمونہ ہے، وہ راہ علم کے ایسے مسافر تھے جو تکان اور آرام سے نا آشنا تھا اور ہر وقت ''ھل من مزید'' کی صدا لگانے والا تھا۔

مولانا محمود حسنی علم وعمل کے جامع تھے، شریعت وطریقت کے حامل تھے، احسان وتزکیہ کی وادیوں کی سیر کرنے والے تھے، ذکر وتسبیح کے رسیا تھے، تصوف کے دلداہ تھے، بزرگان دین کے شیدائی تھے، مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ کے دست گرفتہ اور ان کے صحبت یافتہ تھے، فکر بوالحسن کے امین تھے، مخدوم گرامی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے علمی معاون اور سفر وحضر میں ان کے رفیق تھے، ان کی ذات میں فنائیت تھی، تواضع اور کسر نفسی میں بے مثال تھے، اخلاق میں نرمی تھی، چھوٹوں پر حد درجہ شفقت فرماتے تھے، ان سے مل کر دل ودماغ کو ایک ایسا سکون ملتا کہ لفظوں میں بیاں نہیں کیا جا سکتا، خلوص وللّٰہیت کے پیکر تھے، سادگی کی اعلی مثال تھے، جب بھی ملتے نہایت اپنائیت کا احساس ہوتا، آخری بار چنڈی گڑھ جانے سے پہلے خاتون منزل میں ملاقات ہوئی، بے حد محبت سے ملے، جسم میں شدید نقاہت تھی، اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا، لیکن اس کے باوجود احوال دریافت کیے اور پوچھا کہ آج کل کیا

علمی مشغلہ ہے؟ چنڈی گڑھ سے جب واپس آئے تو معلوم ہوا کہ ڈائلائسس پر ہیں، عیادت کے لیے حاضر ہوا، آئی سی یو میں ایڈمٹ تھے، غنودگی کے عالم میں تھے، میں نے آواز دی تو آنکھ کھول کر دیکھا اور کہا کہ دعا کیجیے، پھر آنکھیں بند ہوگئیں، یہ آخری ملاقات تھی، آج ان کے انتقال کی خبر سن کر دل بھر آیا، ایسے لوگ اس دنیا میں اب خال خال پائے جاتے ہیں، رب کریم ان کی قبر پر رحمتوں کی بارش نازل کرے اور اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت کرے۔

علم وتحقیق کا ماہتاب

ڈاکٹر عبید الرحمن ندوی
(استاد دار العلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

حالی مرحوم نے سرسید کی وفات پر زار وقطار روتے ہوئے کہا تھا:

''سرسید کیا گئے، ایک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ، ایک نادار ملک کا گنج بے بہا اور میرا مرشد، رہبر اور دوست جاتا رہا۔''

آج مولانا محمود حسن ندوی پر یہ جملہ بالکل صادق آتا ہے۔ مولانا کی شخصیت پر بہت سے لوگوں نے بہت کچھ لکھا اور لکھ رہے ہیں اور آئندہ بھی لکھیں گے انشاء اللہ! یقیناً مولانا کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جو بہت کم وقت میں بہت کچھ کر گئے۔ یوں تو راقم کا تعلق مولانا مرحوم سے بہت دنوں سے تھا لیکن جب سے مولانا کا گھنٹہ شعبۂ صحافت ولسانیات دار العلوم ندوۃ العلماء میں لگا تو ہفتہ میں دو دن تو ملاقات ہونی لازمی تھی۔ مولانا صحافت کے طلباء کو ''اردو مضمون نگاری'' پڑھاتے تھے۔ مولانا کا اسلوب تدریس منفرد تھا۔ طلباء کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ طلباء کی بھر پور تربیت بھی کرتے تھے۔ گاہے بہ گاہے باہر سے آنے والے اسکالرس کو بھی لاتے تھے اور شعبۂ

صحافت ولسانیات میں محاضرہ بھی دلواتے تھے۔ راقم کا شعبۂ صحافت ولسانیات کا انچارج ہونے کی وجہ سے مولانا مرحوم سے برابر رابطہ رہا اور استفادہ کا موقع بھی ملتا رہا۔ مولانا ایک صاحب قلم آدمی تھے۔ پچھلی ایک دہائی سے مولانا کے قلم کی روانی اشاعت اسلام اور اس کی محافظت اور دفاع میں تیغ رانی کا کام دیتی رہی اور ہر سال اپنی تحقیقات علمیہ کے بلند نمونے پیش کرتے رہے۔ مولانا کے اندر خاص بات یہ تھی کہ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی طرح کوزہ کے چند قطروں کو اپنے سیال قلم سے سیلاب بنادیتے تھے، گویا مولانا مرحوم اطناب کے بادشاہ تھے۔

موصوف حقیقت میں اسلامی صوفی تھے۔ وہ بہت ہی شریف النفس، اچھے اور اعلیٰ اخلاق کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، یہاں تک کہ مولانا جہاں بھی رہتے وہاں کے حالات سے بخوبی واقف ہوتے تھے اور ان کی بے لوث خدمات کی وجہ سے وہاں کے ذمہ داران ان پر مکمل بھروسہ کرتے تھے۔ یقیناً مولانا مرحوم (ولایخافون لومۃ لائم) کی زندہ مثال تھے۔ وہ بے پیر نہیں تھے، وہ حضرت شیخ سید شاہ نفیس الحسینی سے بیعت تھے۔ اس کے علاوہ ندوۃ العلماء کی چار بڑی شخصیتوں کے سایہ میں زندگی گزاری تھی، جیسے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سید واضح رشید ندویؒ اور مولانا سید حمزہ حسنی ندویؒ۔ ان کے علاوہ عالم اسلام کی بڑی بڑی شخصیتیں جیسے علامہ ڈاکٹر یوسف قرضاوی، علامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، شیخ محمد عوامہ، اس کے علاوہ متعدد ائمہ حرمین شریفین سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا۔

مولانا مرحوم کی تاریخ پر گہری نظر تھی۔ وہ تاریخ کو انسانیت کے عروج وزوال کا ایک جیتی جاگتی تصویر تصور کرتے تھے، کیونکہ اس کے ذریعہ موجودہ زندگی کی خامیوں کو دور کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

مولانا کی زندگی کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ انہوں نے ہر لمحہ کی قدر کی۔ راقم جب بھی ملاقات کے لیے ان کے پاس جاتا تو انہیں مشغول ہی پاتا، وہ وقت کے بہت ہی پابند تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قلیل عرصہ میں انھوں نے بہت کام کیا۔ موصوف نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں: (۱) حیات شاہ ابرار الحق، (۲) تذکرہ مولانا محمد یونس جونپوری، (۳) تاریخ اصلاح وتربیت، (۴) فرشتہ صفت انسان: سوانح فلسفی اسلام مولانا عبدالباری ندوی، (۵) تذکرہ مولانا زبیر الحسن کاندھلوی، (۶) سوانح مولانا عبداللہ حسنی ندوی، (۷) تذکرہ مولانا عبدالباری بھٹکلی ندوی، (۸) عائشہ بی، (۹) میزاب رحمت (مجموعہ کلام مولانا ثانی حسنی)، (۱۰) ہدیۂ درود وسلام۔

بلاشبہ مولانا کی پوری زندگی علمی کارناموں سے معمور رہی۔ مولانا مرحوم حجابات علم کے شکار کبھی بھی نہیں ہوئے۔ بقول امین احسن اصلاحی:

’’حجابات علم چار ہیں: (۱) حب عاجلہ: حقیقی علم سے محروم رکھنے والے حجابات میں سے سب سے بڑا حجاب حب عاجلہ کا حجاب ہے۔ حب عاجلہ کا مطلب ہے آخرت کی زندگی اور اس کی نعمتوں کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی اور اس کی لذتوں اور راحتوں کو ترجیح دینا، قرآن مجید میں ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے: "إن هؤلاء يحبون العاجلة ويذرون وراءهم يوما ثقيلا" (الانسان: ۲۷) (یہ لوگ عاجلہ کو پسند کرتے ہیں اور اپنے آگے ایک بھاری دن کو نظر انداز کر رہے ہیں۔)

(۲) تکبر: علم ومعرفت کی راہ میں دوسرا بڑا حجاب تکبر ہے، تکبر کی تعریف خود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک سوال کے جواب میں نہایت واضح طور پر فرمادی ہے، عبداللہ

بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جس کے دل کے اندر ذرا بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں داخل ہوگا۔“ ایک شخص نے سوال کیا کہ آدمی اس بات کو بھی پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو تو کیا یہ بھی تکبر ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ خود صاحب جمال ہے اور جمال کو پسند بھی کرتا ہے، تکبر یہ ہے کہ آدمی حق کا انکار کرے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔“

(۳) عصبیت جاہلیت: معرفت حق کے حجابات میں سے ایک حجاب عصبیت جاہلیت بھی ہے۔ عصبیت جاہلیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص قدیم روایات و مالوفات، قدیم رسم و رواج اور باپ دادا کے طریقہ کے تعصب میں گرفتار ہو جائے کہ نہ ان میں کوئی تنقید برداشت کرنے کے لیے تیار ہو اور نہ ان کی جگہ کوئی اور چیز قبول کرنے پر آمادہ ہو۔ باپ دادا کے طریقہ اور قدیم روایات سے محبت بذات خود بری چیز نہیں ہے، بلکہ بعض اعتبار سے نہایت اچھی اور نہایت ضروری چیز ہے، لیکن ان روایات کو تنقید سے بالاتر سمجھ لینا اور ان کی جگہ ان سے بہتر چیز قبول نہ کرنا جاہلی عصبیت ہے، جو علم معرفت اور حق کے راستہ میں ہمیشہ رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔

(۴) غفلت یا لا ابالی پن: علم کے لیے ایک بڑا حجاب غفلت اور لا ابالی پن بھی ہے۔ غفلت اور لا ابالی پن کا مطلب یہ ہے کہ آدمی زندگی کے کسی پہلو پر کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہ کرے، بلکہ اس کو کسی نہ کسی طرح صرف گزار دینے پر قانع ہو جائے۔“

مولانا مرحوم ایک کہنہ مشق صحافی تھے۔ صحافت کے میدان میں انھوں نے مولانا

سید واضح رشید ندوی سابق ایڈیٹر ''الرائد'' اور سابق معتمد تعلیمات ندوۃ العلماء سے بھر پور فائدہ اٹھایا اور اس فن کے شہسوار بن گئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا واضح رشید ندوی کے ساتھ جو بھی رہا صحافتی ذوق سے وہ محروم نہ رہا۔ تحدیث نعمت کے طور پر یہ ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ راقم بھی مولانا واضح رشید ندوی صاحب کے ساتھ تقریباً ۲۱ سال رہا اور فن صحافت سے متعلق بہت کچھ سیکھا۔ مولانا محمود حسنی ایک دہائی سے زیادہ ندوۃ العلماء کے اردو ترجمان پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' کے نائب مدیر رہے اور اپنے سیال قلم کی روانی دکھاتے رہے، اسی طرح ماہانہ ''رضوان'' لکھنؤ اور ''پیام عرفات'' رائے بریلی کی مجلس ادارات میں شامل رہے۔ مولانا کی شخصیت علامہ اقبالؒ کی زبان میں ''یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم'' کی آئینہ دار تھی۔ نامور شاعر وسیم بریلوی نے شاید مولانا جیسی ہمہ جہت شخصیت کے لیے ہی کہا ہے:

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

کلکتہ کا سفر:

۲۰۱۹ء میں راقم کا مولانا مرحوم کے ساتھ کلکتہ کا سفر ہوا، یہ سفر دراصل دکھن چوبیس پرگنہ مغربی بنگال میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شاخ ''جامعۃ القرآن والسنۃ'' کے سالانہ تقسیم انعامات کے پروگرام میں شرکت کے لیے ہوا تھا- واضح رہے کہ اس شاخ کا نام مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے ''جامعۃ القرآن والسنۃ'' رکھا تھا-، راقم لکھنؤ ائیر پورٹ پہنچا، وہاں مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری مرحوم اور مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی سے ملاقات ہوئی۔ ائیر پورٹ پر ہم لوگوں نے ایک ساتھ عصر کی نماز پڑھی، ان دونوں حضرات کو ممبئی جانا تھا

اوران دونوں حضرات کی فلائٹ ہم دونوں سے پہلے تھی۔ چنانچہ وہ دونوں حضرات پہلے چلے گئے اور ہم دونوں تقریباً دو گھنٹے کے بعد کلکتہ والی فلائٹ سے شہر کلکتہ پہنچے، وہاں مدرسہ کے ناظم تعلیمات مولانا مستفیض الحق ندوی اور مولانا محمد نور محمد ندوی پہلے ہی سے ایئر پورٹ پر ہم دونوں کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ خیر ہم لوگ مدرسہ پہنچ گئے، مستفیض بھائی نے شاندار مہمان نوازی کی جس کو ہم قرآن کی زبان میں "لا یبغون عنها حولا" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جمعرات کو ہم لوگ عشاء کے بعد مدرسہ پہنچے۔ کھانا کھانے کے بعد دیر رات سوئے۔ تقریباً ساڑھے تین بجے راقم کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ مولانا مرحوم تہجد کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ خیر تھوڑی دیر بعد راقم نے بھی تہجد کی نماز پڑھی۔ جمعہ کے دن پروگرام تھا، مولانا مرحوم کی تقریر ہوئی، راقم کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ مولانا مرحوم اس طرح کی رقت آمیز تقریر کرتے ہیں۔ اس کے بعد مولانا مرحوم نے جمعہ میں بھی زبردست تقریر کی اور خطبہ بھی دیا۔ جمعہ ہی کے دن کلکتہ سے واپسی تھی، فلائٹ پر بیٹھتے ہی مولانا مرحوم کہنے لگے:

"عبید صاحب! آج میں آپ کو چائے پلاؤں گا، لکھنؤ سے آتے وقت آپ نے پلائی تھی۔"

اس طرح ہنستے ہنساتے ہم لوگ لکھنؤ پہنچ گئے۔ اس مختصر سفر میں راقم کو مولانا مرحوم سے بہت سی چیزیں سیکھنے کو ملیں اور سب سے بڑھ کر اس سفر میں مولانا کے آئینۂ دل کا جوہر نظر آیا۔

علم وتحقیق کا یہ ماہتاب ۱۲/اگست ۲۰۲۲ء کو غروب ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

اللہ مولانا مرحوم کی تمام خطاؤں اور لغزشوں کو معاف فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!

درویش خدا مست

مولانا محمد سمعان خلیفہ ندوی
(استاد جامعہ اسلامیہ-بھٹکل)

رخصت ہوا دنیا سے وہ درویش خدا مست
وہ بندۂ حق بین وصفا کیش ووفا مست

وہ علم کا عاشق وہ کتابوں کا تھا رسیا
ساقی پہ فدا ساغر عرفان کا شیدا

اسلاف کی پاکیزہ روایات کا حامل
اربابِ عزیمت کے وہ عشاق میں شامل

وہ مردِ حق آگاہ سلف کی وہ نشانی
سرچشمہ باطن سے ابلتے تھے معانی

ایمان و یقیں صبر و عزیمت کا وہ راہی
وہ سید احمدؔ کا وفادار سپاہی

وہ قافلۂ شاہِ علَمؔ کا تھا مسافر
وہ صورتِ اربابِ وفا صابر و شاکر

انفاسِ علیؔ نے جسے بخشی تھی حرارت
ثانیؔ کے قلم کی جسے حاصل رہی قوت

وہ جس کے مقدر میں تھی رابعؔ کی رفاقت
واضحؔ سے ملی تھی جسے افکار کی ندرت

وہ ناشر حق واقف ِاسرار شریعت
ہر آن قلم اس کا رہا محو عبادت

شاداب رکھے رحمت حق تربت محمودؔ
سمعانؔ کے مقدر میں بھی ہو گوہر مقصود

میرے ہم دم و ہم راز

مولانا طارق شفیق ندوی
(جنرل سکریٹری آل انڈیا ملی کونسل مشرقی اتر پردیش)

تعمیر حیات کے سب ایڈیٹر، دار عرفات کے نائب مدیر، ایک اچھے سوانح نگار مولانا محمود حسن حسنی ندوی ایک طویل علالت کے بعد ۱۲ / اگست کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

مرحوم میرے ہم عمر، ہم درس، دم ساز و ہم راز تھے اور حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی اور ہمارے درمیان ربط و توافق کا ذریعہ تھے، مولانا محمود حسن حسنی ندوی خاکسار، ملنسار، تواضع پسند، سادہ اور شریف النفس انسان تھے، سادگی، قناعت پسندی اور علم دوستی انکی شناخت تھی، جب بھی ملتے پر جوش اور پر تپاک خیر مقدم کرتے، اپنی متعدد تصنیفات ہدیہ کیں، میرے علم کے مطابق ''اوراق زندگی'' بھی انھوں نے ہی ترتیب دی ہے۔

حضرت مولانا ولی رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے موقع پر ندوہ کا جو وفد مونگیر گیا تھا، وہ پہلے گورکھپور میں میرے گھر پر قیام پذیر ہوا تھا، اس میں مولانا محمود حسنی صاحب بھی شامل تھے اور پھر واپسی میں بھی ان کا ساتھ رہا، واپسی میں

انہوں نے میرے نانیہال، دادیہال اور سسرال کی سیر کی، بہت سی باتیں ہوئیں، پھر جب وہ گھر تشریف لائے تو کڈنی میں خرابی کی وجہ سے ان کے پیروں میں سوجن تھا، میں نے پانی گرم کیا اور اس میں نمک ڈال کر ان کے پیروں کی سکائی کرتا رہا، محمود حسنی روتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ طارق بھائی! آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں، میں نے ان سے کہا کہ کوئی شرمندگی کی بات نہیں، یہ خدمت جو میں انجام دے رہا ہوں ہو وہ خلوص دل سے انجام دے رہا ہوں، اس کے تین سبب ہیں: پہلا سبب تو یہ ہے کہ آپ آل رسول ہیں اور آل رسول کی خدمت ہر وقت اپنے لیے سعادت کی بات سمجھتا ہوں، دوسری بات یہ ہے کہ آپ میرے درس کے ساتھی ہیں اور آپ سے مجھے قلبی لگاؤ اور دلی محبت ہے، تیسری بات یہ کہ آپ جس علمی اور دینی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں بھارت کے لوگوں کو چاہیے کہ وہ آپ لوگوں کے پاؤں دھو کر پیئیں، تا کہ ان کے اندر بھی دینی شعور پیدا ہو۔ اس بات پر وہ بہت زیادہ رونے لگے، میں نے انہیں سمجھایا، دلاسہ دیا، تسلی دی، میری باتوں سے انہیں بہت سکون ملا اور وہ سو گئے، جب وہ جا رہے تھے تو انہوں نے کہا: طارق بھائی! اس سفر میں بہت سے حقائق سامنے آئے، لیکن ایک بات یہ بتا تا چلوں کہ بہت سی غلط فہمیاں جو لوگوں نے پیدا کر رکھی تھیں وہ یک لخت دور ہو گئیں، حقیقت جان کر خوشی ہوئی، اندازہ ہوا کہ لوگ کس طرح سازش کرتے ہیں، کس طرح کان بھرتے ہیں اور ہم فطری کمزوری کی وجہ سے اس کا شکار ہو جاتے ہیں، مجھے بھی اطمینان ہوا، اللہ انہیں جزائے خیر دے، میں جب بھی انہیں فون کرتا تو حوصلے سے بات کرتے اور حضرت مولانا رابع صاحب سے بھی بات کرواتے تھے، تکیہ میں ملاقات ہو یا ندوہ میں ملاقات ہو، ایسا لگتا کہ برسوں بعد ملاقات ہو رہی ہے، پر جوش انداز میں معانقہ کرتے اور ہاتھ پکڑے

پکڑے مہمان خانے لیے چلے جاتے، بغیر ماحضر پیش کیے انہیں اطمینان نہ ہوتا، اس دوران بھی وہ وقت ضائع نہ کرتے، علمی گفتگو فرماتے، ندوے کی بات کرتے، دین کی بات کرتے، انتہائی بااخلاق اور باکردار دوست تھے، شریف النفس تھے، ہر ایک کے لیے اچھا سوچتے، ندوے سے ان کو محبت تھی، اگر زندگی اور وفا کرتی تو وہ بڑا کام کرتے جو قابل رشک ہوتا۔ اللہ ان سے بڑا کام لے رہا تھا، سوانح نگاری میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا، محنت کرتے تھے، مطالعہ کرتے تھے، مجھے مواد اکٹھا کر کے لکھتے تھے، ایک خاص بات جو میں نے ان کے اندر دیکھی وہ یہ کہ ان کے اندر تلخیص کی بھی بڑی صلاحیت تھی، سفرنامہ لکھنے کی بھی بڑی اچھی قدرت رکھتے تھے، ندوے کے ممتاز طلباء میں تھے، اللہ زندگی دیتا اور کارنامے انجام دیتے جس پر دنیا رشک کرتی۔

پیکرِ اخلاص وعمل

مولانا سید ہاشم نظام الدین ندوی
(ڈائریکٹر مکتبۃ الشباب العلمیۃ۔لکھنؤ)

قدرت کا بھی عجیب کرشمہ ہے کہ جو کل تک اپنے پس ماندگان پر سوانح عمریاں مرتب کر رہے تھے، مرحومین پر تاثراتی مضامین لکھ رہے تھے، یادِ رفتگاں میں محو ہو کر انہیں خراج عقیدت پیش کر رہے تھے، دنیا سے جانے والوں کے حق میں جنت کی خوش خبریاں اور رحمت کی بشارتیں سنا رہے تھے اور ارحم الراحمین پروردگار کی ذاتِ کریمی پر ایمان ویقین رکھتے ہوئے انہیں مغفرت کے پروانے تقسیم کر رہے تھے، آج انہی کے لیے وہی سب مراسم ادا کیے جا رہے ہیں جو وہ دوسروں کے لیے کرتے تھے، انہی کے ذکر خیر میں وہ سب کچھ کیا جا رہا ہے جو وہ دوسروں کے سلسلہ میں کر کے ان کا مقام ومرتبہ لوگوں کو بتا کر ''اذکروا محاسن موتاکم'' کے نبوی حکم پر عمل کر رہے تھے۔

یعنی وہ ہمارے مخلص دوست جید عالم دین اور پیکرِ اخلاص وعمل مولانا محمود حسن حسنی ندوی ہیں، جن کے اس دنیائے فانی سے دارِ باقی کی طرف منتقل ہوئے ایک ماہ

سے زائد عرصہ ہو چکا ہے، مگر ان کی یادیں اور باتیں ان کے متعلقین و معتقدین، شاگردان و محبین کے قلم سے مضامین کی شکل میں نشر ہو رہی ہیں۔

رونق انجمن گل تھا جو لالہ، نہ رہا
ناز تھا جس پہ وہ سروقد بالا نہ رہا
رہ گیا کٹ کے کلیجہ وہ لگی چوٹ کہ ہائے!
دینے والا تھا جو ایسے میں سنبھالا نہ رہا

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہم سے ایک سال آگے تھے، البتہ اپنے ساتھیوں میں مولوی یحییٰ برماور ندوی، مولوی محمد سلیم سدی باپا ندوی اور مولوی سید یاسر برماور ندوی وغیرہ کے بعد سب سے زیادہ روابط ہم سے تھے، درجہ کے خارجی اوقات میں ملاقاتیں رہتیں اور اکثر آپ سے ملاقات کی جگہ مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ کی مجلسوں میں شرکت کے بعد مہمان خانہ ہی ہوتا، جہاں کچھ دیر تک بات کرتے رہتے اور مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات کرتے، یقیناً آپ جس کے دوست ہو گئے آخر تک دوست رہے، رفاقت اور صداقت کا حق ادا کر دیا جس کی پچاسوں مثالیں موجود ہیں۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کے تین سالہ قیام کے دوران میں مخدومی مولانا سید سلمان صاحب حسینی دامت برکاتہم کے گھر آنا جانا رہتا تھا، قبر ماموں بھانجہ مسجد کے ہفتہ واری درس قرآن میں پابندی سے شرکت کی کوشش رہتی تھی، درس کے بعد یا اس کے علاوہ ایام میں بھی مولانا کے پاس آنے جانے کا سلسلہ رہتا تھا، تو بھائی محمود حسن حسنی مرحوم کے علاوہ اس خانوادہ کے اکابرین سے بھی ملاقاتیں رہتیں، ''خاتون منزل'' کی اپنی ایک تاریخ ہے، جس پر مستقل تحریر کرنے سے کئی صفحات سیاہ ہو سکتے

ہیں، جن میں کئی ایک کرم فرماؤں اور بڑوں کے ساتھ سلام ودعا کا سلسلہ جاری رہتا، ان سے استفادہ کے مواقع ملتے اور روابط بڑھتے جاتے، جن میں بالخصوص حضرت مولانا عبداللہ حسنیؒ، مولانا جعفر مسعود ندوی، مولانا بلال عبدالحی حسنی، مولانا سید مسعود حسنی ندوی اور مرحوم مولانا محمود حسن حسنی وغیرہم شامل تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اور ان کے علاوہ ''خاتون منزل'' میں آنے جانے والے علماء اور اکابرین سے شعوری اور غیر شعوری طور پر بہت کچھ سیکھنے اور حاصل کرنے کے مواقع ملے ہیں، جس میں ہمارے ساتھ رفیقی مولوی نعمان اکرمی ندوی اور رفیقی مولوی عبیداللہ اسحاقی ندوی بھی شامل رہتے۔

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

آپ کے ہم سے مسلسل تعلقات کی ایک دوسری وجہ شعبۂ نشر و اشاعت سے متعلق تھی، الحمدللہ جب سے ''مكتبة الشباب العلمية'' کے اشاعتی کام میں عملاً شرکت ہوئی، اس دن سے آپ ہمارے مشیروں میں رہے، کئی کتابوں کو زیور طباعت سے آراستہ ہو کر نشر و اشاعت تک کے مراحل تک پہنچانے میں پورا پورا ساتھ رہا، بالخصوص تذکرہ مولانا عبد الباری، حضرت مولانا ابرار الحق حقی، یادوں کے چراغ، وقائع احمدی اور پرانے چراغ کی نئی اشاعت میں تیسری جلد میں نئے تراجم کو شامل کر کے اس کی تکمیل کا کام بھی آپ ہی کے قلمی تعاون سے ہوا تھا۔ مکتبہ سے شائع ہونے والی بعض کتابوں پر عرض ناشر بھی آپ ہی کے قلم سے تحریر ہے۔ آپ مکتبہ کے ذمہ دار مولانا ریان بھٹکلی ندوی کا وقتاً فوقتاً تعاون فرماتے، مشورہ لینے اور دینے اور کتابوں کی طباعت سے نشر و اشاعت تک آپ کا تعاون شامل رہتا تھا۔ حتی کہ کبھی کتابوں کے سرورق کی تیاری میں مشہور خطاط جناب حامد صاحب وغیرہ کے گھر جا کر جلدی کرنے

اور فوراً ہاتھوں ہاتھ لانے کا مرحلہ ہوتا تو بھی ساتھ چلنے میں تاخیر نہیں فرماتے تھے۔

لکھتے اچھا تھے، قلم سیال تھا، جذبات کی ترجمانی بڑی آسان اور سلیس زبان میں فرماتے، آپ بیتی اور جگ بیتی کو حسین پیرایہ میں پیش کرتے، جس پر ان کے قلم گہر بار سے تحریر کردہ دسیوں تصانیف اور پچاسوں مضامین شاہد ہیں، جو متعدد رسائل ومضامین اور علمی تصانیف کی شکل میں یادگار بن چکی ہیں، جس نے ان کی زندگی کو جاودانی بخشی ہے اور تحریروں کو مقبولیت عطا کی ہے۔ آپ جس طرح لکھتے تھے اسی طرح بولتے بھی تھے، بلکہ کبھی آپ کی تقریر تحریر سے زیادہ بہتر ہوتی، اسی طرح تزکیہ وسلوک کی مجلسوں یا مختصر باہمی گفتگو کی محفلوں میں آپ کے پند وموعظت کا جو رنگ ہوتا وہ کچھ جدا ہی رہتا۔ آپ کی زبان کے ساتھ چہرہ بھی پڑھنے کے قابل رہتا، دلی جذبات کی ترجمانی جہاں الفاظ کے پیراہن میں ادا ہوتی وہیں آپ کے چہرے سے بھی اظہار ہوتا تھا اور مسئلہ کی سنگینی اور حقیقت کا آپ کا چہرہ عکاس ہوتا تھا، جس سے دل سے نکلی ہوئی بات کو طاقتِ پرواز ملتی اور آپ کا مخاطب اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ پاتا جو بلاشبہ ایک کامیاب مقرر ہونے کی دلیل ہے۔

یہ آپ کا انداز گفتگو ایک طرف تھا، لیکن جب اپنے ساتھیوں اور ہم عصروں یا بے تکلف دوستوں سے ملتے تو دوستانہ گفتگو ہوتی جس کا لطف ہی الگ رہتا، خوشیوں سے پھولے نہیں سماتے، مسکراہٹوں کے ساتھ چاہتوں کے اظہار کا ایسا تسلسل رہتا جو دیکھنے یا برتنے ہی سے متعلق ہوتا، بالخصوص ہم جیسے پردیسی ساتھیوں سے ملاقات ہوتی جو گاہے بہ گاہے ہوتی تھی، سال دو سال یا تین سال میں ایک مرتبہ بالمشافہ رہتی تو اس وقت ان کا اسلوبِ تخاطب انتہائی الگ رہتا، کافی وقت تک مصافحہ کیا ہوا ہاتھ ملا ہی رہتا۔ جب کہ فون سے ملاقاتیں وقفہ بہ وقفہ ہوتی رہتیں تھیں۔

آپ کا اصل ذوق اور فطری شوق تربیت واصلاح اور تزکیہ وسلوک کی مجالس تھیں۔آپ کو تعلیم باطن کے لیے خاندانی بزرگوں کی صحبت روز اول سے ملی، پھر اس میں ترقی ہوتی گئی اور ہندوستان کے اکابرین سے بھی اصلاحی تعلق رہا، اہل علم اور اہل اللہ کی صحبتوں سے فیضیاب ہوئے۔

ذکر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی آپ کے سامنے آتا تو عشق نبی میں سرشار ہو جاتے، یہی وجہ ہے کہ آپ کو اہل بیت اوسادات سے بھی غیر معمولی تعلق اور اس نسبت کا بھی بے حد خیال ہوتا، جب کسی کے بارے میں پتہ چلتا کہ اس کا انتساب حضراتِ سادات سے ہے، تو نسب نامہ دریافت کرتے، حسنی ہے یا حسینی اس کی بھی تحقیق فرماتے، انہیں اس انتساب پر شکر خدا کی درخواست فرماتے، انہیں اہل بیت اطہار کے متعلق بتلاتے۔

علامہ حبیب البشر خیری رنگونی رحمۃ اللہ علیہ کے مجموعہ درود وسلام مع فضائل و اشعار کو نئی ترتیب اور بعض اہم اضافوں وافادات کے ساتھ زیورِ طباعت سے آراستہ فرمایا، جس پر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا عشق ومعرفت اور حب نبوی سے سرشار ہو کر تحریر کردہ گراں قدر مقدمہ بھی موجود ہے۔ گویا یہ مولانا محمود مرحوم کی زندگی کا آخری ہدیہ درود وسلام کی شکل میں امت اسلامیہ کے نام عظیم ترین تحفہ ہے، جو یقیناً ختامہ مسک کا درجہ رکھتا ہے۔

آپ کا مطمح نظر صرف اور صرف اپنے خالق و مالک کی رضا تھی، ہر کام میں رضائے رب تلاش فرماتے، اس بات پر عقیدہ بھی پختہ تھا کہ اخلاص اور للّٰہیت کے بنا ہر کام بے سود اور ہر عمل بے کار ہے۔ ہم ساتھیوں کو بھی باتوں باتوں میں اس بات کی طرف توجہ دلاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے اور بس، کسی کی واہ واہی اور تعریف

وستائش سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے، نہ ہی اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے ساتھ کسی کی مخالفت اور ناراضی سے کچھ بگڑنے والا، یہ زندگی ایک امانت ہے، اسے اسی خالق کی مرضیات پر چلانا اور احکامات کو بجالانا ہی اصل زندگی ہے۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے تھا

آپ کے سواوصاف کا ایک وصف یہ تھا کہ ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی سے ملتے، تبسم آمیز لب ولہجہ میں مخاطب ہوتے، سنجیدگی ومتانت اور ہمدردی کا اظہار فرماتے، کھل کر ملتے، دل وجان سے ملتے، تواضع وانکساری سے ملتے، نخوت اور خود بینی کا مفہوم ہی ان کے ذہن سے غائب تھا، پہلی ملاقات میں ہی بے تکلف ہوجاتے اور اسے اپنائیت دیتے، اسی لیے جو آپ سے ایک بار ملتا وہ بار بار ملاقات کا خواہش مند رہتا تھا۔ اخلاق اسلامی کا جو وصف تقریباً اس پورے خانوداہ کا بنیادی امتیاز ہے، گویا علم وعمل اور اخلاق وسلوک ان کی میراث ہے۔

ماضی قریب میں اس خانوادہ کے کئی افراد نے جو ملت اسلامیہ کا قیمتی سرمایہ تھے، ہم سے بچھڑ کر عین جوانی یا کہولت میں داعی اجل کو لبیک کہا، جن میں حضرت مولانا ثانی حسنیؒ، مولانا سید محمد حسنیؒ، مولانا سید عبداللہ حسنیؒ، مولانا حمزہ حسنیؒ وغیرہم تھے اور اب مولانا محمود حسنیؒ بھی اسی فہرست میں شامل ہیں، یہ وہ شخصیات تھیں جن سے ملت اسلامیہ ہندیہ کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔

کچھ دن ٹھہر سکے نہ جہانِ خراب میں
اکثر کو موت آ گئی عہدِ شباب میں

اے ہمارے مخلص دوست! آپ اپنے مولیٰ کے پاس چلے گئے، آپ کی

زندگی کے آخری ایام بیماری میں گزرے، جو بیماری انشاءاللہ آپ کے رفع درجات کا سبب بنے گی اور سیئات کو حسنات میں مبدل کرائے گی، آپ کا وقت موعود بھی اپنے مربی و محسن حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی طرح بروز جمعہ نماز جمعہ سے پہلے آیا، جس وقت میں موت آنے کی خوش نصیبی میں کسے شبہ ہوسکتا ہے، مگر آپ اپنے پیچھے کتنوں کو سوگوار اور غم گسار چھوڑ گئے، کتنوں کو آپ سے کیا کیا امیدیں تھیں، قوم نے آپ سے کیا کیا توقعات وابستہ کر رکھی تھیں اور کتنوں نے آپ سے مستفیض ہونے کے کیا کیا خواب دیکھے تھے جو بظاہر سب تشنہ تکمیل رہے۔ مگر اللہ ہی کی ذات وہ ہے جو قوم کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے گی، وہی اللہ مجروح دلوں پر مرہم رکھے گا، ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو ہمت دے گا، غم زدہ احباب کو تقویت عطا فرمائے گا۔ جی ہاں بھائی محمود! وہی اللہ جو پوری انسانیت کے لیے کافی ہے، وہی ہمارے لیے بھی کافی ہے، جسے بقا ہے، جس ذات کو دوام ہے اور باقی صرف اسی کا نام ہے۔

جاتے جاتے شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کی زبانی ہمارے دلوں کی ترجمانی میں سن لیں ؎

دل ہمارے یاد عہد رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہینوں کو امت بھولنے والی نہیں

میرے ایک مخلص دوست

مولانا عبید اللہ اسحاقی ندوی
(مکہ مکرمہ)

آج سے تقریباً تیس سال قبل جب میں ندوۃ العلماء میں فضیلت اول کا طالب علم تھا، مولانا محمود حسن حسنی رحمۃ اللہ علیہ سے متعارف ہوا، مولانا سید سلمان حسینی صاحب سے میرا ایسا تعلق تھا کہ میرا اکثر قیام ندوۃ العلماء کے ہاسٹل سے زیادہ خاتون منزل گولہ گنج میں ہوا کرتا تھا، میں ان کے گھر کے ایک فرد کی طرح تھا، اسی تعلق سے خاندان حسنی کا ہر فرد مجھ سے محبت کرتا تھا، جن میں مولانا عبد اللہ حسنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا حمزہ حسنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمود حسن حسنی کے والد جناب حسن حسنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ڈاکٹر احمد حسنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان سب کے والد محترم جناب مسلم حسنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ قابلِ ذکر ہیں، مولانا عبد اللہ حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے اہل خانہ جب چھٹیوں میں تکیہ رائے بریلی جاتے تھے تو مولانا مرحوم اپنے گھر پر رات کے قیام کے لیے مجھے اور ندوۃ العلماء کے کلیۃ الشریعۃ کے کتب خانہ کے ملازم بڑے میاں زاہد صاحب کو دعوت دیتے تھے، اس طرح خاندان حسنین سے

بہت ہی زیادہ قرب رہا۔

فضیلت اول کے دورِ طالب علمی میں ہی مولانا سید سلمان حسینی صاحب کی رفاقت میں مغربی یوپی کے ایک ایسے پندرہ روزہ تاریخی ودعوتی دورہ میں شریک ہونے کا موقعہ ملا، جس کے رفقائے سفر مولانا محمود حسن حسنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا اعجاز قطب بارہ بنکوی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، جس سفر میں مولانا مرحوم سے مزید تعلق قائم ہوا اور جس کی یادیں آج تک دل ودماغ پر نقش ہیں۔

مولانا محمود حسن حسنی رحمۃ اللہ علیہ میرے ایک مخلص ومحبوب دوست تھے، میں اور مولانا سید ہاشم ایس ایم ندوی بھٹکلی ان کے سب سے زیادہ محبوب دوست تھے، میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے دوست واحباب میں مجھ سے زیادہ کسی اور کو اپنا عزیز نہیں سمجھتے ہوں گے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج سے چند سال پہلے وہ سعودی حکومت کی شاہی دعوت پر حج بیت اللہ کے لیے مکہ مکرمہ حاضر ہوئے تھے، ان کا قیام شاہی ہوٹل میں تھا، انہوں نے مجھ سے اپنی دوستی اور محبت کی آخری مثال پیش کی کہ ایک دن ایک رات اپنے شاہی ہوٹل اور اپنے شاہی طعام کو خیر باد کیا اور میری معمولی قیام گاہ تشریف لائے اور کہا: ''یہاں وہاں سے زیادہ لطف ہے۔''

وہ میرے ایک مخلص دوست تھے، مکہ مکرمہ میں میرے قیام پر انہیں بہت خوشی بلکہ فخر تھا، میری ہر علمی ترقی انہیں عزیز تھی، جس پر وہ خوب خوش ہوتے تھے، منھ بھر بھر کر دعائیں دیتے تھے اور ہمیشہ ہمیش ڈاکٹریٹ کی تکمیل کی تائید وہمت افزائی کرتے تھے۔

مولانا محمود حسن حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی فطرت میں، ان کی طبیعت میں صلاح، زہد وتقویٰ، انابت وخشیت تھی، وہ بہت شوق وشغف سے اللہ کا ذکر کرتے تھے، ذکر اللہ کی

مجالس ان کے لیے جنت کے باغ کی طرح تھیں، جن میں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر بہت ہی والہانہ انداز سے سیر کرتے تھے اور عرب و عجم میں ہر جگہ اس موقع کی تلاش و جستجو میں رہتے تھے جس کا میں شاہد ہوں، ان کا دل اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی محبت سے معمور تھا، وہ ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں مجھ سے کہنے لگے:

"کسی عبادت کے متعلق قطعی طور سے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ عند اللہ مقبول ہوئی یا نہیں؟ البتہ درود شریف ایک ایسی مقدس عبادت ہے کہ جس کی قبولیت یقینی ہے"

درود شریف کا وہ بڑا اہتمام کرتے تھے، ان کی آخری تصنیف جو ان کی وفات سے تین دن قبل منظر عام پر آئی تھی جو مسک الختام کا درجہ رکھتی ہے، "ہدیہ درود و سلام" پر علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ شعر یاد آتا ہے جو انھوں نے سیرت النبی ﷺ لکھتے وقت کہا تھا:

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم ﷺ
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

مولانا محمود حسن حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے خمیر میں، ان کے مزاج میں دین، زہد و تقوی، عشق رسول ﷺ، تواضع و خاکساری، اہل اللہ سے تعلق و محبت تھی، ان کی دینداری اصلی اور طبعی تھی، ان کی دینداری بناوٹی اور خودساختہ نہیں تھی، ان کے ہاتھ میں تسبیح نہیں ہوا کرتی تھی، لیکن ان کا دل حقد و حسد، بغض و کینہ سے پاک وصاف تھا، اہل دل سے ان کا دل خوب ملتا تھا، وہ خود ایک اہل دل تھے، وہ ایک عجیب فرشتہ صفت انسان تھے، وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کی ترقی سے خوش ہوتے تھے، ہمیشہ

ان کی ہمت افزائی کرتے اور انہیں دل سے دعائیں دیتے تھے، کسی کی اصلاح وتنبیہ کا بھی عجیب ولطیف انداز تھا، اللہ تعالیٰ نے انہیں سوانح نگاری کا بڑا ذوق دیا تھا، انہوں نے ملت اسلامیہ ہندیہ کے بزرگان دین حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ، حضرت مولانا عبد الباری ندوی لکھنویؒ، حضرت مولانا ابرار الحق حقیؒ، حضرت مولانا زبیر الحسن کاندھلویؒ، حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ، حضرت مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ، حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ بھٹکلی کی سوانح حیات مرتب کرکے ملت اسلامیہ ہندیہ پر بڑا احسان کیا ہے، بالخصوص ''تذکرہ حضرت مولانا عبدالباری ندوی بھٹکلی رحمۃ اللہ علیہ'' اہل بھٹکل پر ان کا عظیم احسان ہے، اللہ رب العزت انہیں ملت اسلامیہ ہندیہ کی طرف سے اس کا اجر عظیم عطا فرمائے، انہوں نے اپنی اس کم عمری میں وہ عظیم کارنامہ انجام دیا جو مشکل سے صدی میں پورا ہوتا ہے، اللہ رب العزت ان کے اہل خانہ، اعزہ واقارب، جمیع محبین ومتعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، خانوادۂ حسنی اور دار العلوم ندوۃ العلماء کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ اللھم آمین!

اللهم اغفر له وارحمه وارفع درجته في المهديين واجعل كتابه في عليين ووسع قبره مد بصره ونور له في قبره واجعل قبره روضة من رياض الجنة واجمعنا وإياه في الفردوس الأعلى مع سيد المرسلين والنبيين والصديقين والشهداء والصالحين، برحمتك يا أرحم الراحمين. اللهم آمين!

ایک خادم دین وعلم نہ رہا

ڈاکٹر محمد وقار الدین لطیفی ندوی
(آفس سکریٹری مرکزی دفتر مسلم پرسنل لا بورڈ، نئی دہلی)

تیز قدموں کے ساتھ ہر دم رواں دواں رہنے والے، مطالعہ کے دھنی، کتاب و قلم کے سہارے زندگی گذارنے والے، ہنستے مسکراتے گلے ملنے والے، خیر خیریت کے بعد سرگرمی سے متعلق واقفیت حاصل کرنے والے، کتابوں کے مطالعہ کی تلقین کرنے والے، تاریخی باتوں کو نوٹ کرنے والے اور ہر لمحہ علم کے جویا نظر آنے والے ہمارے مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی جنہیں اب ہم رحمۃ اللہ علیہ لکھنے پر مجبور ہیں۔ ۲۲ر جولائی ۱۹۷۱ء مطابق ۲۸ر جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ کو خاندان سادات حسنی کے مشہور علمی گھرانے میں پیدا ہوئے، گھر اور خاندان کا پورا ماحول علمی و دینی تھا اور اس ماحول نے ان کی زندگی پر گہرے نقوش ثبت کیے، ان کے اسی بچپن کا تذکرہ کرتے ہوئے استاد گرامی مولانا شمس الحق صاحب ندوی (ایڈیٹر پندرہ روزہ تعمیر حیات) تحریر فرماتے ہیں:

''محمود میاں بچپن ہی سے بڑے شریف النفس، متواضع مزاج، صاحب ورع و تقویٰ اور صالح و باکردار تھے۔ بالفاظ دیگر ان کی نشو ونما ایسے ہی ہوئی تھی جیسے خانوادۂ حسنی کے ممتاز افراد کی ہوا کرتی ہے، نوعمری میں بھی کھیل کود سے کوسوں دور، اعمال واذکار اور درس ومطالعہ کے شوقین رہے، جس کی بنا پر کم عمری ہی میں اہل علم وعمل کے طبقہ میں اچھا مقام وحیثیت ان کو حاصل ہو گیا تھا۔''

(اداریہ تعمیر حیات: ۲۵/اگست ۲۰۲۲ء صفحہ نمبر ۵)

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کے تعلق سے اسی خاندان کے اہم فرد حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی صاحب (ناظر عام ندوۃ العلماء-لکھنؤ) جو مرحوم سے عمر میں صرف دو سال بڑے تھے تحریر فرماتے ہیں:

''ان کو دین کا ذوق بچپن سے حاصل تھا، جو عمر کے ساتھ بڑھتا گیا، وہ اپنے زہد اور دنیا سے بے رغبتی میں بہت آگے گئے، ہر کام میں ان کے سامنے دینی فائدہ ہوتا، دنیا کے کسی ادنیٰ فائدہ سے ان کو کوئی رغبت نہ تھی، ان کو شروع سے بزرگوں سے استفادہ کا شوق تھا، مشائخ عصر کی خاص توجہ وشفقت ان کو حاصل رہی، متعدد مشائخ سے ان کو اجازت وخلافت بھی ملی، مگر انہوں نے کہیں اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔'' (ماہنامہ پیام عرفات ستمبر ۲۰۲۲ء)

مولانا محمود حسن حسنی صاحبؒ سے پہلی ملاقات کب اور کس طرح ہوئی یاد نہیں، البتہ یہ ضرور یاد آتا ہے کہ میں جب ندوہ کے ابتدائی درجات میں داخل ہوا تو مولانا محمود صاحب عالمیت کے آخری درجہ میں تھے، پھر انہوں نے فضیلت اور دعوہ کی تکمیل کی، خاندانی شرافت کے پیکر تو تھے ہی، سلام کے علاوہ کبھی اس دوران بات آگے نہ بڑھ سکی، اس کے بعد عالیہ ثانیہ میں پہنچا تو یہ بھی ضیاء العلوم کے طلباء سے ملنے

تشریف لاتے اور غالباً وہیں باقاعدہ کچھ ضیاء العلوم کے ابنائے قدیم کی معیت میں مولانا سے ملاقات اور تعارف ہوا، اس ملاقات کے موقع پر محسوس ہوا کہ مولانا بڑے خوش اخلاق اور خوش مزاج ہیں اور یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ پہلی باقاعدہ ملاقات ہے، مولانا مرحوم جس شفقت و ہمدردی کا مظاہرہ فرماتے اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور اللہ نے اس کے بعد اس ملاقات کو گہرے تعلقات میں تبدیل فرما کر باہم تبادلہ خیال اور مشوروں کا موقع دیا، ہر موقع پر میں نے مولانا مرحوم کی خوبیوں کو محسوس کیا اور ان کا گرویدہ ہوتا چلا گیا۔

ندوہ سے تعلیمی سلسلہ ختم ہونے کے چند ماہ بعد میں بانگ درا (بانگ حرا) سے نسلک ہوگیا اور وہاں جناب امین الدین شجاع الدین صاحبؒ کی سرکردگی اور مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی صاحب کی سربراہی میں کام کرنے کا موقع ملا تو مولانا محمود صاحبؒ اکثر شباب کے دفتر تشریف لاتے اور تفصیلی ملاقات ہوتی اور مولانا مرحوم کی خوبیاں دن بدن واشگاف ہوتی گئیں، شباب کے قیام کے بعد میں دہلی منتقل ہوگیا اور ایک سال بعد ہی مخدوم گرامی قدر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب دامت برکاتہم کو مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تو محمود بھائی سے قربت اور تعلق میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مسلم پرسنل لا بورڈ پر ان کو کچھ لکھنا ہوتا تو رابطہ کرتے اور مجھے کچھ ضرورت پڑتی تو میں رابطہ کرتا، ان کا مزاج علمی اور تحقیقی تھا اور گفتگو میں وہ نئی کھوج میں سرگرداں رہتے اور اپنی اس کھوج کو الفاظ و جملوں کا پیرہن دیتے اور مضمون تیار کر لیتے، مخدوم گرامی قدر حضرت صدر محترم کے اسفار کی رپورٹنگ کا اہتمام کرتے اور مجھ سے ملاقات پر مطالعہ کی تلقین فرماتے، پھر میں اس پر اپنی رائے دیتا تو بڑی فراخ دلی سے قبول کرتے اور حوصلہ افزائی بھی فرماتے۔

مطالعہ اور لکھنا ان کی زندگی کا حصہ بن گیا تھا، ملاقات پر بنا معانقہ کے نہ چھوڑتے اور مانو ساری محبت انڈیل دیتے، اپنی نئی تحریروں کو پڑھنے اور رائے دینے کا اصرار کرتے، یہی نہیں بلکہ حق بات کہنے میں کبھی تامل نہ کرتے، صاف ستھری بات کرنے کا مزاج تھا، اسلامی تاریخ اور سیرت وسوانح سے خاصی دلچسپی تھی اور اسی دلچسپی کی وجہ سے انہوں نے مولانا عبدالباری ندوی، مولانا شاہ ابرارالحق حقی، مولانا زبیرالحسن کاندھلوی، مولانا محمد یونس جونپوری، مولانا عبداللہ حسنی ندوی اور مولانا عبدالباری بھٹکلی ندوی رحمہم اللہ جیسی عبقری شخصیات کی حیات وخدمات پر کتابیں لکھیں اور مقبول عام وخاص ہوئیں، یقیناً مولانا محمود صاحبؒ کی یہ تحریری خدمات اب ان کے کام آرہی ہوں گی۔ اس کے علاوہ ان کی عظیم تصنیف ''تاریخ اصلاح وتربیت'' کی دو ضخیم جلدیں بڑی مفید اور کارآمد تصنیف ہے، حالانکہ وہ کئی جلدوں میں لکھنے کا ارادہ کر چکے تھے مگر اپنی زندگی میں دو ہی جلد طبع کرا سکے اور باقی ایک دو جلد طباعت کے قابل چھوڑ کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور مرحوم کی نجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے لکھنؤ اجلاس ۲۰۱۰ء کی تیاری میں مولانا مرحوم نے بڑا اہم رول ادا کیا تھا اور ان کی محنتوں سے ایک سوونیئر بھی نکالا گیا جس کی تیاری میں اس حقیر سے بھی آپ نے مدد لی اور قدیم ریکارڈ سے معلومات حاصل کر کے اس سوونیئر کو مرتب کیا، جو ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، اسی موقع پر آپ نے مخدوم گرامی قدر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب مدظلہ العالی کے اب تک کے خطبہ صدارت کو مرتب کر کے پہلی مرتبہ کتابی شکل میں تیار کر کے طبع کرایا جس کو لوگوں نے بہت پسند کیا اور حضرت مدظلہ کے ان خطبات کو جمع کرنے سے ایک اچھی اور مفید

چیز محفوظ ہوگئی، حالانکہ اس کے بعد بھی اس کے متعدد ایڈیشن اضافوں کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔

فروری ۲۰۱۸ء میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس حیدرآباد میں منعقد ہوا، جس کی پہلی نشست مجلس عاملہ کی تھی اور اس نشست کے ہنگامہ خیز ہونے کی توقع بہت پہلے سے تھی، میٹنگ ہال میں غیر ارکان عاملہ کے علاوہ دفتری عملہ کے ساتھ مولانا محمود صاحبؒ بھی موجود تھے، توقع کے مطابق میٹنگ ذرا نازک موڑ سے گذر رہی تھی اور ہمارے مولانا محمود صاحب سراپا بے چین ہو رہے تھے، بار بار صرف یہ کہتے: ''اب کیا ہوگا؟'' الغرض اس دوران وہ مجھے سرگوشی کرتے ہوئے اپنی رائے دیتے اور میرا عندیہ بھی معلوم کرتے۔ ایک خاص معاملہ کے پس منظر میں بعد کے حالات مادر علمی اور ان کے ذمہ داروں کے حق میں خاصے تکلیف دہ رہے، خاص طور پر صحابہ کرام کے تعلق سے مادر علمی اور اس کے ذمہ داروں کا ذہن ومزاج جمہور کی طرف تھا، اسی ضمن میں کچھ ایسے بھی حالات پیدا ہوگئے جس کی توقع نہیں تھی، ان ہی حالات کے موقع سے میرا مادر علمی جانا ہوا اور ان حالات کو دیکھتے ہوئے سابق جنرل سکریٹری بورڈ حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحبؒ نے فرمایا کہ ابھی دو تین دن مزید رک کر واپس جائیں اور مجھے یہاں کے حالات سے باخبر کرتے رہیں۔ دہلی واپسی کے بعد میں نے ''آنکھوں دیکھا حال'' کے عنوان سے مادر علمی میں گذارے چند دن کی روداد مرتب کر کے عام کردی، پھر کیا تھا ایک خیر خواہ نے اس کا جواب لکھا، جواب کیا تھا! بلکہ دکھتی رگ پھڑکنے کے بعد انسان تلملاہٹ میں جس طرح آپا کھو دیتا ہے بس اسی طرح کا جواب تھا۔ خیر کچھ ہمدردوں نے اور بعض اساتذہ اور احباب نے رائے دی کہ اس کا جواب لکھوں، چنانچہ مدلل جواب لکھا گیا جو الحمدللہ مسکت ثابت ہوا، اس کی

پہلی قسط میں جن حضرات نے فون کے ذریعہ حوصلہ افزائی فرمائی ان میں ہمارے مولانا محمود صاحب ؒ بھی سرفہرست تھے، بلکہ وہ تو صحابہ کرام ؓ کے دفاع میں جب بولتے تو ان کے پورے تن بدن میں خون کا دورانیہ تیز ہوجاتا اور کسی قیمت پر اس سے کم پر تیار نہ ہوتے، حضرت مولانا سید بلال حسنی ندوی صاحب نے اس پہلو پر بہت جامع لکھا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''حق بات کہنے میں ان کو کوئی باک نہیں تھا، ''لا یخافون لومة لائم'' کا مصداق تھے، اخیر میں صحابہ کے دفاع میں تیغ براں تھے، اللہ کے لیے ان کو کسی کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔''

بلاشبہ مولانا ان خوبیوں سے متصف تھے، اللہ ان کے سیئات کو حسنات سے مبدل فرمائے نیز اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ان کے ادھورے کاموں کی تکمیل کے لیے غیب سے انتظام فرمائے۔ آمین! ربنا تقبل منا إنک أنت السمیع العلیم

جسے آشناؤں کا پاس تھا وہ وفا شعار چلا گیا

مولانا ناصر الدین مظاہری
(استاد مظاہر علوم وقف-سہارنپور)

زخموں پر مرہم رکھنے والے اس دنیا میں شاید و باید ہیں، لیکن نمک پاشی کرنے والے تھوک کے بھاؤ ملتے ہیں، مثبت فکر اور سوچ کے حاملین کو چراغ لے کر تلاش کرنا پڑتا ہے، لیکن منفی سوچ رکھنے والے آپ کے گرد و نواح میں، آپ کے آزو بازو میں، آپ کے دائیں بائیں آگے پیچھے، بلکہ اب تو اوپر نیچے ہر جگہ مل جائیں گے، ''ابغض البلاد'' کو ابغض البلاد کیوں کہا گیا؟ اس کی تشریح تو محدثین سے پوچھیں، ہم نے جو جانا ہے وہ یہی ہے کہ بازار ہر قسم کے کاروبار، ہر قسم کے روزگار، ہر قسم کی شیطانیوں، ہر قسم کی خرافاتوں، ہر قسم کی ذہنیتوں کے آماج گاہ ہوتے ہیں، جہاں بے پردگی و بے حیائی سے لے کر بردہ فروشی تک، حرام خوری سے لے کر حرام کاری تک ہر چیز ہوتی ہے، ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اسی لیے ''ابغض البلاد'' کے مقابلہ میں ''احب البلاد'' کو لایا گیا اور ہمیں بتلایا گیا کہ اگر تمہیں کہیں سکون مل سکتا ہے تو مساجد میں، اللہ اللہ کرنے والوں کے جلو اور پہلو میں، نیکوں اور نیکوکاروں کی صحبتیں میں، ان ہی اللہ والوں میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر خدا یاد آجاتا ہے، کیونکہ وہ ہر دم خدا کو ہی تو یاد کرتے ہیں، خدا کی

بات کرتے ہیں، خدا کے پاس سے آنے والوں اور خدا کے پاس جانے والوں کا ذکر ہوتا ہے، یہ لوگ وہ کام کرتے ہیں جس کی وجہ سے رحمت الٰہی کا نزول ہوتا ہے، کرم الٰہی کی بارشیں برستی ہیں، ذکر کی توفیق ملتی ہے، رحمت الٰہی کا شمول ہوتا ہے، ایک پر کیف موسم ہوتا ہے، جہاں دلوں کی کدورت دور ہوجاتی ہے، جہاں ذہنوں کی کثافت ختم ہوجاتی ہے، جہاں صرف اور صرف یاد خدا اور فریاد خدا کا بول بالا ہوتا ہے، اب ایسی ہستیاں اور ایسی بستیاں ایک ایک کر کے ختم ہوتی جارہی ہیں، کل تک جن جگہوں پر ’’الا اللہ الا اللہ‘‘ کی ضربیں مسموع ہورہی تھیں، آج وہاں پر بلند و بالا عمارتیں جگمگ کررہی ہیں، کل تک جہاں کے پتے پتے ذکر الٰہی میں مشغول نظر آتے تھے، آج وہاں سجادگی اور جانشینی کی جنگیں جاری ہیں، کل تک جہاں آہ کی حکمرانی تھی، آج وہاں واہ کی جلوہ فرمائی ہے، ہائے ہائے رند لکھنوی آپ کا بھی جواب نہیں:

آ عندلیب !مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

ابھی تو ہماری آنکھوں میں عارف باللہ حضرت مولانا حکیم سید مکرم حسین سنسارپوریؒ کی جدائی کی نمی باقی تھی، ابھی تو ہمارے سینوں میں حضرت کی جدائی کی کسک باقی تھی، ابھی تو حضرت کی رحلت اور حادثہ پر ہم صحیح معنی میں سنبھلے بھی نہیں تھے کہ صبح صبح اطلاع دینے والوں نے بڑی سادگی کے ساتھ اطلاع دے دی کہ ’’حضرت مولانا محمود حسن حسنی ندوی فوت ہوگئے۔‘‘ اناللہ وانا الیہ راجعون!

’’تعمیر حیات‘‘ کی ویب سائٹ پر مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ کے بارے میں یہ معلومات درج ہیں:

’’سید محمود حسن حسنی ندوی لکھنؤ میں ۲۸ / جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۲ / جولائی ۱۹۷۱ء کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم ندوۃ العلماء کے ایک مکتب میں حاصل

کی، ابتدائی عربی درجات کی تعلیم مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی میں حاصل کرنے کے بعد ثانویہ اور عالمیت کی تکمیل دار العلوم ندوۃ العلماء سے کی۔ حدیث شریف کا دو سالہ کورس ۱۴۱۲ھ / ۱۹۹۲ء میں کیا اور پھر المعہد العالی للدعوۃ و الفکر الاسلامی کا ایک سالہ کورس کر کے مدرسہ ضیاء العلوم سے تدریس کا آغاز کیا اور دارِ عرفات رائے بریلی میں تصنیف و تحقیق سے وابستگی اختیار کی۔ ۲۰۰۱ء سے معاون ایڈیٹر کے طور پر پھر کچھ عرصہ بعد نائب مدیر کے طور پر ''تعمیر حیات'' سے وابستہ ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ''تاریخ اصلاح و تربیت'' اور کئی دینی علمی دعوتی اور اصلاحی شخصیات کے تذکرے شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ماہنامہ ''رضوان'' لکھنؤ کے معاون مدیر اور دارِ عرفات رائے بریلی کے ترجمان ''پیامِ عرفات'' کی مجلس ادارت کے رکن ہیں۔''

یہ تو بنیادی معلومات بطور پروفائل ''تعمیر حیات'' نے اپنی ویب سائٹ پر شامل وشیئر کی ہیں، لیکن سچائی یہ ہے کہ مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ کے اندر بڑے کمالات تھے، بڑے جمالات تھے، ان کا دماغ بڑا حاضر اور ان کا قلم بڑا اسیال تھا، ان کے قلم سے بے شمار کتابیں نکل کر داد تحسین وصول کر چکی ہیں، وہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید علی میاں ندویؒ کے چہیتے تھے، حضرت مولانا سید علی میاں ندویؒ کی کتابوں، مضامین اور مقالات وسفرناموں کی تفصیلات ان کے ذہن میں گردش کرتی رہتی تھیں، وہ چاہتے تھے کہ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے اپنی کتابوں اور تحریروں میں اپنے جن عزائم اور ارادوں کا اظہار کیا ہے، ان کے بعد والے ان نقوش پا کی تلاش اور جستجو میں مصروف ہوں اور حضرت کے ارادوں کو عملی شکل دے کر ایک عظیم مربی، عظیم مفکر، عظیم داعی اور عظیم استاذ و مصنف کی روح کو مسرور کریں۔ یہی مولانا محمود حسنی کا گویا مشن تھا اور بہت سے نئے فارغین کو اس کام پر لگایا بھی اور بہت سی کتابیں مولانا کے زیر سایہ

منظر عام پر بھی آئیں اور علمی دنیا نے ان کتابوں کو آنکھوں سے لگایا بھی۔ ع

تری زلف اور سنور گئی، ترا حسن اور نکھر گیا

جسے آشناؤں کا پاس تھا وہ وفا شعار چلا گیا

تکیہ رائے بریلی کے خانوادۂ حسنی سادات میں جواں سال اموات کا سلسلہ کوئی نیا نہیں ہے، ایک فہرست ہے جو اس سانحہ سے گزری ہے، چنانچہ حضرت مولانا سید محمد الحسنیؒ (وفات ۱۳/جون ۱۹۷۹ء، عمر ۴۴ سال) مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ (وفات ۱۶/فروری ۱۹۸۲ء) مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ (وفات ۳۰/جنوری ۲۰۱۳ء) مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندویؒ (وفات ۲۰۲۱ء) اور اب مولانا سید محمود حسن حسنیؒ (ولادت ۲۸/جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۲/جولائی ۱۹۷۱ء- وفات ۱۲/اگست ۲۰۲۲ء یوم جمعہ) انتقال فرماگئے۔

مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ اپنے پورے خانوادہ کے لاڈلے اور چہیتے تھے اور کم عمر نوجوانوں میں مولانا محمود حسنی سب سے زیادہ کتابوں اور رسالوں کے مصنف اور مرتب بھی ہیں۔ آپ خوب لکھتے تھے اور بہت اچھا لکھتے تھے، لکھنے کی انھیں دُھن تھی، کیونکہ ان کے پاس ان کے بڑوں کا دَھن تھا، وہ شخصیات کے بارے میں بہت اچھا لکھتے تھے، چنانچہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقی، حضرت مولانا زبیر الحسن کاندھلویؒ، حضرت مولانا شیخ محمد یونس جونپوریؒ اور دیگر بہت سی شخصیات پر ان کے قلم سے جو سوانح حیات نکلی ہیں، وہ انشاء اللہ تا قیامت آپ کے لیے صدقہ جاریہ بنیں گی اور انشاء اللہ ان بزرگوں اور اسلاف سے تعلق اور محبت کی وجہ سے حدیث شریف کی روشنی میں امید قوی ہے کہ اسلاف ہی کے ساتھ محشور ہوں گے۔ ع

کیسی بے فیض سی رہ جاتی ہے دل کی بستی

کیسے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

ڈاکٹر آصف لئیق ندوی
(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی- حیدرآباد)

اگر یہ خبر درست ہے تو واقعۃً ندوی برادری کے لیے بہت اندوہ ناک خبر ہے، جس مصیبت پر ہمیں بھی بہت تکلیف اور صدمہ ہے، اس افسوس ناک موقع سے ہم تمام ندوی برداری اور حسنی خاندان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور خدا سے رحمت و مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں کہ اللہ ان کی قبر کو جنت کا حسیں باغ بنائے، نیکیوں کا خاطر خواہ صلہ عطا فرمائے، پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

یاد رہے کہ موت کا فیصلہ من عند اللہ تعالیٰ ہوتا ہے، جس کا اطلاق کبھی اور کسی وقت کسی بڑے سے بڑے عالم دین اور کسی محقق و مفسر اور محدث و ادیب پر بھی ہوسکتا ہے اور اعلیٰ و ادنیٰ مضمون نگار و مقالہ نویس بھی اس کے دائرہ میں آسکتے ہیں، خدا کا فضل ہے کہ کوئی اب تک زندہ و متحرک ہیں، تو کوئی اپنا وقت پورا کر کے موت کی آغوش میں جا کر اپنے پرودگار کی طرف رخت سفر باندھ رہے ہیں، جیسا کہ حضرت مولانا محمود حسنی ندویؒ کے سانحہ ارتحال سے محسوس ہوتا ہے، کسی کی رخصتی سے دل کو بہت صدمہ

پہنچتا ہے اور آنکھیں اشک بار ہوتی ہیں۔غم واندوہ کا ماحول قائم ہوتا ہے،کوئی ہمارے عزیز ہوتے ہیں تو کوئی مربی وخیر خواہ۔

آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سر مجبوری عیاں
خشک ہوجاتا ہے دل میں اشک کا سیل رواں

مولانا محمود صاحب کی شخصیت انہی خیر خواہوں اور مخلصوں میں سے ایک بڑی شخصیت تھی،جس نے بڑے بڑے بزرگوں اور استادوں کی صحبتوں سے کسب فیض کیا ہے،بطور خاص حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی گراں قدر شخصیت سے عمدہ تربیت و اصلاح حاصل کی ہے اور اپنی علمی وادبی اور روحانی واخلاقی پیاس بجھائی ہے،جواب ہمارے درمیان سے رخصت ہوگئی ہے۔اناللہ وانا الیہ راجعون!

موت ہے ہنگامہ آرا قلزم خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

مولانا نیاز احمد سجاد ندوی
(مقیم کویت)

برادرم محمود حسن سے ابھی ایک ماہ پہلے مؤرخہ ۴ رجولائی کو ان کی رہائش گاہ تکیہ پر ملاقات ہوئی تھی اور ملاقات کے دوران ان کی طبیعت ہشاش بشاش تھی، لیکن نقاہت کا اندازہ اس طور پر ہو رہا تھا کہ وہ بمشکل سیدھے بیٹھ پا رہے تھے، اس کے باوجود ہمت و جرأت اور عزم و حوصلہ کے آگے ساری چیزیں پست نظر آ رہی تھیں، ان کا وہی انداز گفتگو جو کلاس کے درمیان طالب علمی کے دور میں ہوا کرتا تھا، مرحوم چونکہ میرے ہم درس تھے، عالمیت کے ساتھ ساتھ فضیلت بھی ساتھ میں کیا تھا اور چند ایام رائے بریلی میں حضرت مرحوم علی میاں ندوی سے شرف تلمذ حاصل کرنے کی غرض سے دار عرفات میں رہنے کا اتفاق ہوا، جہاں برادرم محمود کی ضیافت اور ساتھیوں کا خیال اس قدر کرتے تھے کہ لگتا تھا کہ ہم لوگ اپنے گھر پر ہیں، ان کی خاکساری اور تواضع کے سبھی ساتھی قائل تھے۔ لایعنی اور فضول باتوں سے ہمیشہ دور رہتے، حالانکہ درجہ کے کچھ ساتھی کبھی چھیڑتے یا کینٹین چلنے کے لیے کہتے تو وہ برجستہ کہتے کہ مجھے کینٹین

بازی سے سخت نفرت ہے، بلکہ انہیں دیگر بازیوں سے بھی سخت نفرت تھی اور جب بھی کوئی ایسا موقع آتا تو وہ مسکراتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے گزر جاتے کہ ٹھیک ہے ملتا ہوں، فضیلت کرنے کے بعد کچھ دنوں تک میں جمعیۃ شباب الاسلام سے منسلک رہا، پھر اس کے بعد مزید اعلیٰ تعلیم کی غرض سے دلی آ گیا اور محمود حسنی دعوہ کرنے کے بعد درس و تدریس سے منسلک ہو گئے اور تا حیات اسی سے جڑے رہے اور میں مزید جامعہ ملیہ اور دہلی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کر کے کویت چلا گیا اور جب کبھی انڈیا آتا تھا تو ندوہ بھی جانا ہوتا تھا اور برادرم محمود سے قصداً اور بلا قصد ملاقات بھی ہو جایا کرتی تھی، لیکن اس بار کی ملاقات ماضی کی ملاقات سے قدرے مختلف تھی، لگتا ہے جس کا احساس برادرم کو قبل از وقت ہو گیا تھا، جس کا عکس اظہار گفتگو میں نمایاں جھلک رہا تھا۔

عرصہ دراز کے بعد ایسی ملاقات ہوئی تھی، جب کہ فون پہ گاہے بگاہے بات ہو جایا کرتی تھی، ہاں البتہ بالمشافہ گفتگو ایک عرصہ دراز کے بعد ہوئی تھی، وہ ملاقات سے حد درجہ خوش تھے اور کہہ رہے تھے کہ نیاز! واقعی تم نے ہم درس نہیں بلکہ ایک عزیز ہونے کا ثبوت دیا ہے اور صرف اور صرف تم نے مجھ سے ملاقات کرنے اور مزاج پرسی کے لیے یہاں آنے کی زحمت گوارہ کی، یہ بہت بڑی بات ہے، اللہ تمہیں سلامت رکھے اور خوب ساری دعائیں دیں۔ مزید دوسرے ساتھیوں اور ہم درس احباب کا بھی تذکرہ ہو رہا تھا اور کہہ رہے تھے کہ دوران سال اپنے کئی ساتھی داغ مفارقت دے گئے، برادرم اعجاز قطب ندوی، برادرم شاکر بدایونی ندوی، برادرم عبد الرحمن ندوی اللہ کے پیارے ہو گئے، اللہ ان تمام حضرات کی مغفرت فرمائے اور غریق رحمت کرے۔ آمین ثم آمین! اور مجھے برجستہ وہ شعر یاد آ رہا تھا کہ

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

اتنے میں عزیزم معاذ کچھ مشروب اور اپنے باغ کے پھل لے کر حاضر ہو گئے اور کہا کہ کھاؤ بھی اور ساتھ لیتے بھی جانا اپنے باغ کا ہے۔ان کی ضیافت دیکھ کر مجھے خاتون منزل کی کچھ پرانی یادیں تازہ ہو رہی تھیں، جب کبھی گھر میں ایام تعطیل کے دوران کوئی نہیں رہتا تھا تو اپنے ساتھ گھر پہ بلا لیتے یا گھر کی چابی دے کر چلے جاتے اور میرے کھانے اور چائے ناشتہ کا پورا انتظام کر کے جاتے یا پھر استاد مکرم مولانا سلمان حسینی صاحب کے یہاں کہہ کر جاتے کہ نیاز میرے گھر پر رکے ہوئے ہیں، ان کا خیال رکھیے گا۔

پھر انہوں نے کویت میں مقیم ندوی حضرات کے بارے میں پوچھا اور کہا کہ اپنے ساتھیوں میں وہاں کون کون ہیں اور سبھوں کو میرا اسلام عرض کرنا اور خاص طور سے صحت کے لیے دعا کرنا۔

مرحوم کی کن کن صفات کا ذکر کروں، وہ ایک نابغہ روزگار شخصیت اور خانوادۂ حسنی کے چشم و چراغ تھے، ان کی کون کون سی یادوں کو زیر قرطاس کروں؟ کہاں سے شروع کروں اور کہاں ختم کروں؟ ع

زمیں کاغذ کی بن جائے سمندر روشنائی کا
قلم کچھ لکھ نہیں سکتا کہ صدمہ ہے جدائی کا

مرحوم نے واقعتاً بہت ہی قلیل عرصے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، کئی کتابیں تصنیف کر ڈالیں، کتنے مضامین کو مرتب کر کے طباعت سے آراستہ کر کے رہتی دنیا تک تابندہ کر دیا، کتنے بزرگان دین، مشائخ اور اولیاء کرام کے ملفوظات اور تذکرۂ حیات قلمبند کر کے علمی ذخیرہ کو محفوظ کر دیا، سوانح نگاری اور سیرت نگاری میں خاصہ ملکہ حاصل تھا، مثال کے طور پر امیر الدعوہ والتبلیغ حضرت مولانا زبیر الحسن کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، محی السنہ حضرت شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ، تذکرہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، تذکرہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، سوانح حضرت مولانا

سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ، تذکرہ حضرت مولانا محمد یونس جونپوری رحمۃ اللہ علیہ، داعی حق حضرت استاد عبد اللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور سوانح حضرت مولانا محمد عبد الباری بھٹکلی رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے علاوہ تجدید معاشرت، فرشتہ صفت انسان ،تاریخ اصلاح وتربیت، سلاسل اربعہ، ہدیہ درود وسلام اور کئی رسالے اور کتابچے شامل ہیں جو مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کے علاوہ بہت سے عنوانات پر ان کے قلم نے بیش بہا وقیمتی سرمایہ چھوڑا ہے اور کم وقت میں جو خدمات انجام دی ہیں، اپنے ساتھیوں اور ہم عصروں میں شاید ہی کسی نے انجام دی ہوں۔

راہ دیکھا کرے گا صدیوں تک
چھوڑ جائیں گے یہ جہاں تنہا

لیکن کیا خبر تھی کہ مشیت ایزدی کو کچھ اور ہی منظور تھا اور وہ گھڑی ۱۲/اگست کو آ ہی گئی اور برادرم کی وصال پر ملال کی خبر ملی اور انہوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! واقعتاً یہ حادثہ بہت ہی دل دوز ہے، جس سے پورا دل ودماغ مغموم وافسردہ ہے اور صبر کے علاوہ کوئی چارہ کار اور سہارا نہیں۔

خزاں لوٹ ہی لے گئی باغ سارا
تڑپتے رہے باغباں کیسے کیسے

برادر مرحوم کا اس کم عمری میں چلا جانا صرف ہم ساتھیوں کے لیے نہیں، بلکہ پوری ندوی برادری اور علمی دنیا کے لیے، بہت بڑا خسارہ ہے اور ایسا خلاء ہے جس کا پر ہونا ناممکن ہے۔

بس اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے یہی دعا ہے کہ اللہ ان کو غریق رحمت کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور امت مسلمہ کو اس کا صحیح نعم البدل سے نوازے اور وارثین اور پسماندگان اور احباب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
ایک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

دل سے خیال اُن کا بھلایا نہ جائے گا......

مفتی محمد جابر بن عمر پالن پوری
(استاد جامعہ قاسمیہ عربیہ کھروڈ)

مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے پہلی ملاقات:

تقریباً نو سال قبل رویدرا نامی گاؤں میں مولانا عبداللہ بن مولانا سلیمان صاحب جھانجی کے دولت کدے پر جانشین مفکر اسلام، مرشد اُمّت، حضرت اقدس مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی صاحب دامت برکاتہم کی معیت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے قریب دس علماء پر مشتمل قافلہ آیا ہوا تھا، اس موقع سے محبی ومکرمی حضرت مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی نور اللہ مرقدہٗ ہمارے جامعہ میں قبیل العشاء تشریف لائے تھے، آپ کا بیان بعد نماز عشاء جامعہ قاسمیہ عربیہ کھروڈ، ضلع بھروچ کی مسجد قاسمی میں اساتذہ اور طلبہ کے مابین ہوا۔

احقر کی اس وقت حضرت مولانا سے بغیر کسی تعارف کے پہلی ملاقات تھی، اس وقت آپ کو صرف واعظ کی حیثیت سے جانا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے مولانا نے اس

وقت حصول تقویٰ کے متعلّق بیان فرمایا تھا جو پُرسوز، سُریلی اور باریک آواز میں تھا، بیان کے بعد جامعہ کے اساتذہ نے مولانا کے اس بیان پر اچھے تاثرات دیے اور دادِ تحسین سے نوازا، احقر نے خود اس بیان سے اپنی ذات میں خوب فائدہ محسوس کیا۔ اس وقت مولانا کو میں نے دیکھا کہ تن پر بزرگانہ لباس اور چہرے سے نور ٹپک رہا تھا، رفتار و گفتار سے تواضع ظاہر ہو رہی تھی۔

نہد شاخِ پُر میوہ سر برزمیں......

غائبانہ تعلقات میں مضبوطی:

مولانا سے پھر لمبے عرصے بعد فون پر گفتگو ہوئی، اس کی صورت یہ ہوئی کہ مولائی ومُرشدی، امیر المؤمنین فی الحدیث حضرت شیخ محمد یونس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد علم ہوا کہ مولانا محمود صاحب حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ پر کچھ لکھ رہے ہیں، تو اس وقت احقر نے مولانا کا نمبر حاصل کیا اور فون ملایا، بات ہوئی تو احقر نے اپنا تعارف کرایا، سامنے سے جو آواز آرہی تھی وہ کسی چھوٹے بچہ کی سی معصومانہ معلوم ہو رہی تھی، احقر نے پوچھا کہ کیا آپ مولانا محمود صاحب بول رہے ہیں؟ جواب دیا گیا: جی ہاں، لیکن یقین نہیں ہو رہا تھا، کیوں کہ مولانا تو اَدھیڑ عمر کے ہو چکے تھے۔ خیر اس وقت حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے کام کے تعلق سے بات ہوئی۔ اسی اثناء میں مولانا نے احقر سے فرمایا کہ یہ کتاب جو منظر عام پر آرہی ہے اس کا سارا ثواب آپ کو ملے گا، احقر نے پوچھا: کیوں؟ مولانا نے جواب دیا کہ آپ کی کتاب ”ملفوظات مع مختصر سوانح حضرت شیخ محمد یونس صاحب رحمۃ اللہ علیہ“ کے مواد نے مجھے تفصیل کے ساتھ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح لکھنے پر آمادہ کیا۔ یہ تھی پہلی گفتگو ایک دوسرے کے نمبر کو محفوظ کرنے کی۔

اس کے بعد وقفے وقفے سے فون پر گفتگو ہوتی رہی اور تعلقات میں اضافہ ہوتا گیا، یاد رہے کہ فون پر گفتگو ایک دوسرے کی خیر خیریت کے بعد حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ طیبہ اور آپ کے علمی ترکہ سے متعلّق ہوتی، کبھی مولانا احقر سے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کے بابت سوال کرتے تو کبھی حضرت کے متعلقین کے تعلق سے سوال کرتے جو آپ کو اپنی کتاب میں لکھنا ہوتا۔

بلند عزائم اور جہد مسلسل:

مولانا نے ایک مرتبہ فرمایا کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی جسمانی اولاد نہیں ہیں جو آپ رحمۃ اللہ علیہ کے علوم کی نشر واشاعت میں حصّہ لیں، اس لیے میں نے سوچا ہے کہ چند احباب پر مشتمل ایک جماعت بنائی جائے جو حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے علمی ترکہ کو امّت مسلمہ کے سامنے پیش کرے، اس سلسلے میں مولانا نے سب سے پہلے حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے، ہر دِل عزیز جناب حضرت مولانا سیّد غفران صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بات کی تو انھوں نے بخوشی ہامی بھر دی، کچھ عرصے بعد مولانا غفران صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک سڑک حادثے کا شکار ہوکر داعئ اجل کو لبیک کہہ گئے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ مولانا نے پھر اس نیک ارادے کا اظہار احقر کے سامنے کیا، تو اس عاجز نے اپنے لیے اسے نجاتِ آخرت کا سبب یقین کرتے ہوئے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے علوم کی نشر واشاعت کی غرض سے قبول کرلیا اور احقر بھی اس کا خواہاں تھا، جس کا اظہار کئی مرتبہ اپنے بڑوں اور دوستوں میں کر چکا تھا۔

چند ماہ قبل کی بات ہے کہ حضرت مولانا ایوب صاحب سورتی دامت برکاتہم ہمارے جامعہ قاسمیہ عربیہ کھروڈ میں تشریف لائے تھے، اس موقع پر حضرت شیخ

رحمۃ اللہ علیہ کے درس بخاری شریف کی شروح کے تعلق سے بات ہوئی تو حضرت مولانا نے کہا کہ حضرت شیخ کے درس بخاری بنام "الفیض الجاری" پر کوئی کام کرنا چاہے تو میں دینے کے لیے تیار ہوں، اسی اثناء میں احقر نے حضرت مولانا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو فون ملایا، تاکہ حضرت مولانا ایوب صاحب دامت برکاتہم سے گفتگو کراؤں، حضرت مولانا نے مولانا محمود صاحب سے گفتگو کی، دورانِ گفتگو مولانا محمود صاحب نے کہا کہ ہمارے پاس حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے درس بخاری شریف کی ایک کاپی ہے، ان شاء اللہ ہم اس پر کام کروائیں گے۔

حضرت مولانا ایوب صاحب نے یہ سن کر بڑی خوشی کا اظہار کیا، ایک دِن بعد مولانا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فون احقر پر آیا کہ ہم نے یہ کام ہمارے ایک ندوی عالم کے حوالے کردیا ہے، دیکھیے! ہم دونوں کو مل کر اس کی رقم کا انتظام کرنا ہے۔ پھر مولانا نے ایک جملہ ارشاد فرمایا جو آبِ زَر سے لکھنے کے قابل ہے کہ "دیکھیے بھائی جابر! لوگ اکابر کی حینِ حیات بڑے بڑے ہدیے وتحائف پیش کرتے ہیں، لیکن وفات کے بعد بھول جاتے ہیں، ہونا یہ چاہیے کہ ان کی وفات کے بعد ان کے علوم اور ان کی دینی خدمات کو آگے بڑھانے میں بھی حصّہ لیا جائے، جیسی محبّت ان کی حیات میں کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ وفات کے بعد محبّت کا ثبوت پیش کرنا چاہیے۔"

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کلام احقر پر بجلی بن کر گرا اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا، مولانا کا یہ ارشاد احقر نے اپنے کئی دوستوں کو سنایا، سب نے اس کو پسند کیا اور کہا کہ واقعتاً اکابر کی وفات کے بعد اکثر لوگ اُنھیں بھول جاتے ہیں۔

مولانا تو حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد جو بھی کتاب منظر عام پر آتی اس کو منگواتے اور مطالعہ کرتے، خود مولانا نے بھی حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ پر بہت ہی کم مدت میں

تفصیلی سوانح کو شائع کیا، اس کو اکابر، حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین اور محبین نے خوب پسند کیا اور دادِ تحسین دی، مولانا نے اس کتاب کے تعلق سے دسیوں مرتبہ احقر سے کہا کہ اس عاجز نے بفضل الٰہی اس کتاب میں بہت محنت کی ہے اور اس کی وجہ سے طبیعت بھی خراب ہوگئی، مزید کہا کہ میں نے اس کے پیچھے دِن اور رات نہیں دیکھے، واقعۃً اگر کوئی اس کتاب کو دیکھے گا تو پتہ چلے گا کہ مولانا نے کتنا عمدہ مواد جمع فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین!

اکابر سے ربط و تعلق کا جذبہ:

ابھی چند روز قبل ۱۷/ربیع الاوّل/۱۴۴۴ھ کو مُرشدِ اُمّت حضرت اقدس مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں جانا ہوا تو حضرت مولانا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ہوا، اس وقت حضرت نے فرمایا کہ مولانا محمود میرے کاموں میں بڑے معاون تھے اور وہ بڑے بڑے کام اس طرح انجام دے دیتے تھے کہ ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا تھا، انھوں نے دِن رات نہیں دیکھے، بیماری کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ الغرض حضرت دامت برکاتہم نے مولانا کے کاموں کے تعلق سے ان کی مدح کی۔ پھر احقر سے حضرت نے پوچھا کہ آپ کا تعلق مولانا سے کب ہوا؟ احقر نے جواب دیا کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد سے، پھر احقر نے کہا کہ حضرت والا کی خدمت میں آنے کے لیے مولانا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہی ترغیب دی تھی، اس لیے احقر دو سال قبل حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور آج بھی جو حاضر ہوا ہوں مولانا نے ہی اپنی وفات سے چند روز قبل بار بار فون کر کے بلایا تھا اور کہا تھا کہ آیئے! اور حضرت سے استفادہ کیجیے! اس پر حضرت اقدس مولانا سیّد محمد رابع صاحب دامت برکاتہم نے فرمایا کہ وہ لوگوں کو اپنے بڑوں سے مربوط کرتے تھے، کئی لوگوں نے سنایا کہ مجھے مولانا محمود صاحب نے بھیجا ہے۔

جب احقر پہلی بار ندوۃ العلماء حاضر ہوا تھا اس وقت مولانا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے احقر سے فرمایا تھا کہ کہیں نہ جانا، جب بھی موقع ملے حضرت کی خدمت میں آ کر بیٹھ جانا اور حضرت سے ذکر وغیرہ معلوم کرنا، تو احقر نے مولانا کی باتوں کی پاسداری کرتے ہوئے ایسا ہی کیا، مولانا نے حضرت سے بھی تعارف کرایا اور حضرت نے بھی احقر پر خوب لطف وعنایت کا معاملہ فرمایا۔

آتی ہے بات بات مجھے بار بار یاد
کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق:

جہاں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ پر اُردو میں سوانح لکھی وہیں اس کو عربی اور انگریزی میں بھی شائع کروایا اور ابھی مفصل عربی میں سوانح کا کام مکمّل ہو گیا تھا کہ حضرت مولانا دارِ فانی سے دارِ بقا کی طرف رحلت فرما گئے۔

ایک بات یہاں عرض کرتا ہوں کہ مولانا نے احقر سے کئی بار کہا کہ ایک مرتبہ میں سہارن پور حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گیا تھا، واپسی کے موقع پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قریب بُلا کر فرمایا کہ ''لو یہ قلم! اس سے لکھا کرو۔'' اس کے بعد سے میرا حال یہ ہو گیا کہ بس ہر وقت لکھتا رہتا ہوں، اس سے قبل مضامین وغیرہ نہیں لکھتا تھا، اس کے بعد ہی سے لکھنا شروع کر دیا۔

اسی طرح مولانا نے احقر کو یہ بھی سنایا کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں سہارن پور گیا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حدیث شریف کی کوئی کتاب پڑھایا کرو، مولانا فرماتے ہیں کہ اس سے قبل میرے ذمہ حدیث شریف کی کوئی کتاب نہیں تھی، اس کے بعد جب مدرسہ گیا تو میرے متعلّق حدیث شریف کی کتاب کا سبق آیا۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے تعلق سے مولانا اور بھی بہت سے واقعات سنایا کرتے تھے۔ یہاں بطورِ نمونہ ایک دو واقعات پر اکتفا کیا گیا ہے۔

مولانا کا حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے جو تعلق تھا اس کا اندازہ ''شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب رحمۃ اللہ علیہ'' نامی کتاب سے بخوبی ہو جائے گا۔ نیز حضرت مولانا نے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو چند خطوط بھی تحریر فرمائے تھے اُن سے بھی حضرت کے اُن سے قوی تعلق کا اندازہ ہوگا۔ یہ خطوط قارئین کرام کے فائدے کی خاطر یہاں نقل کرتا ہوں، ان خطوط کو احقر نے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے کمرے میں ایک بند الماری میں رکھے ہوئے ڈِبّے میں سے حاصل کیے ہیں، اس ڈِبّے میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اکابر اور کچھ محبین کے خطوط محفوظ کیے تھے، وہ خطوط حسب ذیل ہیں:

باسمہٖ تعالیٰ

حضرت مخدومِ مکرّم، مربیٔ جلیل دامت برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے کہ بہ صحت و عافیت ہوں گے، حضرت والا سے ماہِ مبارک کی بابرکت ساعتوں میں خصوصی دعا و توجّہ کی درخواست ہے۔ گذشتہ دو سالوں سے اعتکاف (عشرۂ اخیرہ) کی سعادت حاصل ہو رہی ہے، اس بار بھی ارادہ ہے۔

اللہ کا نام لے کر ''تاریخ اصلاح وسلوک'' کے کام کا آغاز کر دیا ہے، پہلا باب سیرتِ پاک، حالاتِ خلفائے راشدین، حضرات حسنین وسیّدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہم کے احوال پر ہے، دوسرا باب تابعین پر بھی شروع کر دیا ہے، حضرت اُویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ سے شروع کیا ہے۔

رمضان کے تکیہ کے معمولات میں حضرت مولانا محمد رابع صاحب کا درسِ قرآن پاک اور مولانا سیّد عبداللہ حسنی صاحب کا درسِ حدیث قابل ذکر ہیں، علماء وصلحاء کے لیے مولانا عبداللہ حسنی صاحب نے ''الفوز الکبیر'' کا درس بھی شروع کیا ہے۔

باقی احوال لائق شکر ہیں، مولانا بلال صاحب، حاجی عبدالرزاق صاحب اور عزیزان سید شارق حسنی، شوکت کشمیری اور عاصم برمی سلام ودُعا عرض کررہے ہیں۔

مولانا ثناء الحق صاحب ندوی (کاتب حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ) ایک مقدمے میں پریشان ہیں، بڑا خرچ بھی ہورہا ہے، خصوصی دعا کے لیے عرض کررہے ہیں۔

والسلام

محمود حسن حسنی

۱۴۲۷ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مخدوم ومعظم سیّدی ومولائی حضرت اقدس دامت برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت والا کی خدمت عالیہ میں چند دِنوں پہلے برادرم زکریا غوری کے ذریعے ایک خط ارسال کیا تھا، یہ خط بھی دعا کے لیے ارسالِ خدمت ہے، معراج الحق ندوی بنگال کے حاضر خدمت ہورہے ہیں، انھوں نے پہلے ضیاء العلوم میں پڑھا تھا، پھر ندوہ سے فراغت کی اور دارالعلوم دیوبند میں بھی ایک سال لگایا، اب یہ بنگال میں رہ کر تعلیم وتبلیغ کا کام کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت والا! ادھر سات آٹھ ماہ حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدّظلہم اور حضرت مولانا محمد واضح صاحب کے ساتھ سفر وحضر میں ساتھ رہنا ہوا، مولانا محمد واضح صاحب نے حضرت سید صاحب شہید قدس سرہ العزیز پر عربی میں کام مکمل کرلیا ہے، کمپوز بھی ہوگیا ہے، وہ "رِجَالُ الفکرِ وَالدِّیْنِ" کا آخری حصّہ ہوگا، ان شاء اللہ۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا کو ہی اس سلسلۂ رجال کی تکمیل کی وصیت فرمائی تھی۔

فی الوقت ہم ضیاء العلوم تکیہ ہی میں پڑھا رہے ہیں، مشکوٰۃ شریف میں دعوات، بیوع، وراثت وغیرہ ابواب ذمّے کیے گئے ہیں، اس سلسلے میں بھی آپ سے دعا کی درخواست ہے۔

حضرت! زندگی سنّت کے مطابق نہیں گزر پارہی ہے، اس کا بڑا قلق رہتا ہے، اس کا بڑا تقاضا پیدا ہورہا ہے کہ "شمائل ترمذی" آپ کی خدمت میں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوجائے، تو آپ کے سفر حج کے بعد ان شاء اللہ حاضری کی کوشش کروں گا۔

والسلام

محمود حسن حسنی

ذوالقعدہ، ۱۴۲۴ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت اقدس سیّدی ومخدومی حضرت مولانا محمد یونس صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے کہ حضرت والا کے مزاجِ گرامی بعافیت ہوں گے۔ عرضِ خدمت یہ ہے کہ ناکارہ کا ظاہر وباطن بڑا ناگفتہ بہ ہے، دُعا اور توجّہ کی درخواست ہے۔ حضرت

اقدس مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر ان کی کتابوں کے ہندی مترجم جناب محمد حسن انصاری صاحب کے قلم سے ایک کتاب آئی ہے وہ برادرِ عزیز محمد معاذ کاندھلوی صاحب کو دی تھی کہ کسی سہارن پور جانے والے کے ہاتھوں آپ کو پہنچا دیں، لیکن معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کتاب آپ تک پہنچ پائی یا نہیں۔

دوسری بات یہ عرض ہے کہ مظفرنگر کے سادات میں ایک عزیز طالب علم نے رائے بریلی کے مدرسے میں چار سال تعلیم حاصل کی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اخلاقی تعلق بھی قائم کرلیا اور جب حضرت کا وہاں قیام ہوتا تو وہ پابندی سے خدمت کی سعادت بھی حاصل کرتے اور اچھا وقت گزار رہے تھے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بھی اُن پر بڑی توجّہ تھی جس پر دوسروں کو رَشک بھی ہوتا تھا، چوں کہ انھوں نے احقر سے پڑھا بھی تھا اس لیے وہ مجھ سے بھی تعلق رکھتے تھے اور بات مانتے تھے، ایک تو سادات میں سے ہونے کی وجہ سے، دوسرے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق کی وجہ سے اور ہونہار ہونے کی وجہ سے میں بھی ان کا خیال رکھتا تھا۔

لیکن خصوصاً حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کے اندر وہ تغیّر آیا جس کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، لغویات اور فضولیات میں ہی نہیں بلکہ بیہودہ کاموں کے قریب جانے لگے اور سنیما بینی کے ایسے عادی ہوگئے کہ عادت چھڑانے میں بڑی مشکل پیش آئی، فکر اور سوچ میں سطحیت آگئی، کھیل دیکھنے اور سننے کی ایسی لت پڑگئی کہ چھوٹنا مشکل ہوگیا، جمود پیدا ہونے لگا، ہر مخلص نے سمجھایا لیکن وہ اڑے رہے اور یہ کہتے ہیں کہ ہم کو خوب معلوم ہے کیا بھلا ہے اور کیا بُرا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق کی بنا پر ہر ایک ان کا خیال بھی کرتا ہے اور اُن کی ترقّی چاہتا ہے، ان کے والدین ان کے لیے مخلص ہیں، والد صاحب کی جائداد ہے اور گاڑی چلتی ہے جو ان کا ذریعۂ معاش ہے،

والدہ بھی بڑی نیک خاتون ہیں، دُعاؤں کا خوب اہتمام کرتی ہیں اور دو رکعات نماز ان کے لیے پڑھتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے نیک کام لے۔ میں نے ان سے کہا کہ تم حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ سے تجدید بیعت کرلو، اس کو وہ اپنے مناسب سمجھتے ہیں، لیکن ابھی تیار نہیں ہیں، چاہتے ہیں کہ جو جی میں آئے وہ کر گزریں اور شوق پورے کریں، عمر بیس سال کی ہے، ہم نے اُنھیں آپ سے کئی بار ملایا بھی ہے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے ایک بار فرمایا کہ تم سے ہم کو انس اور تعلق ہے، خاندانی طور پر بھی اور یوں بھی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ ان کو دیتے دلاتے بھی بہت تھے، آخر کے دو رمضان بھی انھوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ گزارے، ہفتم عربی میں زیر تعلیم ہیں، ذہین ہیں، مشائخ کو خصوصاً حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندانی بزرگوں اور اپنے خاندانی اسلاف کو پابندی سے یٰس شریف پڑھ کر ثواب پہنچاتے ہیں، اس میں ان کا ناغہ نہیں ہوتا، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں، انھیں آپ سے بھی خاص تعلق ومحبّت ہے، یہ اپنا حال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کرتے تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے چھ سات خطوط بھی ان کے نام ہیں، میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بات کہہ لیا کرتا تھا اور بہت سے مسائل تو خدمت میں جا کر حل ہو جایا کرتے تھے، ہم نے ان کی طرف بڑی توجّہ کی تھی، لیکن اب کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آتا، زجر و توبیخ اور سختی اختیار کی، شفقت و ملاطفت کا راستہ بھی اپنایا، لیکن اب کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آتا، آپ سے دُعا اور رہنمائی کی درخواست ہے۔

برادرِ گرامی مولوی عبدالسلام صاحب بھٹکلی کے بدست یہ عریضہ ارسال ہے، اگر اُن کے ذریعے آپ کے قلم سے چند سطریں موصول ہو جائیں تو وہ ہمارے لیے تقویت وتسکین کا باعث ہوں گی، ہم نے جوان کی فکر کی اور حضرت کو ان سے جو تعلق

تھا اس بنا پر یہ فکر ہے، کبھی کبھی خاصا اثر پڑتا ہے۔

باقی حالات بدستور ہیں، حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدّظلہٗ سفر جنوبی افریقہ اور حجازِ مقدّس سے کل بمبئی تشریف لے آئے اور دہلی کے راستے سے جمعہ کو یہاں پہنچ رہے ہیں، جاتے وقت انھوں نے آپ کی خدمت میں دُعا کے لیے لکھنے کو کہا تھا اور ہم نے عریضہ ارسال بھی کر دیا تھا، دُعا فرمائیں کہ سفر مؤثر ثابت ہو۔

ماموں حمزہ، ماموں بلال خصوصیت سے سلام عرض کر رہے ہیں اور برادرم ابرار الحق متعلّم دار العلوم دُعا کے لیے کہتے ہیں۔

رسالہ ''تعمیر حیات'' اور ''بانگ درا'' حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پر نمبر نکال رہے ہیں، دُعا فرمائیں کہ مفید ثابت ہو، آپ کی تحریر موصول ہو جاتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

والسلام

خادم

محمود حسن حسنی ندوی

حال: دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۸ ؍ ربیع الثانی ؍ ۱۴۲۱ھ

مطابق: ۱۱ ؍ جولائی ؍ ۲۰۰۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت حضرت مخدوم مکرّم و معظم دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے کہ مزاجِ عالی بعافیت ہوں گے۔ عرض خدمت یہ ہے کہ ہمارے بھائی

مولوی مسعود حسنی ندوی سلّمہٗ کا نکاح اس ماہ شوال میں طے ہوا ہے، ولیمہ ۱۷ر شوال المکرم کو ہے۔ دادا صاحب جناب سیّد محمد مسلم حسنی صاحب کی طرف سے ولیمہ ہے، اُنھیں آپ سے جو تعلق ہے اس بنا پر ان کی خواہش تھی کہ آپ کی شرکت سے یہ تقریب سعید ہوتی، دادا صاحب اور ہم سب کی اس موقع پر خصوصیت سے دعا کی درخواست ہے۔

نکاح عم مکرم جناب سید حسین حسنی صاحب کی دختر کے ساتھ ہونا طے پایا ہے، جو کہ آپ کے ساتھ پانچ سال قبل حج میں تھے اور دادا صاحب سید مسلم حسنی صاحب دام مجدہ کے ہمراہ گئے تھے، وہ بھی سلام عرض کرتے ہیں اور دعا کے لیے کہتے ہیں۔

والسلام

نیازمند

محمود حسن حسنی

دائرہ شاہ علم اللہ، تکیہ کلاں، رائے بریلی

۶ر شوّال المکرّم ر ۱۴۲۳ھ

باسمہٖ سبحانہ وتعالیٰ

مخدومِ محترم ومکرّم حضرت شیخ عمت فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے کہ مزاجِ عالی بعافیت ہوں گے۔ مکہ معظّمہ اور مدینہ طیبہ میں حضرت والا کے ساتھ جو چند ساعتیں گزارنے کو ملیں اس کو اپنے لیے نعمت عظمیٰ سمجھتا ہوں، پھر واپسی میں جہاز بھی ایک تھا جو بڑا ہی باعث تسکین وتقویت ہوا، بڑی تمنا تھی، اللہ تعالیٰ

نے یہ سہولت پوری فرمادی۔

حج جیسے مقدس فریضے کی ادائیگی کی اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی، حضرت والا دُعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ قبول بھی فرمالے۔

حضرت والا! حج کے بعد جیسی زندگی گزارنی چاہیے ویسی گزرتی نظر نہیں آرہی، حال بڑا خراب ہے، حضرت والا سے خصوصی دُعا اور توجہ کی درخواست ہے۔

حج سے واپسی پر ایک خواب دیکھا تھا کہ اذان دے رہا ہوں اور پوری اذان دی، کیا اس میں ہمارے لیے کچھ پیغام ہے؟

باقی حالات لائق شکر ہیں، دادا صاحب سیّد مسلم حسنی زید مجدہ کی طبیعت بھی ٹھیک ہے، وہ سلام کہتے ہیں، بلال ماموں دُعا کے لیے عرض کرتے ہیں اور سلام کہتے ہیں۔ عزیزی خلیل احمد گجراتی سلّمہٗ حاضر خدمت ہو رہے ہیں، یہاں ششم عربی (درجۂ مشکوٰۃ) میں ہیں، ذہین اور محنتی ہیں۔ ان کے ذریعے یہ رقعہ ارسالِ خدمت ہے۔

حضرت مولانا محمد طاہر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلّق ایک خصوصی اشاعت بھی ارسالِ خدمت ہے۔

والسلام

محمود حسن حسنی ندوی

ان خطوط سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا اپنے اکابر سے کس طرح استفادہ کرتے تھے، احقر کو بھی مولانا بار بار یہ کہتے تھے کہ تم بھی حضرت اقدس مولانا سید محمد رابع الحسنی صاحب دامت برکاتہم کو خط لکھا کرو، جب احقر حضرت کے نام خط ارسال کرتا تو اس سے قبل مولانا سے دریافت کرتا کہ کیا لکھوں؟ مولانا بتاتے کہ یہ

لکھو، وہ لکھو، اس طرح میں خط لکھتا رہا اور حضرت اقدس مولانا سید محمد رابع صاحب دامت برکاتہم سے تعلق میں مضبوطی اختیار کرتا گیا۔

ایک مرتبہ احقر نے حضرت کے نام خط لکھا، جس میں لکھا کہ مولانا محمود صاحب کو سلام مسنون پیش فرمادیں، جب یہ خط حضرت کے پاس پہنچا تو مولانا کا احقر پر فون آیا کہ اس طرح خط میں بڑوں سے سلام نہیں کہلواتے، یہ بے ادبی ہے۔

مولانا جہاں بڑوں سے ربط کرواتے تھے وہیں اس دربار کے آداب بھی بتاتے تھے، مولانا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی باتیں، یادیں اور خصلتیں تو بہت ساری ہیں، مضمون طویل ہوتا جارہا ہے۔ مولانا سے صرف چار سال تعلق رہا ہوگا اور دو بار ملاقات، فون پر گفتگو ہوتی تھی، بعض مرتبہ فون سے رابطے میں کچھ مدت ہوجاتی تو مولانا فون پر کہتے کہ کیا آپ ہم سے ناراض ہیں؟ احقر کہتا: حضرت! آپ سے ناراض ہوکر ہم اپنا ٹھکانہ جہنّم میں کیوں بنائیں؟ احقر یہ اس لیے کہتا کہ مولانا کا تعلق سید گھرانے سے تھا، جن سے تعلق رکھنا حب نبوی کا تقاضا ہے۔

مولانا مرحوم میں ایسی ایسی ادائیں تھیں جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا، وہ لوگوں کو اپنے بڑوں سے مربوط رکھتے اور چھوٹوں کو اپنے دینی کاموں میں شریک فرماتے، ان کا اپنے اکابر سے گہرا ربط تھا، خصوصاً سید السادات حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت کو اپنا شیوہ بنانا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بعد حضرت اقدس مولانا سیّد محمد رابع صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں مسلسل رہنا، اسی طرح گاہے گاہے وقت کے اکابر کی خدمت میں تشریف لے جانا۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ مولانا مرحوم کی خدماتِ جلیلہ کو قبول فرما کر ان کے لیے نجات کا ذریعہ بنائے اور جنّت الفردوس میں ان کا ٹھکانہ ہو۔ آمین!

قافلۂ عَلَمِ الٰہی کا مسافر

مولانا محمد سمعان خلیفہ ندوی
(استاد جامعہ اسلامیہ۔بھٹکل)

مولانا سید محمود حسنی ندوی کو ہم لوگ اپنے حلقۂ احباب میں مردِ قلندر کے نام سے یاد کرتے تھے، وہ یقیناً مردِ قلندر تھے، ایک باصفا درویش تھے، ایک تارک الدنیا زاہد تھے، اربابِ تصوف وسلوک کے عُشّاق میں شامل اور کاروانِ ایمان وعزیمت کی نگاہوں کے گھائل تھے، لگتا ہے وہ آخرت ہی کی تیاری کے لیے پیدا ہوئے تھے، جب بولتے تو آخرت کے موتی رولتے، تاریخ تصوف وسلوک کی پرتیں کھولتے، اخلاص اور اتباع شریعت کی دعوت دیتے، بزرگوں کا ذکرِ خیر کرتے، عجب استغنائی شان پائی تھی، اپنے بڑوں کی بے حد تکریم کرتے، اپنے چھوٹوں کی مبالغہ کی حد تک ہمت افزائی کرتے، کتنوں کو مصنف بنایا، کتنوں کو لکھنے کا ہنر سکھایا، کتنوں کو اپنے بڑوں سے استفادے کے قابل بنایا۔ مجھے ذاتی طور پر اس کا تجربہ ایک دو بار نہیں بیسیوں بار ہوا، کم از کم بائیس سال سے میں نے مولانا کو دیکھا اور ہمیشہ اسی طرح پایا۔
میرے تعلقات کا آغاز سن ۲۰۰۰ء میں جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں منعقد ہونے والا

ادب اطفال پر سیمینار ہے، جو زندگی کا ایک ہم سنگ میل تھا، بڑے بڑوں سے ملاقات اسی بہانے ہوئی اور اب ان میں سے کتنے آخرت کو سدھار چکے، اس موقع پر مولانا محمود حسنی سے تعلق قائم ہوا، انھیں کے اصرار پر مہمانوں سے ڈائری پر کچھ نصیحت لکھوانے کا سلسلہ قائم ہوا اور پھر آنے والے وقت میں ان کی تحریریں یادگار ثابت ہوئیں، بڑے بڑوں کو لکھے گئے خطوط بھی بڑی حد تک مولانا مرحوم کے تشجیعی کلمات کے مرہون ہیں اور پھر ان بزرگوں کے جوابات خود ایک بیش قیمت سرمایہ ہیں، انھی دنوں مولانا کا سفر قادیان اور اس کی پوری روداد ایک ایسے طالب علم کو ذاتی طور پر کئی ایک صفحات پر مشتمل خط میں لکھ کر بھیجی جو ابھی عالیہ اولیٰ یا عالیہ ثانیہ میں زیر تعلیم اور ان کے شناساؤں کے حلقے میں نیا نیا شامل ہوا تھا۔ پھر اس کے بعد ندوے کے زمانۂ طالب علمی اور رائے بریلی کے قیام کے دوران میں ان کی محبتوں اور شفقتوں سے مستفید ہونے کے بار بار مواقع میسر آئے، فضیلت کے آخری سال رائے بریلی کے تربیتی کیمپ میں مولانا مرحوم کی طرف سے جو انتہائی شفقت کا معاملہ ہوا اور احادیث مسلسلہ کی قرأت کے لیے اس طالب علم کو تنہا موقع فراہم کیا گیا یہ تو زندگی میں سعادت وخوش بختی کا سنہرا موقع تھا۔

انھی دنوں غالباً کسی رمضان المبارک میں مولانا محمود صاحب نے اپنے وہ روزنامچے پڑھنے کو دیے جن میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کے مجلسی افادات کا ایک بیش بہا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، یہ ڈائریاں بڑے کام کی ہیں۔

مولانا محمود صاحب باہمہ بھی تھے بے ہمہ بھی تھے، سب سے جدا بھی تھے سب کے رفیق بھی تھے، ان کا جسم اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے محوِ تگ وتاز اور روح کمالاتِ معرفت کے حصول کے لیے محو پرواز تھی، رزم ہو یا بزم، پاک دل وپاک باز تھے، محفل ہو کہ تنہائی، ان کا دل اپنے خالق سے مناجات میں مصروف اور اذکار کی لذت

سے نفس کے حجابات کو چاک کرنے میں مشغول تھا، خلوت ہو کہ جلوت، وہ سالکِ راہِ طریقت اور واقفِ اسرارِ شریعت تھے، خود آگاہ وخدا آگاہ تھے۔ مظہرِ تسلیم ورضا اور پیکرِ اربابِ وفا تھے، مشکوٰۃِ نبوت سے جو چراغ جلا اور عہد بہ عہد زمانے کی چیرہ دستیوں سے جس کی حفاظت کی جستجو میں اہل اللہ اور علمائے ربانیین کوشاں رہے اس کی روشنی سے آپ کا قلب بھی منور تھا، اربابِ تصوف وسلوک سے بے حد محبت تھی، اسی لیے ان کی تاریخ بھی لکھی۔

مولانا محمود صاحب علم کے عاشق تھے، کتابوں کے رسیا تھے، زودنویس تھے، قلم میں روانی تھی، چلتا تو رکنے کا نام نہ لیتا، سفر وحضر، بیماری وصحت ہر حال میں یہاں تک کہ سواری کی پشت پر اور ریلوے اسٹیشنوں میں ٹرین کو سامنے آتا دیکھ کر بھی لکھنا پڑھنا آپ کا شیوہ اور وتیرہ رہا۔ خود میری آپ سے آخری گفتگو بھی امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کی کتاب ''موجِ تسنیم'' اور مولانا شہباز اصلاحی مرحوم پر ان کے مضمون سے متعلق ہوئی تھی۔ قریب سے جن لوگوں نے آپ کو دیکھا ہے سبھی اس کی گواہی دے سکتے ہیں، یہاں تک کہ مرض الوفات میں بھی آپ نے فضائل درود وسلام پر ایک رسالہ مرتب کیا جو ان شاء اللہ ان کے لیے مغفرت وورحمت کی سوغات بھی ثابت ہوگا۔

حضرت مفکرِ اسلام علیہ الرحمۃ کی صحبتوں سے آپ خوب مستفید ہوئے اور پھر آپ کے بعد آپ کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے تو ایسے دست گرفتہ ہوئے کہ سفر وحضر میں کبھی ساتھ نہ چھوڑا، خود مجھ سے ایک موقع پر فرمایا کہ حضرت مفکرِ اسلام علیہ الرحمہ کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی دامت برکاتہم کی رفاقت میں عمرے کا جو پہلا سفر ہوا اس میں بدر کے میدان میں حاضری پر میں نے اللہ سے ایک دعا مانگی تھی کہ اللہ تعالیٰ بس مرتے دم تک

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی دامت برکاتہم کے دامن سے اور آپ کی خدمت سے وابستہ رکھے۔ یہ دعا شاید حضرت حق میں قبولیت سے باریاب ہوگئی اور مرتے دم تک آپ اسی پر قائم رہے۔

مولانا بڑوں کے بڑے قدردان اور چھوٹوں پر بے حد شفیق تھے، چھوٹوں کی ترقی پر بے انتہا خوش ہوتے، قلم پکڑ کر لکھنا سکھاتے، پتہ نہیں کتنوں نے لکھنے کا سلیقہ آپ سے سیکھا، کتنے مصنف و محقق بنے۔ حیات مستعار کے لمحات گزار کر اب آپ مالک حقیقی کے پاس پہنچ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کی خدمات کو قبول فرمائے اور اپنی رضا کا پروانہ ہم سب کو عطا فرمائے۔ آمین!

ضمیر پاک ونگاہ بلند ومستی شوق

مولانا محمد اعظم ندوی
(استاذ حدیث وفقہ المعہد العالی الاسلامی-حیدرآباد)

۱۳؍محرم الحرام ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۲؍اگست ۲۰۲۲ء، جمعہ کی صبح میرے ایک اور مشفق ومحبوب استاذ اپنے مالک حقیقی سے جاملے، کہتے ہیں مولانا عرصہ سے بیمار اور خانہ نشیں ہو گئے تھے اور شمع حیات کی لو مدھم پڑنے لگی تھی، یہ سانحہ بہ ظاہر موت وحیات کی اس کشمکش کا اختتام تھا، لیکن حق یہ ہے کہ یہ حیات جاودانی کی صبح دوام کا پیام تھا، اللہ نے اپنے ایک نیک بندے کو اپنے پاس بلالیا، یہ اس کا فیصلہ تھا، جو واپس لے لیا جائے وہ اس کا حق، جو عطا کردیا جائے وہ اس کی نوازش، اور ایک وقت تو ہر چیز کے لیے موعود ومقرر ہے، یہ غم ناک تذکرہ ہے میرے استاذ محترم مولانا محمود حسن حسنی ندوی رحمہ اللہ کا، جن کی شخصیت میں نہ جانے کتنے جوہر بے تاب تھے اور دل بے تاب میں کیسا اضطراب تھا کہ بار بار اسی ایک در پہ چلے جاتے تھے جس در سے کوئی دور ہوا تو در بدر ہو کر رہ گیا اور 'اللہ اللہ' کی ضربیں لگا کر آنکھوں کے قطروں کو گوہر اور دل بے قرار کو اور مضطر بناتے تھے، اسی کیفیت میں زندگی کے آخری ایام بھی

گزرے، مرض کی شدت کے باوجود مولانا اکبرالہ آبادی کی زبان میں گویا کہہ رہے تھے کہ:

ہر چند بگولہ مضطر ہے ایک جوش تو اس کے اندر ہے
اک وجد تو ہے اک رقص تو ہے بے چین سہی برباد سہی

مولانا ایک بافیض مدرس تھے، جن کی نظر نصاب کی تکمیل اور لفظ لفظ گھول کر پلانے سے زیادہ مقصود اور مدعا پر رہتی تھی، جن کے یہاں اہمیت محض تعلیم اور طوطی وبلبل کی مانند لفظوں کو رٹنے رٹانے سے زیادہ فکری وروحانی تربیت پر تھی اور وہ جن چیزوں کی اہمیت اپنے علم ومطالعہ کی روشنی میں سمجھ لیتے تھے، ان کو جذب کر لیتے تھے، ان میں رچ بس جاتے تھے اور بے چین رہتے تھے کہ کیسے یہ باتیں اپنے شاگردوں میں منتقل کردیں اور وہ اس میں کامیاب ہوتے تھے۔ وہ سوانح نگاری اور تاریخ اسلام کے مطالعہ کا نکھرا ہوا صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے، حوادث ووقائع اور شخصیات ورجال کی تاریخیں ان کو باضابطہ یادرہتی تھیں، وہ اپنے تاریخی مطالعہ کو تجزیاتی اور تقابلی انداز میں پیش کرنے میں بھی مہارت رکھتے تھے، اپنے نانا جان مشہور شاعر وسخن ور حضرت مولانا محمد ثانی حسنیؒ، محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقیؒ اور متعدد بزرگوں کی سوانح عمریاں ترتیب دیں۔ وہ صحافی تھے، ادارت کا بھی طویل تجربہ تھا، ندوۃ العلماء کے آرگن پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، ماہنامہ ''رضوان'' لکھنؤ اور ''پیام عرفات'' رائے بریلی وغیرہ سے ان کا کسی نہ کسی حیثیت سے ادارتی ومشاورتی تعلق رہا اور بطور خاص مخدوم گرامی قدر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سفروں کی روداد بڑی خوبصورتی، اختصار اور جامعیت کے ساتھ قلمبند کرتے تھے۔ مولانا پرجوش مقرر تھے، ان کے یہاں طلبہ وعلماء کو صاحب عزیمت بنانے اور

اپنی زریں تاریخ سے روشنی حاصل کرتے ہوئے خود کو سنوارنے اور نکھارنے پر بڑا زور ہوتا تھا۔ مولانا صوفی باصفا اور درویش خدا مست تھے، ذکر جہری بھی کرتے تھے، وہ بھی اس ذوق ومحبت کے ساتھ کہ لگتا تھا ان کے اردگرد کا پورا ماحول ذاکر ہوگیا، زمزمۂ توحید سے گونج اٹھا اور سازِ تکبیر سے جھوم اٹھا، ایسی یکسوئی اور حضوری آسانی سے میسر نہیں آتی، یہ قلندرانہ ادائیں ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی تھیں، خاص طور سے ماہ رمضان المبارک میں عصر کے بعد مولانا کی کیفیت دیدنی ہوتی تھی، کسی شیخ کامل کا مرید ہونا اور بات ہے، لیکن اس کی ہدایات پر پابندی سے عمل کرنا، پھر وجد وکیف سے سرفراز ہونا سالک کے ساتھ خدا کا خصوصی فیضان ہے، جو ہر ایک کو کہاں میسر! مولانا کے پاس بیٹھ کر محسوس ہوتا تھا کہ ہم جن بکھیڑوں اور جھمیلوں میں الجھے ہوئے ہیں، جس عزت وشہرت، جاہ ومنصب اور مال ودولت کی تلاش میں سرگرداں ہیں وہ ایمان، علم وتحقیق اور عبادت کی حلاوت کے سامنے ہیچ اور بہت ناقابل اعتبار ہے:

نہ تخت وتاج میں نے لشکر وسپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

مولانا سے میں نے مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور، تکیہ کلاں، رائے بریلی سے بہ حیثیت ایک نوعمر طالب علم وابستہ ہوتے ہی ثانویہ ثانیہ میں ''فارسی کی پہلی'' پڑھی تھی، مولانا نے ایک دو درس سے اندازہ لگالیا تھا کہ مجھے فارسی کی شد بد ہے، چونکہ میں نے مدرسہ حسینیہ، کڈرو رانچی (جھارکھنڈ) میں حفظ کے بعد فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھی تھیں اور چونکہ یہ طفلانہ سا مضمون تھا، تو مولانا نے مجھے ہی حکم فرما دیا تھا کہ تم ہی پڑھا کرو، وہ کہیں کہیں رہنمائی فرما دیا کرتے تھے، یہ مولانا سے طالب علمانہ تعلق کی پہلی منزل تھی، ثانویہ رابعہ میں گیا تو القراءۃ الراشدہ (جلد ثالث) کی تدریس مولانا

کے ذمہ تھی، یہ عربی زبان کی ایسی کتاب ہے جو طالب علم کو عربی زبان سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ عربی ادب کے مرحلہ میں داخل کرتی ہے، اس میں ''نزھۃ الخواطر'' اور اس جیسی بڑی کتابوں سے ماخوذ مضامین بھی اچھی خاصی تعداد میں ہیں، جن کا معیار فکری اور معلوماتی اعتبار سے بہت بلند ہے، میں محسوس کرتا تھا کہ مولانا کو ان مضامین سے زیادہ لگاؤ تھا، وہ یقیناً الفاظ ومعانی کی مشق بھی کراتے تھے، لیکن ان پر غلبہ اس بات کا تھا کہ فکری وروحانی غذائیں طلبہ میں منتقل ہوجائیں، وہ شخصیات وتحریکات، بڑے اداروں اور بلند ارادوں کی اہمیت کو سمجھیں اور ان پر مولانا کی تقریر عاطفہ سے بھر پور ہوتی تھی، تاریخ کے بغیر تو ایک لقمہ نہیں توڑتے تھے، جہاں کہیں کوئی تاریخی پہلو آگیا پھر دیکھئے جولانیٔ طبع:

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

سچ یہ ہے کہ انہوں نے طلبہ میں شعور وآگہی کی روح پھونک دی تھی اور واقعی ''شورش عندلیب'' میں وہ قوت اور کشش تھی کہ دل ہمیشہ کچھ کر گزرنے پر آمادہ ہوتا تھا اور خاموشی کے ساتھ مقصدیت کی ایک شمع دل کے ظلمت خانہ میں روشن رہتی تھی، صوفیائے کرام کے تذکرہ پر مولانا وجد میں آجاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم وعرفان کے مے خوار ہی نہیں، سرتاپا محبت میں سرشار ہیں، کبھی کبھی اپنی گفتگو میں ہر ہر فقرہ کو درد واثر سے بھر دیتے تھے، آخر سال میں جب نصاب اپنے مطلوبہ مقدار سے کچھ کم تھا، مولانا بعد نماز مغرب بھی پڑھاتے تھے اور تقاضا تیز رفتاری کا تھا، اس کے باوجود جب ذکر جامعہ ازہر، ندوہ، دیوبند وغیرہ کا آگیا، تو پھر ان اداروں کے سلسلہ میں بہت سے مفید اضافے فرماتے تھے، اس وقت ایسے بعض موضوعات پر اور زیادہ

بلند آہنگ ہوجاتے تھے، اس طرح مولانا سے زبان وادب اور ''سخن دلنواز'' کے ساتھ ''نگاہ بلند'' اور ''جان پرسوز'' کسے کہتے ہیں، یہ بھی اپنی عمر اور صلاحیت کے مطابق اخذ کر پایا، اوروں کا حال نہیں معلوم، لیکن مجھے بعد کی زندگی میں بارہا وہ تاریخی، سوانحی اور ادبی وفکری نکات یاد آئے جن سے روشنی حاصل ہوئی، ثانویہ خامسہ میں مولانا نے حدیث میں حضرت مولانا عبدالحی حسنی رحمہ اللہ کی ''تہذیب الاخلاق'' پڑھائی، وہاں بھی مولانا کا یہی رنگ تھا، حدیث کے ساتھ ساتھ تاریخ حدیث اور رجال حدیث پر بھی اچھی خاصی گفتگو ہوتی تھی، استاذ محترم مولانا ابوسحبان روح القدس صاحب حفظہ اللہ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی ''روائع الاعلاق'' نئی نئی آئی تھی، کئی دن اس پر مولانا کے لکچرز ہوئے اور خصوصاً علماء بہار کی خدمات حدیث پر جو مولانا نے ایک مفصل مضمون تہذیب الاخلاق کی اس شرح میں لکھا ہے، مولانا محمود صاحب نے اس کا خلاصہ بھی بیان فرمایا اور اس خطہ کے طلبہ کو احساس دلایا کہ تمہاری کیا تاریخ تھی اور اب کیا ذمہ داریاں ہیں، مولانا کا نمایاں وصف طلبہ کی ذہن سازی تھا، وہ صرف درس کو کافی نہیں سمجھتے تھے، جب تک کہ فکر رگ ساز میں رواں نہ ہوجائے مولانا کو چین نہ آتا تھا، ان کی باتیں دلوں میں بس جاتی تھیں لیکن حیف اب:

کہاں سے لائے گی بلبل زباں میری دہن میرا

خارجی مطالعہ اور غیر درسی سرگرمیوں پر بھی مولانا بہت زور دیا کرتے تھے، فضول مٹرگشت طلبہ پر بہت برستے تھے اور کوئی جوہر قابل دیکھتے تو اس کو نکھارنا اور صیقل کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا، وہ انہیں علماء ومشائخ اور ہماری تاریخ کے ناموران قوم وملت کی مثالیں دے کر بار بار آمادہ کرتے کہ بامقصد بنو، کارآمد بنو، کہاں ادھر ادھر چلے جارہے ہو، جب کوئی طالب علم کہتا: جی مولانا! یا کچھ اس موضوع سے متعلق

تائیداً استفسار کرتا تو بڑے خاص انداز میں کہتے تھے: ''اور کیا!''، آپ فلاں کی تاریخ پڑھیں، فلاں کی سیرت پر غور کریں، دیکھئے لوگوں نے کیسے بڑے بڑے کام کیے ہیں، رخ متعین کریں، کبھی جوش میں درس ناتمام چھوڑ کر اٹھ جاتے، اس میں بے التفاتی کا شائبہ نہ تھا، یہ طرز خاص تھا، مجھے کئی بار کوئی بات سمجھاتے ہوئے میدان پور سے تکیہ کلاں کی طرف بڑھے اور ہاتھ پکڑ کر سمجھاتے رہے، پھر اچانک ہاتھ چھوڑ کر تیز رفتاری سے بڑھ جاتے، یہ معہود تھا کہ اب آپ کو مدرسہ لوٹنا ہے، مولانا کو کوئی کام یاد آ گیا اور چشم زدن میں تکیہ کلاں پہنچ گئے، کیا ادا تھی، اپنے ساتھ لے گئے مولانا، جب مولانا نے اپنی پہلی کتاب شاہ ابرار الحق صاحبؒ پہ لکھی تو مجھ کو اس کے ذیلی عناوین قائم کرنے کا حکم دیا اور رمضان میں تکیہ کے قیام کے دوران میں نے جب یہ کام مکمل کر کے پیش کر دیا تو بہت پسند فرمایا اور بار بار واہ بھائی واہ کہتے رہے، وہ بھی کوئی کام ہوا، کل ملا کر فہرست سازی، لیکن مولانا کا عجیب حال تھا، انہوں نے اس کو ایسا یاد رکھا کہ شاید کبھی ایسا ہوا ہو کہ ملاقات ہو اور یہ کہہ کر سب کے سامنے شرمندہ نہ کر دیں کہ انہوں نے مجھے مصنف بنا دیا، میں پانی پانی ہو جاتا تھا کہ یا اللہ! میں کیا جواب دوں! یہ محمود ہیں اور میں ایاز اور ایاز کو اپنی قدر معلوم ہے، لیکن وہ بس مولانا کی شان بے نیازی تھی، ایک بار میں نے حیدر آباد میں کوئی خدمت اپنے ذمہ لینی چاہی، کہا: نہیں بھائی رہنے دو، یہ کام ہو جائے گا، کس کس کا احسان لوں، میں احسان لینا نہیں چاہتا، مولانا بے نیاز طبیعت کے انسان تھے، جو کیفیت ان پر طاری ہوتی تھی اس کے اظہار میں انہیں باک نہ تھا، ان کی طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی تھی، کہیں پڑھا تھا کہ دنیا خودنگر و خود پرست واقع ہوئی ہے، لیکن مولانا اس دنیا کی بہت سی کج ادائیوں سے محفوظ تھے، غیبت کی مجلسوں سے کبیدہ خاطر ہو کر اٹھ جاتے، گپ شپ کے لیے ان

کے پاس فرصت نہ تھی، خوش طبع، شگفتہ مزاج، زندہ دل، قدر شناس اور ہنر پرور انسان تھے، کبھی زود رنج اور نازک مزاج بھی معلوم ہوتے تھے، پر تھوڑی سی معذرت پر صاف ہوجاتے تھے، ان کا گھریلو پس منظر ایسا تھا کہ چاہتے تو روپیوں کا مینہ برستا اور جھڑی لگ جاتی، لیکن وہ سادہ زندگی کے دلدادہ تھے، مال پر علم کو ترجیح دی اور ہمیشہ انیس کے اس حکیمانہ شعر پر عمل پیرا رہے کہ:

تمام عمر اسی احتیاط میں گزری
کہ آشیاں کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو

مولانا کا بڑکپن تھا کہ ہم جیسے خوردوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی فرماتے، حسب موقع تنبیہ بھی فرماتے، مخدوم گرامی حضرت مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ پر آپ نے کتاب مرتب فرمائی تو اس میں اپنے بہت سے شاگردوں کے مضامین سے بھی اقتباسات نقل کیے، میں بھی ان نصیبہ وروں میں تھا، مخدومنا المطاع حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی حفظہ اللہ ورعاہ کا قافلۂ شوق جب بھی حیدرآباد میں فروکش ہوتا، مولانا بہت سی تازہ طبع شدہ کتابوں کے نسخے عطا کرتے اور ان کی خصوصیات پر بھی کچھ نہ کچھ کہتے جاتے، کئی بار کہتے ہوئے سنا، میں کیا ہوں! مولانا رابع صاحب کی علمی معاونت کی برکت سے ان شاء اللہ میری بھی کچھ تصنیفات آجائیں گی اور جب آنے لگیں تو بھی اس کا اعادہ کرتے کہ یہ مولانا کی کتابوں پر تھوڑے بہت کاموں کی جو توفیق ملی اس کی برکت ہے اور یہ مکتب کی کرامت سے زیادہ مولانا کا فیضان نظر ہے۔

آخری ملاقات ابھی فروری ۲۰۲۱ء میں حیدرآباد میں ہوئی تھی، جب حضرت مولانا عبدالعزیز بھٹکلی صاحب دامت برکاتہم نائب مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مولانا تشریف لائے تھے، اسی موقع سے پیام انسانیت کی ایک نشست کے اختتام

پر میری مرتب کردہ کتاب ''کورونائی ادب'' کی رسم اجراء بھی انجام دی گئی تھی، اس وقت بھی مولانا نے چلتے چلتے مجھے بہت سی نصیحتیں کی تھیں، شاگرد زمانۂ طالب علمی کے اعتبار سے پرانے ہوجاتے ہیں اور مستقل رابطہ میں نہیں ہوتے تو اساتذہ بھی بسا اوقات کچھ کہنے میں تکلف کرتے ہیں، لیکن مولانا کو دیکھا، انہوں نے بعض خامیوں کی نشاندہی کی اور شجر سایہ دار سے پیوستہ رہنے پر زور دیا، اللہ مولانا کی نیکیوں کو زندہ اور خوبیوں کو باقی رکھے، کیسے کیسے یگانۂ روزگار اس خانوادہ سے اٹھے اور ابھی بھی ماشاء اللہ ایک قطار ہنر مندوں اور باکمالوں کی نظر آتی ہے، اللہ تعالیٰ سب سے کام لے اور ''نام نیک رفتگاں ضائع مکن'' کے مقولہ پر عمل کی توفیق سے نوازے۔ آمین!

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل

مولانا عبدالباری فاروقی
(استاد دارالمبلغین۔لکھنؤ)

دنیا میں بہت سے عظیم افراد آئے اور چلے گئے، انبیاء ورسل کے بعد صلحاء وصدیقین کا ایک سلسلہ جاری ہے، ہر زمانہ میں اللہ کے نیک بندے آتے ہیں اور دینی خدمات انجام دے کر مالک حقیقی کے دربار میں حاضر ہو جاتے ہیں، انہی صلحاء وصدیقین میں شمار ہوتا تھا مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ کا، ہر ہر موقع پر ان کے وہ فیصلے یاد آتے ہیں جو برجستہ فرمایا کرتے تھے اور اس کے ایسے نتائج ظاہر ہوتے کہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ یہ کوئی عام آدمی نہیں ہے، بلکہ عشق الٰہی میں ڈوبا ہوا عارف باللہ ہے اور ان کے بروقت فیصلے ”یرجوک تجارۃ لن تبور“ کا مصداق ہوتے اور دینی لحاظ سے نہایت مفید اور اثر انداز ہوتے تھے۔

ہم نے محمود بھیا کو بچپن سے دیکھا، ان کی طالب علمی کا دور بھی یاد ہے اور جب انہوں نے فراغت حاصل کی وہ وقت بھی، ان کا ایک ایک لمحہ ابا جان (مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ) کی خدمت میں گزرتا، ان سے بھرپور استفادہ کرتے اور بہت جلد ان کے چہیتے بن جاتے تھے، ان سے دعائیں

اور غیر معمولی توجہات حاصل کرتے اور استفادہ کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، بزرگوں کے تذکرہ سے ان کا چہرا کھل اٹھتا تھا، ایسے ہی جب کوئی دینی بات ہوتی تو چہرے پر بشاشت کے آثار نمایاں ہوجاتے تھے، ایک طرف دین سے حد درجہ لگاؤ تھا اور اس کے لیے سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتے اور دوسری طرف دنیا سے بے رغبتی و بے اعتنائی کا عالم یہ تھا کہ بادشاہ وقت کو بھی نظر انداز کردیتے تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کا آخری حج تھا اور مجھے بھی ان کے ساتھ کچھ وقت رہنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس وقت ان کی عزیمت پسندی اور اخلاص دیکھ کر میں حیران رہ گیا، وہ شاہی مہمان تھے اور ان کے لیے رہائش کے ساتھ ساتھ دیگر سہولیات بھی موجود تھیں، راہیں ہموار تھیں، وہ چاہتے تو آسان سے آسان حج کرسکتے تھے، لیکن بیماری کی حالت میں پورا حج پیدل کیا، حج کے دوران ان کو خبر ملی کہ بادشاہ وقت اپنے مہمانوں سے ملاقات کے لیے آنا چاہتے ہیں تو محمود بھیا فوراً اپنی رہائش گاہ سے نکل کر ہم لوگوں کے پاس آگئے اور کہنے لگے کہ اللہ نے ہم کو بچالیا، اگر ہم بادشاہ سے ملتے تو ہمارا اخلاص خطرہ میں پڑ جاتا۔

لکھنا پڑھنا ان کا مشغلہ تھا، خاص طور پر سوانح نگاری کے سلسلہ میں لوگ ان کی طرف رجوع کرتے تھے، ان کی زندگی کا اکثر حصہ کتابوں کے درمیان گزرا، امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ان کو بڑی گہری عقیدت تھی، دارالمبلغین لکھنؤ مسلسل آتے جاتے رہتے تھے، خاص طور پر وہاں کی لائبریری میں کافی وقت گزارتے اور بوسیدہ اوراق کو الٹتے پلٹتے رہتے تھے، انہوں نے ارادہ ظاہر فرمایا تھا کہ اگر زندگی نے وفا کی تو یہاں کی لائبریری میں کچھ تحقیقی کام کریں گے، لیکن قسام ازل کو یہ منظور نہ تھا، ان کی یہ خواہش پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی اور بہت کم عمری میں رب حقیقی کے پاس اپنی تمام خدمات جلیلہ کے ساتھ حاضر ہوگئے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور صلحاء وصدیقین کے ساتھ ان کا حشر فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

ایک محسن کی یاد میں

مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی
(نگراں شعبہ علمی انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز، نئی دہلی)

۱۱؍اگست ۲۰۲۲ءکو دہلی کے شاہین باغ قبرستان میں اپنے پڑوسی مشفق و محترم جناب ضیاء اللہ صدیقی ندوی کے جنازے میں شریک تھا۔ جنازے سے فراغت کے بعد ایک گوشے میں جا کر برادر محترم مفتی سید مسعود حسن حسنی ندوی سے ملاقات کی اور مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی کے بارے میں پوچھا۔ کیوں کہ کئی روز سے موصول ہونے والی خبریں تشویش میں اضافہ کرتی جا رہی تھیں۔ مسعود بھائی نے بتایا کہ وینٹی لیٹر ہٹایا گیا ہے۔ دیکھنا ہے کہ کیا صورت رہتی ہے۔ اس اطلاع سے کچھ امید بھی بندھی اور کچھ تشویش بھی بڑھی۔ آخرکار اگلے دن تشویش امید پر غالب آ گئی اور ہمارے مولانا دنیا سے چلے گئے۔

حشر تک اب زباں نہ کھولیں گے
تم پکارو گے ہم نہ بولیں گے

۲۰۰۲ء میں ہم ندوے پہنچے۔ اس وقت خانوادہ علم اللّٰہی کے ابھرے ہوئے

لوگوں میں سب سے کم عمر مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی تھے۔ میری طبیعت میں جھجھک اور تکلف حد سے زیادہ تھا۔ کسی طرح مولانا محمود حسنی سے ایک آدھ بار سلام ومصافحہ کرلیا۔ پھر کیا تھا؟ مولانا نے مقناطیس کی طرح اپنے سے قریب کرلیا۔ ابھی دو تین ہی ملاقاتیں ہوئی تھیں کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بظاہر معمولی لیکن اثر کے لحاظ سے غیر معمولی۔ ہوا یہ کہ ایک دن ندوے کی مسجد میں عصر کی نماز کے بعد میں دوسری تیسری صف میں بیٹھا تھا۔ پیچھے سے آواز آئی: مولانا اجمل فاروق صاحب! میں چونک کر مڑا تو کیا دیکھتا ہوں، مولانا محمود حسنی صاحب ایک دو طلبہ کے ساتھ کھڑے ہیں اور میرے اٹھنے کا انتظار کررہے ہیں۔ میں لپک کر اٹھا تو مولانا نے ان طلبہ سے تعارف کرایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ میرے لیے زندگی کا پہلا اتفاق تھا کہ کسی بڑے نے اتنی اہمیت دی تھی۔ کسی طالب علم کے لیے اس انداز کی حوصلہ افزائیاں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح ایک دن ندوے کی مسجد میں انھوں نے مجھے صدیق مکرم سید الیاس ہاشمی ندوی سے ملوایا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ آج سے آپ دونوں دوست ہیں۔ ایک دوسرے سے ملتے رہیے گا۔ افسوس! الیاس ہاشمی نے دنیا سے جانے میں کچھ زیادہ ہی جلدی دکھائی اور اب مولانا بھی رخصت ہوگئے۔

میرے اوپر مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی کے بہت سے احسانات ہیں۔ ان احسانات کو میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔ دل چاہتا ہے کہ آج صرف ان کے احسانات کا تذکرہ کروں۔ اس سے ان کی مخفی شخصیت کے کچھ پہلو بھی سامنے آجائیں گے اور میرے لیے ایک محسن کی احسان مندی کا ذریعہ بھی پیدا ہوجائے گا۔ امداد علوی حیدرآبادی کے بقول:

پلائے خم پہ خم احسان دیکھو
مجھے ساقی نے خم خانہ بنایا

میرے اوپر مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے مجھے مشاہیر سے قریب ہونے کے خوب مواقع فراہم کیے۔ اپنے شرمیلے مزاج کی وجہ سے میں ندوے میں اپنی عقیدتوں کے مراکز کو دور دور سے دیکھا کرتا تھا۔ مولانا محمود حسنی نے میرے کہے بغیر میرے لیے ان بزرگوں سے قریب ہونے کی راہیں ہموار کیں۔ اچھی طرح یاد ہے کہ استاد عالی مرتبت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کا پتے کا آپریشن ہوا تھا۔ یہ دسمبر ۲۰۰۳ یا جنوری ۲۰۰۴ کا واقعہ ہے۔ مرشد الامت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کلکتہ تشریف لے گئے تھے۔ ان دنوں مہمان خانے میں مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی بیٹھ رہے تھے۔ ایک دن عشاء بعد مولانا محمود حسنی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مہمان خانے لے گئے۔ مولانا واضح رشید ندوی کی مجلس میں بٹھایا۔ بعد میں ملاقات بھی کرائی۔ آداب محفل بھی سمجھائے۔ بار بار آتے رہنے کی تلقین بھی کی۔

اسی طرح ایک دن ایک طالب علم نے میرے کمرے میں آکر بتایا کہ مولانا محمود حسنی بلا رہے ہیں۔ میں باہر نکلا تو مولانا کو موجود پایا۔ مولانا نے مجھے لے جا کر مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کے سامنے بٹھا دیا۔ یہ کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گئے کہ مولانا کچھ چیزیں لکھوائیں گے۔ مولانا عبداللہ عباس ندوی آج بھی میری عقیدت کا اہم محور ہیں۔ ان کا علم و فضل، رکھ رکھاؤ، شریعت و طریقت کی آمیزش، مختلف زبانوں پر عبور، قرآن کریم اور اسرار شریعت سے گہری واقفیت اور خوب صورت نثر حیران کن محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے کچھ مضامین نقل کرنا میرے لیے شرف کی بات بھی تھی اور ان سے استفادے کا اہم ذریعہ بھی۔ ان کا قیام مکہ مکرمہ میں رہتا تھا۔ مولانا محمود حسنی توجہ نہ کرتے تو مجھ جیسے دبے ہوئے طالب علم کو یہ موقع کہاں مل سکتا

تھا؟ اسی طرح وہ مجھے بار بار مرشد الامت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے پاس لے گئے۔ بسا اوقات خلوت میں ان کے پاس لے جا کر بٹھا دیا۔ اس سے مجھے بے تکلف استفادے کے قیمتی مواقع نصیب ہوئے۔ وہ یادیں میرا مقدر بنیں، جو ہمیشہ میرا سرمایۂ زندگی بنی رہیں گی۔

مولانا سید محمود حسنی ندوی نے مجھ سے تعمیر حیات کے لیے کتابوں پر تبصرے لکھوائے، مضامین لکھوائے اور بہت سے علمی موضوعات کی طرف متوجہ بھی کیا۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ بہت یاد آتا ہے۔ عالمی رابطہ ادب اسلامی کے زیر اہتمام تیندوا، رائے بریلی میں ہادیِ اودھ مولانا سید محمد امین نصیر آبادی کے متعلق یک روزہ سمینار منعقد ہوا۔ مقالہ نگاران کو عام دعوت نہیں دی گئی تھی۔ البتہ موضوع سے خصوصی مناسبت کی وجہ سے والد محترم ڈاکٹر تابش مہدی کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی اور والد محترم کے ساتھ میں بھی گاڑی میں سوار تھا۔ تیندوا پہنچے تو مولانا محمود حسنی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ انھوں نے مجھے مستقل اپنے ساتھ رکھا۔ مسلسل چلتے پھرتے اور ملتے ملاتے رہے۔ عشاء اور عشائیے کے بعد کسی سے کاروان ایمان وعزیمت کا ایک نسخہ منگا کر مجھے دیا۔ حکم دیا کہ رات بھر میں بیٹھ کر ایک مضمون تیار کردو، جس کا مرکزی خیال یہ ہو کہ حضرت نصیر آبادی درحقیقت امیر المؤمنین سید احمد شہید کے مشن کی توسیع کرنے والے تھے۔ تیندوا میں بجلی غائب ہوگئی تو مولانا نے مجھے موم بتی منگا کر دی اور خود میرے برابر میں لگے تخت پر کروٹ لے کر لیٹ گئے۔ میں اپنا مقالہ لکھتا رہا اور رات کے ڈھائی تین بجے بڑا حصہ مکمل کر کے سو گیا۔ کچھ ہی دیر سویا تھا کہ کسی آواز کو سن کر آنکھ کھل گئی۔ اٹھا تو مولانا بستر پر موجود نہیں تھے۔ اندر دوسرے کمرے سے اللہ اللہ کی صدائیں آرہی

تھیں۔ میں اٹھ کر وہاں پہنچا تو دیکھا کہ مولانا محمود حسنی اور کچھ اور افراد ذکر جہری میں مشغول ہیں۔ ان میں سے ایک چہرہ یاد ہے، لیکن شناسا نہیں۔ اگلے دن میں نے سمینار میں مقالہ پیش کیا تو مولانا نے اس کی داد بھی دی اور اسے مجموعہ مضامین میں شائع کرنے کا یقین بھی دلایا۔ بعض نامعلوم اسباب سے اس سمینار کے مقالات آج تک جمع نہ ہوسکے۔ اس سمینار میں داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی نے بھی شاندار تقریر فرمائی تھی۔

ندوے سے تعلیمی مرحلہ مکمل کرنے کے بعد بھی مولانا سید محمود حسنی ندوی سے رابطہ رہا۔ وہ وقت بڑا پر کیف تھا جب وقتاً فوقتاً مرشد الامت کا قافلہ دہلی آتا رہتا تھا۔ ابوالفضل انکلیو میں واقع مولانا محمود حسنی کے چچا مشفق مکرم سید حسین حسنی کے ہاں قیام رہتا تھا۔ مہمانوں کی عظمت و برکت، ملنے والوں کا تانتا اور میزبان کے اعلیٰ اخلاق اور حسن تواضع۔ ان تینوں چیزوں کے امتزاج سے دو تین روز اتنے پر کیف گزرتے تھے کہ مہینوں سرور طاری رہتا تھا۔ ۲۰۰۸ میں ایک دن اچانک سید حسین حسنی کی وفات سے یہ مبارک سلسلہ ختم ہوگیا۔ ان دنوں کی یاد آج لطف بھی دیتی ہے اور آنسو بھی رلاتی ہے۔ البتہ مرشد الامت کا مبارک وجود اس غم کو کم کرتا رہتا ہے۔

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے
نگاہ یار سلامت ہزار مے خانے

بات کسی اور طرف چلی گئی۔ مجھے عرض یہ کرنا تھا کہ ان دنوں قافلہء مرشد الامت کے ایک اہم فرد مولانا محمود حسنی بھی ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا ان سے باتیں کرنے اور ان کے ساتھ وقت گزارنے کا خاصا موقع ملتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ میں رات کا کھانا کھا کر مولانا کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ مولانا اپنے بزرگوں کو بستر پر لٹا کر میرے ساتھ نکل

آتے تھے۔ایک دو کیلومیٹر تک چہل قدمی کرتے تھے۔گھر تشریف لا کر چائے نوش فرماتے تھے۔ ان اسفار میں کبھی وہ ہمارے گھر کے سامنے واقع ضیاء اللہ ندوی صاحب کے ہاں آتے تھے،تو مجھے بلا لیتے تھے اور وہیں مجلس جم جاتی تھی۔ ہر مجلس میں وہ مجھ سے زیادہ سنتے تھے،خود کم سناتے تھے۔تعمیری باتوں کی طرف توجہ دلاتے تھے۔اہم کتابوں کی نشان دہی کرتے تھے۔ضروری علمی موضوعات کی طرف رہنمائی کرکے ان پر کام کرنے کی ترغیب دلاتے تھے۔

دہلی کی انھی ملاقاتوں میں ایک دن مولانا نے مجھ سے روحانی سرگرمیوں کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ میں وقتاً فوقتاً تبلیغی جماعت کے مرکز بھی چلا جاتا تھا۔وہاں جا کر کچھ بزرگوں کی صحبتوں میں بیٹھنے سے بیٹری چارج ہو جاتی تھی،لیکن ادھر چند ماہ سے میں نے یہ سلسلہ روک دیا ہے۔ مولانا نے پوچھا: کیوں روک دیا؟ میں نے انھیں نام لے کر بتایا کہ مرکز میں مجھے سب سے زیادہ متأثر فلاں بزرگ نے کیا تھا۔میں انھی کی نیت سے مرکز جاتا تھا اور علم و معرفت کے موتیوں سے دامن بھر کے لوٹتا تھا۔ایک دن وہ بزرگ علماء کے بڑے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ انسان کا لباس بول دیتا کہ اندر کیا ہے۔پھر ایک عالم دین کی طرف اشارہ کیا، جو دو پلی ٹوپی پر لال رومال لپیٹے ہوئے بیٹھے تھے۔کہا کہ دیکھو یہ مولوی صاحب دیوبند یا سہارنپور کے فارغ ہوں گے۔ان عالم دین نے تائید کی اور بتایا کہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ ہیں۔اس کے بعد میرے ان ممدوح نے میری طرف دیکھا۔مجمع میں صرف میں نے ہی صدری اور اسی رنگ کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: دیکھیے یہ مولوی صاحب ندوے کے فارغ ہوں گے۔میں نے بھی اثبات میں جواب دیا تو وہ فرمانے لگے: حقیقت

یہی ہے کہ لباس بول دیتا ہے۔کوئی لباس تعیش کا مظہر ہوتا ہے اور کوئی تواضع کا۔ان بزرگ کے یہ جملے میرے دل میں چبھ کر رہ گئے۔ یہ میری مادرِ علمی پر حملہ تھا۔کیوں کہ انھوں نے ندوے کا نام بھی لیا تھا اور دوسرے اداروں سے اس کا تقابل بھی کیا تھا۔میں چندمنٹ مروتاً مجلس میں بیٹھا اور پھر اٹھ کر آ گیا۔پھر کبھی ویسا تعلق نہ رکھ سکا۔مولانا محمود حسنی نے یہ بات سنی تو میری توقع سے کہیں زیادہ ناراضی کا اظہار کیا۔ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔جلال میں کہنے لگے کہ حد کرتے ہیں یہ حضرات۔ندوے کے احسانات کم ہیں ان پر؟ پھر ان کے شیخ کا اسم گرامی لے کر کہا کہ میں اس بات کی شکایت ان سے کروں گا۔بات آئی گئی ہوگئی۔مولانا کی وفات سے کچھ مدت پہلے رمضان المبارک میں ملاقات ہوئی تو مولانا نے انھی بزرگ کا نام لے کر کہا کہ ''آپ کے۔۔۔بھی انتقال کر گئے۔''میں نے ان بزرگ کے فضائل بیان کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔لیکن مجھے بہت حیرت ہوئی کہ انھیں پندرہ سولہ سال پہلے کا یہ چھوٹا سا واقعہ اچھی طرح یاد تھا۔انھوں نے اس کا اشارہ بھی کیا کہ انھوں نے وہ کر دیا تھا جو کہا تھا۔یعنی ان بزرگ کے شیخ سے شکایت۔اس ایک چھوٹے سے واقعے سے ہمیں مولانا محمود حسنی کے مادرِ علمی سے شدید لگاؤ، چھوٹوں کی دل داری، احقاقِ حق کا جذبہ اور اصلاح کے مخلصانہ طریقے اختیار کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی نے خود کو ہمیشہ چھپائے رکھا۔ہمیشہ اپنے بڑوں کے خادم بنے رہے۔لیکن وہ روحانی طور پر کتنے بلند تھے، اس کا اندازہ کم لوگوں کو ہوگا۔مجھ جیسے طالب علم پر ان کی عنایت اور ان کی دلداری عجیب وغریب تھی۔سوچتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں۔یہ کرم فرمائیاں درحقیقت ان کی روحانی عظمت کا پتا دیتی ہیں۔رمضان کے مہینے میں مولانا میرے لیے اپنے برابر میں بستر کا انتظام کرتے

تھے۔ ایک آدھ مرتبہ نہیں، کئی رمضان ایسے گزرے کہ میں نے آخری عشرے میں حاضری دی تو مولانا نے اپنے برابر میں جگہ کا نظم کیا کہ تم یہیں رہو گے۔ انھیں معلوم تھا کہ میں چائے کا دھتی ہوں۔ تکیے کے دوران قیام افطار و سحری میں پورا وقت مہمانوں کو جگانے، دسترخوان پر بلانے اور کھانا کھلانے میں گزار دیتا ہوں، اس لیے چائے سے محروم ہوسکتا ہوں۔ لہٰذا مولانا چائے کی ایک پیالی کسی چیز سے ڈھک کر کونے میں رکھے رہتے تھے۔ میں خدمت سے فارغ ہونے کے بعد خود سحری کر کے پہنچتا تھا تو بڑی محبت سے مجھے چائے پیش کرتے تھے۔ ایک رمضان میں سحری کے وقت پہنچا تو احباب نے وقت تنگ ہونے کی وجہ سے بنگلے میں ہی سحری پر بٹھا لیا۔ میں تنہا جلدی جلدی سحری کر رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا اپنے گھر سے چائے کی ایک پیالی لا رہے ہیں۔ ایک رمضان میں مسجد کے اندر سو رہا تھا۔ محسوس ہوا کہ کوئی پیر دبا رہا ہے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ مولانا وہاں سے اٹھ کر بہت تیزی سے باہر کی طرف جا رہے ہیں۔ کیا عام خانقاہوں صاحب سجادہ کے کسی قریبی شخص سے اس رویے کی امید کی جاسکتی ہے؟ قریبی کیا، دور پرے کے لوگ بھی ایسے دندناتے پھرتے ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ انکسار و تواضع کی یہ بے نظیر کیفیت اور ہمیشہ اپنے نفس کو کچلتے رہنے کی کوشش شاہ علم اللہ حسنی کے خاندان کی قدیم روایت ہے۔ ہمارے ممدوح مولانا محمود حسنی نے اس روایت کو تادم آخر نہایت مضبوطی سے تھامے رکھا۔

مولانا سید محمود حسنی ندوی کے بارے میں لکھنے والے یقیناً یہ بھی لکھیں گے کہ وہ علمی معاملات میں ہر ایک کا حتی الامکان تعاون کرتے تھے۔ محترمی مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی نے بھی اپنے مضمون میں اس وصف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مجھ طالب علم کے پاس ان کے اس وصف کا عجیب ثبوت موجود ہے۔ ہوا یہ کہ ۲۰۱۳ میں

مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کی وفات کے بعد میں ان کی شخصیت اور پیغام کے متعلق ایک کتاب لکھ رہا تھا۔ اسی درمیان رمضان آ گیا۔ حسب معمول تکیہ حاضری ہوئی۔ مولانا محمود حسنی اعتکاف میں تھے۔ میں نے ان کے سامنے اپنی کتاب کا ذکر کیا۔ انھوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ کچھ دیر بعد وہ میرے پاس آئے اور ایک مسودہ تھمایا۔ کہا کہ میں بھی مولانا کے متعلق کتاب لکھ رہا ہوں، اب تک جو حصہ لکھ چکا ہوں وہ تم دیکھ لو۔ ہوسکتا ہے کچھ کام کی چیز مل جائے۔ میں نے حیرانی اور خوشی کے ساتھ وہ مسودہ لے لیا۔ تکیے کے دوران قیام اس سے استفادہ کیا اور اپنی کتاب ''داعی اسلام شخصیت اور پیغام'' میں مولانا کے شکریے کے ساتھ شامل کیا۔ میری طرح تصنیف و تالیف سے معمولی تعلق رکھنے والے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنے ظرف کی بات ہے۔ بعد میں مولانا کی کتاب بھی شائع ہوئی تو انھوں نے ایک ملاقات پر کہا کہ ہم نے تم سے حوصلہ پا کر اپنی کتاب کا نام "تذکرہ داعی اسلام" رکھا ہے۔ ورنہ ہمیں کچھ تأمل تھا۔

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی کی وفات سے دو ماہ پہلے رمضان المبارک میں تکیے حاضری ہوئی۔ معلوم ہوا کہ مولانا محمود حسنی اپنے گھر میں ہی ہیں۔ چلنا پھرنا، باہر نکلنا سخت دشوار ہے۔ میں نے صدیق مکرم مولانا سید منصور حسن حسنی ندوی سے گزارش کی کہ وہ چند منٹ کی ملاقات کے لیے مولانا سے اجازت لے لیں۔ کچھ دیر بعد بھائی منصور نے بتایا کہ مغرب بعد گھر چلیں گے۔ میں حاضر ہوا۔ مولانا نہایت کمزور لیکن بشاش تھے۔ ورم کی وجہ سے پیر پھیلا کر بیٹھے تھے، لیکن بات چیت کا وہی انداز۔ تفصیل سے اپنی بیماری اور علاج کے بارے میں بتایا۔ میں نے عیادت کر کے اٹھنا چاہا تو بٹھا لیا۔ ناشتہ منگوایا۔ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے ''اوراق زندگی'' (جلد اول) کی مبارک باد دی تو بہت خوش ہوئے۔ میری حوصلہ افزائی کے لیے

مشورے طلب کیے اور بے جھجک تبصرے کو کہا۔ میں نے چند باتیں عرض کیں تو خوشی سے تسلیم کیا۔ میرے پوچھنے پر بتایا کہ جب مولانا کا نام رابع ہے تو چار جلدیں تو ہونی ہی چاہئیں۔ میں نے کتاب کے ابتدائی حصے کا خصوصیت سے تذکرہ کیا تو کہا: ''ہاں بھائی! لوگوں کو معلوم ہی نہیں ہے۔ سید احمد شہید کے خاندان کے تو اصل یہی ہیں۔''
اسی ملاقات میں حسن خاتمہ کی بات آئی۔ میں نے ماضی قریب میں حسن خاتمہ سے سرفراز کچھ لوگوں کا ذکر کیا تو مولانا نے استغنا آمیز اطمینان کے ساتھ کہا: ''حسن خاتمہ تو ہوتا ہی ہے۔ کردار اچھا ہونا چاہیے۔ ان کی رضا پر نظر ہو تو سب کچھ اچھا ہی ہوتا ہے۔'' آج ان کے حادثہ وفات کے بعد حسن خاتمہ کے ذکر پر ان کا مطمئن اور مستغنی چہرہ بار بار نظروں کے سامنے آرہا ہے۔ ہم جیسے سیاہ باطن کیا سمجھتے کہ وہ اتنے مطمئن کیوں ہیں؟

میرے محسن وممدوح! ماہ محرم الحرام میں جمعہ کے دن مقصود حقیقی کی بارگاہ میں حاضری، اسی دن عصر بعد کی مبارک ساعتوں میں روپوشی اور خود زبان نہ کھول سکنے کے باوجود اپنے آخری کتابچے کے ذریعے درود وسلام کی تلقین وترویج کرنے کا انداز کیسا نرالا رہا۔ اس شان سے رخصت ہونا ایرے غیرے کے نصیب میں کہاں؟ اب سمجھ میں آیا کہ آخری ملاقات میں حسن خاتمہ کے تذکرے پر آپ ایسے مطمئن کیوں تھے۔ آپ کی نظر ہر لمحے رب کی رضا پر تھی۔ آپ کے حسن خاتمہ نے بتا دیا کہ وہ بھی آپ سے راضی ہوگیا۔ آپ زندگی بھر خود کو چھپاتے رہے، لیکن مخزن تجلیات نے آخری وقت میں آپ کو ظاہر کر دیا۔ آپ نے زندگی بھر اپنے کو چھوٹا بنائے رکھا، لیکن اکبر واعلیٰ نے حسن خاتمہ کے ذریعے آپ کو بڑا بنا دیا۔ اللہ کی قسم آپ کامیاب ہوگئے۔

جہد مسلسل اور عمل پیہم کی حامل عظیم شخصیت

مولانا محمد کلام الدین ندوی
(مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء-لکھنؤ)

ہمارے مولانا سید محمود حسنی ندویؒ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، مولانا مرحوم کو ملک و بیرون کے بزرگان دین اور اصحاب علم ودانش اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے، ان کی پرورش و پرداخت اور تعلیم وتربیت ایک مثالی خانوادہ اور اس کی باوقار ہستیوں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ، مولانا سید محمد الحسنیؒ، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ، مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندویؒ اور مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کے زیر سایہ ہوئی، اس خانوادۂ علم الٰہی اور اس کے قابل فخر و مایہ ناز افراد کے علمی، تعلیمی، دینی اور دعوتی خدمات عرب وعجم میں روز روشن کی طرح عیاں ہیں، درس وتدریس اور تعلیم وتعلم کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب، تاریخ نویسی، سیرت وسوانح نگاری، عربی زبان وادب، تفسیر وحدیث، تصنیف وتالیف اور دعوتی وتبلیغی میدان میں نمایاں کارنامے ہیں، مولانا مرحوم نے انہی حضرات کے علمی تجربات اور انداز تصنیف تالیف سے مسلسل

فائدہ اٹھایا، برابر مضامین وتبصرے لکھتے، سیرت وسوانح پر کتابیں تصنیف کرتے اور بزرگوں کے علمی ودعوتی اسفار کی روداد بھی مرتب کرتے رہے، ان کے مضامین مختلف رسائل وجرائد بالخصوص ندوۃ العلماء کے اردو ترجمان پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' جس کے وہ دو دہائی تک نائب مدیر رہے' میں شائع ہوکر عوام وخواص تک پہنچتے رہے، اپنے خانوادہ کے بزرگوں اور ذمہ داران ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سفر وحضر کی علمی ودینی مجلسوں ومحفلوں سے بھی بھرپور استفادہ کیا، اس طرح انہوں نے خاص طور پر علمی وتصنیفی میدان میں اچھی مہارت وسلیقہ مندی حاصل کرلی، ان حضرات کی نگرانی میں خوب لکھنے، بولنے اور سیکھنے کا موقع ملا، مولانا مرحوم نے انہی یگانہ روزگار ہستیوں سے تصنیف وتالیف کا طریقہ سیکھا اور لکھتے لکھتے خود مصنف بن گئے اور مختصر عمر میں ایک مفید وقابل ذکر علمی سرمایہ چھوڑ کر گئے۔

اپنے خاندان کے علماء وصلحاء کی تصنیفات کے علاوہ مولانا مرحوم نے حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہ کی کتابوں سے بھی بہت کچھ سیکھا، ان کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ کتاب کے کس باب میں کیا لکھا ہے، ذہن ودماغ میں ساری باتیں بیٹھ گئی تھیں، کہیں سے بھی کسی نے کچھ پوچھا، پورے حوالے کے ساتھ فوراً کتابوں کے نام اور جلد نمبر ان کو بتادیتے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے چند اساتذۂ کرام نے بھی ان سے مشورہ کے طور پر بہت کچھ سیکھا، وہ مضامین لکھنے پڑھنے والوں کی بہت تعریف کرتے تھے اور انہیں ترغیب وتشویق دیتے تھے، ایک دن مجلس تحقیقات میں مضمون لکھ رہے تھے کہ اچانک مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ تشریف لائے تو انہوں نے مولانا خالد ندوی غازی پوری سے درخواست کی کہ آپ کے کچھ مضامین ''تحریک شہیدین' ' پر تعمیر

حیات' میں شائع ہوئے ہیں، اگر اس کو کتابی شکل میں لے آئیں تو طلباء کو اس سے بڑا فائدہ ہوگا، مولانا نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور کچھ ہی دنوں میں مولانا مرحوم نے سارے مضامین نکلوا کر کمپوزنگ کے لیے مولانا کو دیے اور راقم سے ملاقات کرادی کہ کتاب کے سلسلہ میں کلام بھائی سے رابطہ رکھئے گا، ماشاء اللہ بہت جلد حضرت ناظم صاحب مدظلہ اور حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کے مقدمہ کے علاوہ کئی اور مقدموں کے ساتھ 'تحریک شہیدین' کے نام سے ایک کتاب منظر عام پر آگئی، اس کتاب کی اتنی برکت اور اس مشورہ کا اتنا فائدہ ہوا کہ دو سال کے اندر اندر مولانا خالد ندوی غازی پوری کی دس سے بارہ کتابیں اب تک منظر عام پر آگئیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ نے ایک کامیاب مدرس کے طور پر اپنی تدریسی خدمات کا آغاز مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور رائے بریلی سے کیا، وہ ایک بڑے عالم وفاضل، باعمل، باکمال مقرر، ماہر صحافی، سیال قلم، نیک طبع، صاحب دل، صاحب نسبت، عالی صفت، رحم دل، زاہد و متقی اور سادگی کے ساتھ زندگی گزارنے والے، شہرت و ناموری سے کوسوں دور، للّٰہیت، خشیت الٰہی، عشق رسولؐ، محبت صحابہ کرامؓ، تواضع، اخلاص، فراخ دلی، مہمان نوازی، ضرورت مندوں کی مدد، وقت کی پابندی، نام ونمود سے اجتناب، اشاعت علم، دعوت وتبلیغ سے دلچسپی کے ساتھ وہ اللہ والے اور اعلیٰ پایہ کے نیک انسان تھے، فلاحی ورفاہی کاموں سے دلچسپی رکھنے والوں کے بہترین معاون، بہترین سیرت نگار، مقالہ ومضمون نگار اور تاریخ نویس کی حیثیت سے جانے جائیں گے، آپ کو یہ ساری خصوصیات حاصل تھیں، آپ کا قلم ان سب ہی موضوعات پر بے باکی سے چلتا، اس وقت اس میدان میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبۂ

صحافت ولسانیات میں ایک گھنٹہ بھی پڑھاتے تھے،اس درجہ کے طلباء آپ سے بہت مانوس تھے، جب کبھی پڑھانے کے لیے درجہ جانے میں تاخیر ہوتی تو کوئی نہ کوئی طالب علم مولانا کو لینے آجاتا،ان کی سادگی کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ کڑاکے کی سردی میں بھی راقم نے انہیں موزے اور جوتا پہنتے نہیں دیکھا، ہمیشہ چپل استعمال کرتے رہے، راستہ چلتے، اٹھتے بیٹھتے لکھنے پڑھنے میں مشغول ہوجاتے، راقم بارہا مولانا مرحوم سے کہا کرتا تھا کہ تھوڑا آرام کرلیجیے،لکھنا پڑھنا تو زندگی بھر ہوتا ہی رہے گا،مولانا فرماتے: کلام بھائی! جو کام کرنا ہو جلدی جلدی اس کو کرڈالیں، کس وقت اللہ تعالیٰ کا بلاوا آجائے کچھ نہیں کہا سکتا۔

مولانا مرحوم کا اصل وصف کہیے یا کارنامہ کہ وہ کسی نہ کسی کا مالی طور پر کمزور طلبہ میں انتخاب کرتے اور بڑی سنجیدگی اور خفیہ طور سے ان کے گھریلو حالات معلوم کرتے، پھر اس کو اطمینان دلاتے اور ان سے پوچھتے کہ ماہانہ کیا خرچ ہے؟ کہتے کہ آپ اپنی تعلیم جاری رکھئے اور محنت سے علم حاصل کیجیے، میں آپ کے خرچ کا انتظام کرتا ہوں ان شاء اللہ، وہ راقم کے پاس ان کو لے کر آتے اور ان سے کہتے کہ آپ یہاں کلام بھائی سے ہر ماہ اتنی رقم لے لیا کریں، وہ رقم کا انتظام کرتے اور میرے پاس بطور امانت رکھتے اور فرماتے ہر ماہ اس رقم سے اس طالب علم کو دے دیا کریں اور ان سے دستخط کرالیں اور جب رقم ختم ہوجائے تو مجھے اطلاع کردیا کریں، ان شاء اللہ انتظام کردوں گا، میں اس کام کو انجام دیتا، ایک مرتبہ مولانا مرحوم کو تقریباً ایک لاکھ روپے یا کچھ کم مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مدظلہ نے جمالیہ ہال کی تزئین ومرمت کے لیے دیے، انہوں نے وہ رقم میرے پاس رکھ دی اور کہا کہ جمالیہ ہال ’جمعیۃ الاصلاح‘ کی دیکھ ریکھ کرنے والے جو اساتذہ اور طلباء ہیں، ان سے کہیے کہ جو کام ضروری ہیں،

ان کو کرالیں اور جو رقم خرچ ہو آپ انہیں دے دیں اور جو رقم دیں ان سے لکھالیں، تاکہ مولانا کو پورا حساب دیا جاسکے، اس طرح جمالیہ ہال کا کام پورا ہوا، مولانا مرحوم جملہ کارکنان 'دفتر تعمیر حیات' و 'مجلس تحقیقات ونشریات اسلام' کو رمضان المبارک شروع ہونے سے دو تین روز قبل شربت روح افزا کی بوتل عنایت کرتے تھے اور یہ سلسلہ کئی سالوں سے جاری تھا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔آمین!

مخدوم ومربی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کے دورِ نظامت کی ابتداء سے حضرت مولانا مدظلہ کی جو بھی کتابیں طبع ہوئیں، ان میں مولاناؒ کی کافی محنت رہی، 'یادوں کے چراغ' (حصہ اول) جب مولانا محمد ہاشم ندوی بھٹکلی نے طبع کرانے کی ذمہ داری قبول کی تو مولاناؒ نے میری رہائش گاہ پر اطہر ہاسٹل کے پیچھے مسلسل چار پانچ روز تہائی رات تک میرے ساتھ کتاب تیار کرانے کے لیے وقت دیا اور کمپیوٹر پر سیٹنگ اور حذف واضافہ کے بعد کتاب تیار کی، فجر کی نماز سے نصف گھنٹہ پہلے کمرہ سے تہجد کے لیے نکلتے، اسی طرح دوسری جلد میں بھی ان کی بڑی محنت رہی، اسی طرح ایک کتاب ''اصحاب کہف کے غار سے یمن کی وادیوں میں'' جو پانچ مسلم ممالک کے اسفار ہوئے تھے، اس سفر میں مفکر اسلام حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ پانچ افراد تھے، جن میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ، حاجی عبدالرزاق مرحوم اور مولانا عبدالنور ندویؒ، مولانا مرحوم نے اسفار کے مضامین کو ''تعمیر حیات'' سے نکال کر جمع کیا اور کتابی شکل میں تیار کرا کر مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کو پوری کتاب پڑھ کر سنائی، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ نے مختلف مقامات کے نام اور اشخاص کے نام وتعارف کی اصلاح کرائی،

اس کے بعد زیورطبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی، اسی طرح 'تحفۂ گجرات'، 'تحفۂ جنوب' اور 'مکتوبات حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی' (سوم، چہارم، پنجم، ششم) ان سب کتابوں پر نظر ثانی کرنے اور حاشیہ لگانے میں بہت بیدار مغزی سے کام کیا، کتاب کو معنوی وظاہری اعتبار سے خوبصورت بنانے میں اپنی نا قابل فراموش خدمات پیش کیں، ان کے علاوہ لاک ڈاؤن میں مخدوم ومربی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ سے پوری معلومات لے کر 'اوراقِ زندگی' اول/ دوم پر جو مولانا مرحوم نے محنت کی ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے، آپ نے اپنی علالت کی حالت میں جبکہ ڈاکٹروں اور گھر کے بزرگوں نے کام کرنے اور لکھنے پڑھنے سے منع کر رکھا تھا، اس کے باوجود مولاناؒ راقم کو فون کرتے اور فرماتے کہ ہماری طبیعت الحمد للہ بہتر ہے، افاقہ ہو رہا ہے، آپ مجھے فلاں باب سے فلاں باب تک پرنٹ نکال کر چھپا کر لائیں، کوئی دیکھ نہ پائے، ان دونوں جلدوں میں بھی مولانا مرحوم کی نا قابل فراموش خدمات ہیں، اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری کتابیں ہیں جن پر آپ نے اپنی جان کی بازی لگادی، مولاناؒ کی جو اپنی تصنیفات ہیں' ان کی تعداد تقریباً بارہ/ تیرہ کتابیں اور بے شمار مضامین اور مقالے ہیں، ان سب کتابوں کو مولانا مرحوم نے بڑی محنت ومشقت اور دیدہ ریزی کے ساتھ تیار کر کے زیور طبع سے آراستہ کرایا ہے جو مولانا مرحوم کے لیے ذخیرۂ آخرت ہے، مولانا مرحوم کی اپنی تصنیفات کی فہرست ایک نظر میں ملاحظہ فرمائیں:

''سوانح مولانا سید محمد الحسنیؒ، سوانح مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ، تذکرۂ مولانا شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حیات عبدالباریؒ اردو-عربی، چند دن دیار نکہت ونور میں، شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوریؒ، تاریخ اصلاح وتربیت، اول/ دوم، عائشہ بی، ہدیہ درود

وسلام، سلاسل اربعہ۔‘‘

اس کے علاوہ اور بھی کتابیں و بے شمار مضامین ومقالے شائع ہوئے، اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی خدمات کو قبول فرمائے اور بال بال مغفرت فرمائے۔ آمین!

مولانا مرحوم نے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی جملہ اردو کتابیں جو الحمدللہ اس وقت مکمل کمپیوٹرائزڈ ہوکر نئی طباعت سے آراستہ ہوچکی ہیں، ہر کتاب پر دوبارہ نظر ثانی کی ہے، بعض کتابوں کے سلسلہ میں تو مولانا مرحوم نے فرمایا کہ کمپوز ہونے کے بعد جب تک میں نہ دیکھ لوں، تب تک پریس نہ بھیجئے گا، ان کتابوں میں سے خاص کر ’المرتضیٰ‘ اردو، ’ارکان اربعہ‘، ’دستور حیات‘، ’مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت‘ وغیرہ ہیں، ’المرتضیٰ‘ اردو تو مولاناؒ نے خود دو بار پڑھی، حوالے وغیرہ کی اصلاح کے بعد ایک بار مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ کو پڑھنے کے لیے دیا، اس کے بعد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کو پوری کتاب دکھائی اور اس پر ایک ’مقدمہ طبع نہم‘ لکھا کر پھر راقم سے کہا کہ اب اس کو اچھی طرح سیٹ کرکے پریس بھیج دیں، اب میرے حساب سے کتاب میں کوئی کمی اور اشکال باقی نہیں رہا، درست ہوگئی، اس کے علاوہ کئی کتابوں کے سلسلہ میں مولانا عبدالرشید راجستھانی ندوی سے کہا کہ آپ مجلس تحقیقات کی فلاں فلاں کتابیں دیکھ لیجیے گا، خاص کر جو حوالے ہیں، اچھی طرح ان کو چیک کرلیجیے گا، مولانا مرحوم کی نگاہ بڑی تیز اور باریک تھی، ’مجلس تحقیقات ونشریات اسلام‘ اور دفتر ’تعمیر حیات‘ کو تو مولانا مرحوم نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا، کبھی کبھی تو لکھتے لکھتے اذان ہوجاتی، کہتے بس پورا ہونے ہی والا ہے، کارکن سے کہتے کہ ہم لوگ یہیں ان شاء اللہ جماعت کرلیں گے اور لکھنے پڑھنے میں اتنا مشغول ہوتے کہ وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا۔

مولانا مرحوم 'اوراق زندگی' کی دوسری جلد سے فارغ ہونے کے بعد 'مکتوبات حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی' جلد سوم کی جدید ترتیب کے لیے فہرست بنا کر راقم کو بھیج دیا کہ نئی سیٹنگ اس طرح ہوگی اور 'تاریخ اصلاح و تربیت' جلد سوم کے تین باب اور ایک تحریر بھیجی کہ فلاں صاحب سے کام کرانا ہے، باقی ہم بھیجتے رہیں گے، اسی دوران مولانا علاج کے لیے چنڈی گڑھ تشریف لے گئے، وہاں چند روز علاج کے بعد واپس وطن آئے، طبیعت ماشاء اللہ قدرے بہتر ہی تھی، ڈاکٹروں کے مشورے سے ڈائلسیس کے لیے میٹرو سٹی ہسپتال میں شفٹ کرائے گئے، چند روز وہاں بھی علاج جاری رہا، طبیعت آگے پیچھے ہوتی رہی، لیکن خاطر خواہ کوئی فائدہ نہیں ہوا، دوسری بیماری کا بھی حملہ ہوا اور اس میں مزید اضافہ ہوگیا اور آخر میں بروز جمعہ ١٢/اگست ٢٠٢٢ء کو اپنے مالک حقیقی سے جاملے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی خدمات کو قبول فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور ان کی بال بال مغفرت فرمائے، اہل خانہ واہل تعلق کو صبر جمیل عطا کرے اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے اور باقی کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق دے۔ آمین!

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

سانحہ ارتحال

مولانا خطیب الرحمٰن ندوی
(استاد جامعہ اسلامیہ، مظفر پور- اعظم گڑھ)

خانوادۂ حسنی رائے بریلی کے صالح نوجوان اور چشم و چراغ مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی نائب ایڈیٹر ''تعمیر حیات- لکھنؤ'' نے ایک طویل بیماری میں مبتلا رہ کر بالآخر ۱۳/محرم الحرام ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۲/اگست ۲۰۲۲ء بروز جمعہ ساڑھے آٹھ بجے صبح لکھنؤ کے ایک ہسپتال میں وفات پائی، مرحوم کی تاریخ پیدائش ۲۲/جولائی ۱۹۷۱ء ہے، اس لحاظ سے کل مدت حیات تقریباً ۵۱/سال ہوتی ہے۔

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی نے گھریلو اور مکتب کی تعلیم کے بعد پوری تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء میں حاصل کی، ۱۹۹۰ء میں عالمیت اور ۱۹۹۲ء میں فضیلت اور پھر کلیۃ الدعوۃ کا ایک سالہ کورس مکمل کیا، تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور رائے بریلی میں مدرس ہوگئے، تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا خاص ذوق تھا، لکھنے میں تیز رفتار تھے، خاندانی حالات اور انساب کی معلومات اور تواریخ ولادت و وفات سے اچھی آگاہی تھی، کئی ضخیم سوانحی کتابیں ان کے قلم سے شائع ہوئیں

اور بہت مقبول ہوئیں، ان کی کتابوں میں ''حضرت مولانا محمد زبیر الحسن کاندھلویؒ'' اور ''سیرت داعی اسلام حضرت مولانا سید عبد اللہ حسنی ندویؒ'' وغیرہ کا تعارف وتبصرہ ''الشارق'' میں آچکا ہے۔

مولانا محمود حسنیؒ کے نانا حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ بڑے فاضل، خاندانی انساب میں ماہر، صاحب قلم، نثر ونظم پر یکساں قادر اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد اور مجاز بیعت تھے، ۵۸ ر سال کی عمر میں ۱۶ ر فروری ۱۹۸۲ء کو ان کا انتقال ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کی خوبیاں نواسہ کے اندر منتقل فرما دی تھیں۔ وہ بہت ذاکر وشاغل تھے، ذکر بالجہر کا خوب ذوق تھا، ان کے ساتھ دوسرے لوگ بھی ذکر میں شامل رہا کرتے تھے۔

رمضان المبارک میں تکیہ کی مسجد میں ختم خواجگان کے معمول کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ کی کتاب ''فضائل رمضان'' بڑے دل پذیر انداز میں پڑھتے، انہوں نے ''سوانح حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ'' میں لکھا ہے کہ

> ''راقم الحروف نے حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کے رائے بریلی میں ماہِ رمضان المبارک کے خانقاہی نظام میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی کتاب ''فضائل رمضان'' پڑھنا شروع کیا تو ایک روز حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے فرمایا کہ حضرت شیخ ہوتے تو بڑے خوش ہوتے کہ تم یہ کتاب پڑھ رہے ہو، اس لیے کہ تم محمد ثانی کے نواسہ ہو۔''

(سوانح حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی: ۲۱۹)

مولانا سید محمود حسنی نے حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فیض حاصل کیا تھا، ان کے وصال کے بعد خاندان کے سرپرست حضرت مولانا سید محمد رابع

حسنی ندوی دامت برکاتہم، حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ، حضرت مولانا سید عبد اللہ حسنی ندویؒ، حضرت مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندویؒ اور حضرت مولانا بلال صاحب زید مجدہ سے مکمل وابستہ رہے اور حسب مراتب سب کی خدمت اور سب سے استفادہ کرتے رہے، ہمیشہ وہ چاق و چوبند ہی نظر آتے تھے، علمائے کرام سے تعلق ان کی خوبیوں میں سب سے نمایاں خوبی تھی، ان سے رابطہ گہرا اور وسیع تھا، بلکہ کتنے علماء سے حضرت ناظم صاحب دامت برکاتہم کی گفتگو اور احوال کی دریافت مولانا محمود صاحب کے توسط ہی سے ہوا کرتی تھی۔

حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین صاحب دامت برکاتہم سے وہ حد درجہ قریب رہے، حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب دامت برکاتہم جب بھی جامعہ اسلامیہ تشریف لاتے تو محمود صاحب ان کے ہمراہ ہوتے، ایک زمانہ میں حضرت ناظم صاحب کے اسفار کی رپورٹ مستقل طور پر وہی لکھتے، جو ''تعمیر حیات'' میں شائع ہوتی اور بڑی دل چسپی سے پڑھی جاتی۔

ان کی ایک اور خوبی ان کی نہایت دل آویز شخصیت تھی، وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی اور نہایت بشاشت کے ساتھ ملتے، بات کرتے، ذکر واذکار کے معمول نے ان کی باتوں کو دل پذیری عطا کر دی تھی، ایک معصومیت کا ہالہ ان کے ارد گرد محسوس ہوتا، جنازہ میں شریک ہونے والوں کے ہجوم نے ان کے حسن خاتمہ کو گویا گواہی دے دی، معلوم ہوا کہ سلوک وتصوف کی راہ سے حضرت مولانا سید شاہ نفیس الحسینی صاحبؒ سے ان کو اجازت وخلافت حاصل تھی۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم خطوط کا املا بھی اکثر مولانا محمود صاحبؒ ہی سے کراتے، احقر کے نام حضرت کے بعض خطوط میں ''بقلم محمود'' اور

کسی میں ''کاتب الحروف محمود کا سلام قبول ہو، الشارق کا انتظار ہے'' لکھا ملتا، الشارق میں ان کے مضامین بھی شائع ہوئے، کبھی انہوں نے خود مضمون ارسال کیا، کبھی احقر نے ان سے مضمون کی فرمائش کی۔

مولانا محمود حسنی مرحوم کی نماز جنازہ پہلے ندوہ میں حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء نے جمعہ کے فوراً بعد پڑھائی، اس کے بعد جسد خاکی تکیہ رائے بریلی منتقل کیا گیا اور وہاں دوسری نماز جنازہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم ناظم ندوۃ العلماء نے عصر کی نماز کے بعد پڑھائی اور تدفین مسجد شاہ علم اللہ کے شمالی جانب مقبرہ میں عمل میں آئی۔ رحمه الله رحمة واسعة وأدخله فسيح جناته. آمین!

کیوں نہ یاد آئے مجھے رہ رہ کر شفقت تیری

مولانا یحییٰ وحید ندوی
(متحدہ عرب امارات)

"کل من علیہا فان!" اس میں شک نہیں کہ باقی رہنے والی ذات صرف اللہ کی ہے، ہر کسی کو موت آنی ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کبھی بھی کسی کو بھی کہیں بھی موت آسکتی ہے، لیکن کچھ لوگوں کی موت ایسی ہوتی ہے جن کے درد کو زمانہ محسوس کرتا ہے اور خاص طور پر جب یہ کسی کو جوانی میں آجائے۔

یہ خبر ہم سب پر بجلی بن کر گری کہ خانوادۂ حسنی کا ایک اور چراغ گل ہو گیا، مولانا محمود حسن حسنی ندوی بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئے، مولانا کا تعلق ایسے خاندان سے ہے جس نے صدیوں سے علم وادب کے وہ آفتاب و ماہتاب پیدا کیے ہیں، جن کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ خاندان صدیوں سے علم وفن کا گہوارہ بنا رہا ہے اور امت مسلمہ کی مسلسل سیادت وقیادت کرتا رہا ہے۔

مولانا کے سانحہ ارتحال سے جو ہم سب کو رنج والم ہوا اس کا اندازہ لگانا مشکل

ہے، مولانا سے میرے ذاتی تعلقات بہت گہرے تھے اور ہمارے پورے خاندان سے مولانا واقف تھے اور سب سے ان کا اچھا خاصا تعلق تھا۔

میرے والد محترم وحید احمد ندوی ازہری اُطال اللہ بقاءہ اور مولانا مرحوم کا جو رشتہ تھا اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ثانویہ رابعہ سے ہی مولانا اور والد صاحب ایک دوسرے کے رفیق درس تھے اور فضیلت تک ساتھ تعلیم مکمل کی، ان دونوں کے درمیان محض اخلاص ومحبت پر مبنی دوستی ووالہانہ تعلق تھا، پوری طرح وہ وفادار وفدا کار تھے، والد صاحب کو مولانا کے انتقال سے جو گہرا دکھ ہوا اس کو میں محسوس کر سکتا ہوں، مولانا کا جذبہ اور گہری محبت کا ذرا سا عکس مولانا کی اس تحریر میں عیاں ہے جس کو انھوں نے والد صاحب کے ایک مقالہ پر مقدمہ کے طور پہ ''حرفِ چند'' کے عنوان سے تحریر فرمایا تھا، اسی تعلق کی بنا پر وہ مجھے ہمیشہ بیٹے کی نظر سے دیکھتے تھے، کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اس محبت کو تا عمر باقی رکھا۔

آج بھی مجھے ان سے وہ پہلی ملاقات یاد ہے جب ۲۰۰۴ء کے اواخر میں (اس وقت میری عمر ۸ سال کی تھی) اپنے گھر سے رائے بریلی مدرسہ ضیاء العلوم میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک چچا زاد بھائی اور ایک پھوپھی زاد بھائی کے ساتھ رخت سفر باندھا، تو سب سے پہلے مدرسہ پہنچنے کے بعد ہم لوگ تکیہ کلاں مولانا سے ملاقات کے لیے گئے اور ہم لوگوں سے متعلق والد صاحب کی مولانا سے پہلے ہی بات ہو چکی تھی، بہرحال ہم لوگ تکیہ کلاں میں مہمان خانہ کے سامنے نیم کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر مولانا کے چشم براہ تھے، تھوڑی دیر بعد مولانا سامنے والے گھر سے تشریف لائے اور ہم سب سے بڑی گرم جوشی ومسرت سے ملے، میرا داخلہ دوم مکتب میں ہوا اور مکتب کے درجات تکیہ کلاں ہی میں مولانا کے خاندان کے ایک

خالی گھر میں لگا کرتے تھے، جہاں گاؤں اور خاندان کے چھوٹے بچے بچیاں پڑھنے کے لیے آیا کرتے تھے، اس مکتب میں حسنی خاندان کی ہی عالمہ فاضلہ خواتین تدریس کے فرائض انجام دیتی تھیں، اسی زمانہ میں مولانا کی اکلوتی بیٹی سیدہ حمیرہ بھی پڑھا کرتی تھیں اور وہ مجھ سے ایک سال آگے درجہ سوم مکتب میں تھیں، میں دو سال وہاں رہا اور مجھے کبھی بھی ایسا نہیں لگا کہ میں اس خاندان سے علیحدہ ہوں، میں مولانا کے خاندان کے ایک بچہ کی طرح تھا، سبھی اس وقت کے خاندان کے بچے مجھے جانتے اور میں انھیں جانتا، ساتھ کھیلنا پڑھنا ہوتا، بے تکلف گھروں میں آنا جانا تھا اور سارے گھر والے بڑی شفقت ومحبت سے پیش آتے۔ ایک موقع پر میں مکتب کے باہر کچھ ایسے لڑکوں کے ساتھ کھڑا تھا جو مکتب میں نہیں پڑھا کرتے تھے، وہ پاس کے گاؤں سے وہاں کھیلنے آئے ہوئے تھے، اسی وقت مولانا کی اہلیہ محترمہ گھر سے نکل کر سامنے کسی عزیز کے گھر جارہی تھیں، ان کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی تو وہ رک گئیں اور مجھے بلا کر اپنے بچے کی طرح سرزنش کی اور مکتب جانے کو کہا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مولانا سے جو ہمارا تعلق تھا صرف انھی کی ذات تک محدود نہیں بلکہ یہ تمام گھر والوں کے ساتھ قائم ہو گیا تھا۔

جب میں ثانویہ کے درجوں کے لیے معہد دار العلوم سکروری آ گیا، تو اسی سال ۲۰۰۶ء کے اواخر میں جب معہد میں میرا پہلا سال تھا، ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد رابع حسنی دامت برکاتہم معہد تشریف لائے تھے، ان کے ہم راہ مولانا بھی تھے، جب میں مولانا سے جا کر ملا تو مولانا بہت ہی پر تپاک انداز سے ملے اور سب سے پہلے یہی کہا کہ تمہیں رائے بریلی میں سب لوگ بہت یاد کرتے ہیں اور گھر کا فون نمبر دیا بات کرنے کے لیے، بعد میں میری سب سے بات بھی ہوئی، یہ

سارے واقعات گہرے تعلق کے غماز ہیں۔ معہد کی مسجد میں ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد مولانا مجھے مسجد کی چھت پر لے گئے یہ کہتے ہوئے کہ چلو مجھے اپنے مدرسے کا نظارہ کراؤ، جب ہم چھت پر پہنچے تو میری جیب میں مولانا نے اپنی جیب سے جو کچھ پیسے تھے، بغیر دیکھے گنے ڈال دیے، تب مجھے پتہ چلا کہ مولانا کا چھت پر جانا تو صرف ایک بہانہ تھا میری جیب بھرنے کے لیے۔

اسی ضمن میں مولانا سے ایک اور ملاقات یاد آتی ہے، ۲۰۰۸ء میں جب والد صاحب کا ہندوستان آنا ہوا اور ندوہ بھی جانا ہوا، تو مولانا رائے بریلی سے ندوہ محض والد صاحب سے ملاقات کرنے کی غرض سے تشریف لائے، اس ملاقات کی بھی بہت اچھی یادیں ہیں، مولانا نے اپنی ایک نئی کتاب جو مولانا ابرار الحق صاحب کی سوانح حیات پر لکھی تھی مجھے تحفہ میں دی، جو تازہ تازہ شائع ہو کر منظر عام پر آئی تھی، ایک دن ظہرانہ پہ ہم لوگ مولانا عمار حسنی صاحب کے یہاں مدعو تھے، ساتھ میں ہم لوگ ندوہ سے امین آباد گئے، جہاں حسنی خاندان کے کافی مکانات ہیں اور ایک لمبی مدت سے وہاں یہ خاندان بسا ہوا ہے، بہر حال مولانا عمار صاحب کے یہاں بہت اچھی محفل لگی اور وہاں میں نے اپنی آنکھوں سے خلوص و محبت کے نمونوں کا مشاہدہ کیا، کس محبت سے آپس کے یہ دوست مل رہے تھے! کیسی الفت تھی! قلم قاصر ہے اس کو بیان کرنے سے، عصر کی نماز کے بعد جب ہم تینوں لوگ ''میں، والد صاحب اور مولانا'' ندوہ کے لیے نکلنے لگے تو مولانا ہم کو اپنے ساتھ گھر لے گئے اور ایک خاندان کی بزرگ خاتون سے میرا تعارف کرایا اور دعائیں دلوائیں، مجھے نہیں معلوم کہ وہ برگزیدہ صالحہ خاتون کون تھیں۔

اسی طرح مجھے ایک اور مولانا سے تاریخی ملاقات یاد آتی ہے، ۲۰۱۰ء میں

معہد دار العلوم سکروری میں ایک بڑا پروگرام تھا، جس میں ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء حضرت مولانا رابع حسنی ندوی صاحب اور مولانا واضح رشید حسنی صاحب مرحوم تشریف لائے ہوئے تھے اور مولانا بھی ساتھ میں آئے تھے، طلباء کا ایک ہجوم تھا، آس پاس کے مدارس سے بھی بہت سارے طلباء جمع ہو گئے تھے اور مہمانوں کی کثرت تھی، اس بھیڑ میں مولانا نے مجھے یاد کیا اور ایک معہد کے استاد سے کہا کہ وہ مجھے بلوائیں، جب میں مہمان خانہ میں حاضر ہوا، جہاں بڑے بڑے اساتذۂ کرام اور دور دراز سے آئے ہوئے مؤقر مہمان موجود تھے، جہاں عام طلباء کا جانا مشکل تھا، وہاں مولانا مجھے دیکھ کر بہت فرحت و انبساط کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھے اور بڑی گرم جوشی سے ملے، ایسا لگا کہ کوئی والد اپنے بیٹے سے مدتوں بعد مل رہا ہو، جلسے میں مجھے اپنے پاس بٹھایا، یہ منظر دیکھ کر تمام طلباء اور حاضرین جلسہ حیران تھے، مولانا کی یہ توجہ وعنایت میرے لیے باعث فخر تھی، جلسہ کے اختتام کے بعد مولانا میرا ہاتھ پکڑے ہوئے مجھے حضرت مولانا رابع صاحب اور حضرت مولانا واضح صاحب سے ملاقات کرانے کے لیے لیے گئے اور دونوں بزرگوں سے یہ کہتے ہوئے ملاقات کرائی کہ یہ وحید بھائی کے لڑکے ہیں۔

۲۰۱۱ء میں جب میں امارات آگیا (اور تا حال یہیں مقیم ہوں) اس عرصے میں مولانا سے میری کئی بار فون پر بات ہوئی، جب بھی میں فون کرتا، مولانا بہت خوش ہوتے اور دعائیں دیتے اور مولانا اپنی جدید شائع شدہ کتابوں کا تذکرہ کرتے اور مجھے وہ کتابیں ارسال بھی کیا کرتے تھے، میں نے مولانا کی ”سیرت داعی اسلام حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمہ اللہ علیہ“ کا بڑے ذوق وشوق سے مطالعہ کیا اور کتاب کو بہت مفید اور پر از معلومات پایا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ کتاب دینی طالب

علموں کی تربیت اور ان کی ذہن سازی کے لیے بے انتہا مفید ہے اور مولانا نے اس کتاب میں حضرت مولانا عبداللہ حسنی صاحب کے سفرِ مصر کے تذکرہ میں والد صاحب کا بڑا زبردست تعارف کرایا ہے، اس لیے کہ والد صاحب ان دنوں جامعہ ازہر ہی میں اپنی تعلیم کے آخری مرحلے میں تھے، مولانا میری علمی صلاحیت اور ترقی سے بہت خوش ہوتے تھے، کیونکہ وہ ہمیشہ اس بات کے خواہاں تھے کہ میں دل جمعی اور یکسوئی کے ساتھ علم کے میدان میں آگے بڑھوں اور میری علمی استعداد اور میرا علمی معیار کبھی نہ گرے، ان کی اس فکرمندی کو میں نے ہر ملاقات میں محسوس کیا۔

مولانا کا یوں رخصت ہو جانا ایک بہت بڑا سانحہ ہے، ان کی رحلت کو ندوہ و حسنی خاندان اور تمام متعلقین کبھی فراموش نہ کر سکیں گے، ہمیشہ انھیں یاد رکھا جائے گا، مولانا ایک منکسر المزاج عالم دین تھے، سادہ طبیعت انسان تھے، ایک خاموش زبردست مبلغ اور قلم و تحریر کے شہسوار تھے، سوانح و سیرت نگاری میں ان کا ایک خاص ذوق تھا، اولیاء اللہ صوفیائے کرام سے بہت لگاؤ رکھتے تھے اور خود بھی نیک طبیعت صوفیاء و صالحین کے نقش قدم پر تھے، خاکساری و تواضع ان کی گھٹی میں تھی، مولانا کی کتابیں و مضامین پڑھنے سے یقیناً ہر قاری یہ نتیجہ اخذ کرے گا کہ ان کو اللہ نے کتنا عمدہ قلم دیا تھا اور ان کو واقعات بیان کرنے کا کیسا سلیقہ و ملکہ عطا کیا تھا، اسلوب نہایت سلیس سہل اور ہر قسم کے تکلف سے پاک تھا، اللہ نے انہیں خاندانی قلم دیا تھا اور وہ ایک خاندانی عالم دین و مبلغ ہونے کے ساتھ ساتھ وہبی صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور تھے، علم کے ساتھ ساتھ عمل کی دولت سے بھی مالا مال تھے، انتہائی سادگی اور تقویٰ و زہد سے بھری زندگی گزار گئے اور ہم سب کو سوگوار چھوڑ گئے، یقیناً جو ایک مقولہ مشہور ہے ''موت العالم موت العالم'' پوری طرح ان پر منطبق ہوتا ہے، ان کے انتقال سے ایک ایسا خلا

پیدا ہوا ہے جسے پر کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے، بقول سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ ''لوگوں کی ہلاکت اس وقت ہوتی ہے، جب ان کا عالم فوت ہو جائے۔'' کیونکہ ایک عالم لوگوں کا مربی ہوتا ہے، ان کی روحانی تربیت کرتا ہے اور روحانی اصلاح ہی درحقیقت ایک حیات جاودانی ہے۔

مولانا ایک عرصہ سے علیل چل رہے تھے، بہت علاج و معالجہ ہوا، لیکن تقدیر الٰہی کو کچھ اور ہی منظور تھا، ان کی رخصت ہو جانے کی اطلاع بہت ہی دل خراش تھی، ان کا ہمارے درمیان سے چلا جانا ایک بہت بڑا المیہ ہے اور ان کے سانحہ ارتحال سے پورے ندوہ اور امت کا نقصان ہے، مولانا بحث و تحقیق، دعوت و تبلیغ کے میدان میں ایک ابھرتے ہوئے عظیم داعی و مصلح تھے۔

مولانا کا کوئی نعم البدل نہیں، ایسی شخصیت کا کوئی بدل ہو ہی نہیں سکتا، میرا جوان سے تعلق ہے اسے کیا لکھوں، اس بات میں کوئی شائبہ نہیں کہ اس دکھ کی گھڑی میں ان کے اہل خانہ کے ساتھ ہم سب برابر کے شریک ہیں، ہم بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہیں کہ اللہ مولانا کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے، جنت الفردوس میں بلند درجات اور مقام عطا فرمائے، اعلیٰ علیین شہداء و صدیقین میں انھیں عظیم رتبہ سے نوازے، پسماندگان و حسنی خاندان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

ایسا کہاں سے لائیں کہ تم سا کہیں جسے

مولانا محمد صغیر ندوی
(عزیز کالج گولہ گنج۔لکھنؤ)

راقم سطور کی نظر میں مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی رحمہ اللہ جواں مرگ عالم دین، نہایت نیک صالح، دین دار و دیانت دار شخص تھے، شرافت و مروت تو خاندانی ورثہ میں ملی تھی، ایک خصوصیت جوان کو خاندان کے دوسرے افراد سے ممتاز کرتی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ انتہائی متواضع اور منکسر المزاج تھے، ان کی بے نفسی وانکساری نایاب نہیں تو کم یاب ضرور تھی، اس پر مزید یہ انتہائی خلیق وملنسار شخص تھے، جس سے بھی ملتے بڑے احترام وتواضع سے ملتے، ان کا یہی تواضع لوگوں کوان کا گرویدہ بنادیتا، میں بھی ذاتی طور پر ان کی اس صفت سے بہت متاثر تھا اور عمر میں ان سے بڑا ہونے کے باوجود ان کا بڑا احترام کرتا تھا، کبھی کبھی جمعہ کی نماز مسجد کریم شاہ صاحب میں پڑھتے، بڑی گرم جوشی اور تپاک سے ملتے ؎

جی چاہتا ہے نقش قدم چومتا چلیں

مولانا اپنی ذات سے تو بیش قیمتی جوہر تھے ہی، مزید برآں یہ کہ خاندان کے بزرگوں کی رہنمائی اور تربیت نے تراش کر انہیں کوہ نور بنا دیا تھا، سوانح نگاری ان کا سب سے محبوب علمی مشغلہ تھا اور اس میدان میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا، کوئی علمی شخصیت اس دار فانی سے کوچ کرتی نہیں کہ چند ہفتوں میں ہی اس کی سوانح حیات زیور طبع آراستہ ہوکر منظر عام پر آجاتی، اس میدان میں ان کی طبیعت کی جولانی اور ان کے قلم کی روانی دیکھتے ہی بنتی تھی، سوانح نگاری کے علاوہ تاریخ نویسی بھی ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔

مولانا موصوف ہمیشہ علمی افادہ اور استفادہ میں لگے رہے اور شاید یہی وجہ تھی کہ اپنی صحت پر خاطر خواہ توجہ نہیں دے پائے، نتیجتاً صحت روز بروز گرتی گئی اور جب صحت کی طرف توجہ کی تب تک بہت دیر ہو چکی تھی، میں ہمیشہ ان کی صحت کے حوالہ سے متفکر رہتا اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا منصور حسن حسنی ندوی اور ان کے چچا مولانا سید محمد عمار حسنی ندوی دامت برکاتہم وغیرہ سے ان کی طبیعت کے متعلق دریافت کرتا رہتا، لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کی عمر اتنی ہی لکھی تھی: ”اذا جاء أجلهم لا يستاخرون ساعة ولا يستقدمون“ بارگاہ الٰہی میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

خراج عقیدت

حضرت مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ

(تاریخ وفات: ۱۳؍محرم ۱۴۴۴ھ/ ۱۲؍اگست ۲۰۲۲، بروز جمعہ)

محمد زاہد حسین زاہدؔ ندوی (جمشید پور-جھارکھنڈ)

اسلام کے فرزند تھے، ایماں میں غنی تھے
تھے صاحبِ اوصاف، حقیقت میں ولی تھے

توحید و رسالت کے تھے غیور محافظ
نسبت میں وہ فرزند حسنؓ ابن علیؓ تھے

اک عاشق صادق تھے خدا اور نبیؐ کے
عامل تھے وہ سنت پہ، صحابہؓ کے وفی تھے

بے تاج وہ اک شاہ تھے تاریخ و سیر کے
غواص کتابوں کے، قلم کے وہ دَھنی تھے

قرآں کی تلاوت کا شغف خاص تھا اُن کو
تھے ذاکر و شاغل مگر احوال خفی تھے

آدابِ سحر خیزی کا رکھتے تھے وہ معمول
اک زاہد مرتاض اور اک عبد تقی تھے

تھی قدر بزرگوں کی تو چھوٹوں پہ کرم بھی
ہر ایک کے ناصح تھے، طبیعت کے سخی تھے

عالم تھے شریعت کے طریقت میں بھی رہبر
احسان وتصوف کا اک عنوان جلی تھے

طلبہ کے ہی جھرمٹ میں رہا کرتے تھے اکثر
ایسے وہ گئے بیچ سے لگتا ہے ابھی تھے

سوانحی ادب کا خورشید جہاں تاب

مولانا فتح محمد ندوی
(سہارنپور-یوپی)

ایک سورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اٹھا
آنکھ حیران ہے کیا شخص زمانے سے اٹھا

غموں کی تمازت میں اس وقت مزید شدت بڑھ گئی جب کانوں کی سماعت سے یہ جاں گسل خبر ٹکرائی کہ خانوادۂ حسنی کے چشم و چراغ مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی بھی رفتگان کی فہرست میں شامل ہو گئے، یہ خبر کئی اعتبار سے ہمارے لیے کوفت کا سبب بنی۔ لاریب آپ ندوۃ العلماء کے ان قابل فخر فرزندوں میں شامل تھے جن کی علمی جامعیت، فکر و خیال میں وسعت اور توازن، قدیم و جدید کی نافعیت کے مثالی پیکر، ادب و انشاء میں باکمال، بلکہ ایک شان امتیاز، قلم و کتاب کے رسیا، مسلکی عصبیت اور گروہ بندی سے ذہن و دل پاک وصاف، حسن اخلاق اور حسن کردار کے پابند، سب سے بڑھ کر صلح کل کے عملی مصداق، بلکہ اقبال مرحوم کے اس شعر کے خیال کے لیے ترجمان:

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

اس حادثہ کا گہرا صدمہ پورے حسنی خاندان کو ہے، خصوصاً ہم سب کے مشفق و مربی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کے لیے سید محمود حسن حسنی ندوی کا عظیم سانحہ سب سے زیادہ دکھ اور غم کا باعث ہوگا۔ مخدوم و مربی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کو عمر کی اس منزل میں کتنے ہی پہ در پہ صدمے سہنے پڑ رہے ہیں۔ والدین، بھائی، بہنیں، داماد اور دیگر قریبی عزیز و اقارب اور اب اپنے جواں بخت اور جواں سال نواسے کو سپرد خاک کیا۔ بلا مبالغہ آپ کی زندگی غموں کا ایک پہاڑ ہے۔ مزید غموں کی اثر انگیزی سے انکار بھی ممکن نہیں، ہلکا سا غم بھی شعلہ جہاں سوز بن جاتا، تاہم آپ کا صبر و تحمل خانوادۂ نبوت کے گھرانوں کا صبر و تحمل ہے۔

آپ کی صلاح اور صالحیت، نیکی اور طبعی شرافت، علمی اور روحانی تربیت، بلکہ اقلیم قلب کی تطہیر، فہم و بصیرت کی پختگی، صحت کی ضیا پاشی اور آب یاری میں جو عناصر شامل ہیں وہ خاندان حسنی اور حسینی کی وہ ادائیں دل بری ہیں جو صدیوں سے انسانیت کے ماتھے کا جھومر، اس کی آبرو کا تمغہ اور اس کی شان امتیاز کا عنوان اور اعلان ہیں۔ بقول اقبال مرحوم رومی کے نقطہ نظر سے ایک مرد کامل کا حقیقی معجزہ یہی ہے کہ وہ انسانی شخصیت کے حق میں حیات بخش اور حیات آفریں ہو۔ خود اقبال مرحوم کے نزدیک عظیم الشان انسان یا ہیرو وہ ہے جس کے اعمال و افعال نوع انسانی کے لیے چشمہ زندگی جاری کرنے والے ہوں۔ بلاشبہ یہ پورا خاندان بہ شمول مولانا سید محمود حسنی مرحوم کے صدیوں سے رومی اور اقبال کے اس نظریہ حیات کا حقیقی نشان امتیاز ہے۔ فضل الٰہی ہے کہ اس خاندان میں اتنے لمبے تسلسل کے ساتھ تاریخ کے مختلف ادوار میں ایسی ایسی با کمال اور با فیض شخصیات پیدا ہوتی رہی ہیں جن کے نفس گرم اور چشمہ

فضل وکمال اور فکر وخیال سے نسلوں کے افسردہ دلوں میں تازگی اور ایمانی حرکت و حرارت اور توانائی لوٹ آئی۔

انسان اپنے خاندانی اثرات اور ماحول سے عہدہ برآنہیں ہوسکتا۔ مولانا سید محمود حسنی مرحوم نے انہی اربابِ کمال کی علمی، فکری اور روحانی شخصیتوں سے کسب نور کر کے اپنی سیرت اور شخصیت کی تعمیر کی، پھر انہی خطوط پر چل کر اپنے خاندانی شرف وکمال کو باقی بھی رکھا، اس کی عظمت اور تقدس میں خوبصورت اضافے بھی کیے، یقیناً اس حوالہ سے حسنی خاندان کی تمام صفات اور کمالات کا آپ حسین گلدستہ تھے۔

مولانا سید محمود حسن حسنیؒ اپنے عہد کی عظیم شخصیتوں میں شمار تھے، جن کی علمی، تعلیمی اور قلمی فتوحات پر ایک زمانہ ناز کرتا تھا، آپ نے تعجب انگیز طریقے پر علم کے کئی شعبوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا خوبصورت ثبوت پیش کیا ہے بلکہ لوہا منوایا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ آپ کے معاصر آپ کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت کو نظر انداز کر کے صرف سوانح اور سیرت نگاری کے حصار میں مطالعہ کی کوشش کر رہے ہیں، جب کہ آپ کے حوالہ سے انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ سوانحی ادب کے اختصاص کے ساتھ ساتھ گوناگوں علمی میدانوں میں علمی فتوحات کا جو غیر معمولی ذخیرہ چھوڑا ہے، اس پر بھی سنجیدگی سے مطالعہ اور تحقیق ہونی چاہیے، کیونکہ آپ نے اپنی نگارشات کے ذریعہ تاریخ، تصوف، تذکرے، سیرت وسوانح اور ادب کے آنگن میں جو تخلیقی پھول کھلائے ہیں، ان میں بلا کا تنوع ہے۔

مولانا سید محمود حسنی مرحوم کی بڑی صفت اور کمال یہ تھا کہ آپ نے لمبی علالت کے سبب قوائے جسم کے حد درجہ متاثر ہونے کے باوجود بھی اپنے مشن کو موقوف نہیں کیا، ہر حال اور ہر صورت میں حرف وخیال سے ان کا رشتہ باقی رہا، ہمیشہ اپنے اسلاف کے روشن کارناموں کی تلاش وجستجو میں غواصی کرتے رہے، انہیں اسلاف سے ہمیشہ کی محبت اور عقیدت رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سوانحی تحریریں لکھتے وقت

آنسوؤں کے قطروں کو لفظوں میں جذب کیا ہے، ویسے بھی سوانحی تحریروں کا رشتہ چونکہ دماغ سے زیادہ دل سے مربوط ہوتا ہے، ہر غم کا زود اثر دل براہ راست قبول کرتا ہے، اس لیے دل کے سوز اور قلب کے گداز سے گذر کر جو تحریریں کاغذ کے سینہ پر نقش ہوتی ہیں، ان میں وہ کشش اور مقناطیسیت ہوتی ہے کہ قاری لاشعوری طور پر اس حزنیہ ماحول کا اپنے آپ کو حصہ سمجھنے لگتا ہے، لفظ، لہو اور آنسوؤں کے اشتراک کے بغیر سوانحی تحریریں اثر اور تاثیر سے محروم ہوتی ہیں، محمود حسنی مرحوم کی سوانحی تحریریں اسی جذبہ کی صداقت سے تشکیل پاتی ہیں، آپ کی جنبش خامہ سے نکلنے والی درجنوں کتابیں اکابر اور اسلاف کی احساس عظمت کے اعتراف کے ساتھ مشاہیر کے احوال وآثار پر سوانح نگاری کے عنوان پر حوالہ جاتی حیثیت رکھتی ہیں، سوانح شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جون پوری، تذکرہ حضرت مولانا زبیر الحسن کاندھلوی، سوانح حضرت مولانا ابرارالحق، تذکرہ مولانا عبد الباری ندوی بھٹکلی، تذکرہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، سیرت داعی اسلام حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی، عائشہ بی۔ اکابر اور مشائخ کی سیرت اور کردار پر یہ درجنوں علمی اور روحانی شاہ کار تخلیقات طالبین راہ حق کے لیے جہاں قیمتی سوغات ہیں، وہیں انسانوں کی کردار سازی اور ایمان افروزی کا پیغام اور ذریعہ بھی ہیں، ساتھ ہی مشاہیر اسلام کے احوال وکوائف سے اپنی نئی نسل کو ان کی عظمت، روشن اور تابناک ماضی کا احساس دلانا بھی ہے۔

آپ کا پورا اسلامی اور علمی سرمایہ خاص طور پر ''اہل دل'' اور خاصان خدا'' کی سوانح نگاری کا شوق اور جذبہ خاندانی وراثت کا حصہ ہے، حضرت مولانا علی میاں ندوی نے اپنے تصنیفی جذبہ کی تسکین کا آغاز حضرت سید احمد شہید کی سیرت وسوانح سے کیا تھا، مختصراً آپ کا پورا لفظی ڈکشن اپنے نانا حضرت مولانا محمد ثانی حسنی ندویؒ، مولانا علی میاں

ندویؒ، حضرت مولانا عبدالحی حسنیؒ کے لفظیات کی توسیع ہے، بلکہ آپ کی لفظیات اور نثری بیانیہ کا جو اسلوب ہے اس پر آپ کے نانا مولانا محمد ثانی حسنی ندوی کے کچھ اثرات دیکھے جاسکتے ہیں، جس طرح ان کے یہاں تحریری تسلسل کے ساتھ تفہیم اور ترسیل ہے، اس کے نمونے ہمیں سید محمود حسنی صاحب کے یہاں بھی ملتے ہیں، سید محمود حسنی مرحوم کے اسلوب میں بھی شفافیت اور صراحت کا بھرپور احساس ہے، بلکہ اپنے نانا مولانا محمد ثانی حسنی ندوی کی طرح ان کے نثری بیانیہ میں رعنائی اور تسلسل ہے۔

مولانا محمود حسنی ندوی مرحوم کے سوانحی تحریروں کا یہ کمال تھا کہ وہ ماتمی احساس کو اعتبار کا روپ بڑی خوبصورتی سے عطا کرنے میں کامیاب ہوجاتے، بیان کے اختصاص کا مظہر اور انفراد ہے، دسیوں مشاہیر کی ضخیم سوانحی خاکوں پر ان کی کتابوں میں ہر شخصیت کے داخلی اور خارجی اظہار پر قلمی گل کاریاں اس بات کا مکمل ثبوت ہوتے ہیں کہ آپ نے اپنی پسندیدہ شخصیات کے ہر پہلو پر اتنی خوبصورتی اور حسن کمال سے لفظی پیرہن عطا کیا ہے کہ ان کی تمام تحقیقات ان شخصیات کے انعکاس کا عنوان بن گئی۔ حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی مرحوم پر اپنے ماتمی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی میں جو انسانی ہمدردی، ملی حمیت، دینی غیرت اور احساس ذمہ داری تھا، اس نے ان کو پھر کسی پل چین سے بیٹھنے نہ دیا اور وہ بڑے مومنانہ حوصلہ وعزیمت کے ساتھ ان تینوں کے مقابلہ میں اور نئی نسل کے ایمان وعقیدہ کے تحفظ کی کوشش میں کمربستہ ہوگئے اور اس کے لیے انہوں نے لٹریچر کے ذریعہ اور خطابات کے ذریعہ اور ملاقات ومراسلات کے ذریعہ متوجہ کرنے اور لوگوں کو کھڑا کرنے کا کام کیا۔‘‘

محمود حسنی صاحب نے اپنے جہان علم اور وسیع سوچ کے کینوس سے لفظوں کا جو نگار خانہ سجایا تھا اس میں تنوع اور کسی قدر وسعت ہے، لاریب ان کے یہاں سوانح اور سیرت نگاری کا غلبہ اور اختصاص ضرور ہے، تاہم دیگر موضوعات پر بھی انہوں نے کامیابی سے سفر طے کیا ہے، مثلاً حضرات صحابہ سے لے کر عہد حاضر تک تمام مصلحین، محدثین، سلاطین کی اصلاح وتربیت پر ان کی شاہکار تصنیف ''تاریخ اصلاح وتربیت'' پر ایسا عظیم کارنامہ ہے جو ان کی علمی اور تاریخی بصیرت کو ہمیشہ استناد اور اعتبار بخشتا رہے گا، علمی جہات میں ان کا ایک اہم کام وہ کتابوں پر تبصرہ ہے، جب سے آپ ''تعمیر حیات'' سے وابستہ ہیں، آپ نے سینکڑوں علمی، تاریخی، سوانحی مذہبی اور دیگر موضوعات سے کتابوں پر تبصرے کیے ہیں، انہوں کبھی کسی تبصرے میں کسی شخصیت کے حوالہ تفریق نہیں کی، بلکہ وہ بغیر کسی تفریق کے مصنف کے بیان اور خیالات تک پہنچ کر نتائج حاصل کرنے کوشش کرتے، جس میں اخلاقی دیانت کے ساتھ کتاب کا عکس آجاتا، یہی ان کا کمال تھا کہ وہ تبصرہ میں سادگی کے ساتھ احساس اور مشاہدہ کی قوت کو بروئے کار لاکر مصنف کتاب اور اس کے مضامین کے رشتے اور خیال کو صفحہ قرطاس کے حوالہ کر دیتے، سید محمود حسنی ندوی صاحب اپنے پیچھے یادوں کا جو سلسلہ چھوڑ کر گئے اس کے عنوان مختلف ہیں، خود ان کی اپنی شخصیت، ندوۃ العلماء کی علمی، فکری اور ادبی روایتوں کے محافظ، خانوادۂ حسنی کی روحانی، تصنیفی، ذوق جمال، حسن اخلاق اور حسن عمل کے وارث اور امین!

اتنے عنوان ایک شخص کی ذات میں آویزاں تھے، یقینی طور پر آپ کا حادثہ کسی ایک فرد یا خاندان کا ماتم نہیں، بلکہ یہ پوری ملت کا اجتماعی غم اور صدمہ ہے، بقول شاعر ؏

غم فراق سے ہے دیدۂ چمن نم ناک

بلند اوصاف شخصیت

مولانا محمد یوسف بیگ ندوی قاسمی
(مہتمم مدرسہ عربیہ خیر العلوم- بنگلور)

مولانا سید محمود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے فراق سے دل غم زدہ ہے، کیونکہ ایسا استاد میں نے بہت کم دیکھا جو طلباء کی تربیت واصلاح کے لیے ہمیشہ بے چین رہتا ہو، ہمیشہ طلباء آپ کو چاروں طرف گھیرے رہتے تھے اور آپ علمی، اصلاحی، تاریخی حقائق سے آگاہ کرتے تھے اور طلباء میں بے پناہ علمی ذوق وشوق پیدا ہو جاتا تھا، اسلامی تاریخ آپ کا خصوصی فن تھا، آپ حضرت مولانا علی میاںؒ کے خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں، سلاسل اربعہ اور آپ کی دیگر کئی تصنیفات وتالیفات ہیں، تہذیب الاخلاق حدیث کی کتاب آپ نے ہمیں پڑھائی، آج بھی اس کی لذت مجھے محسوس ہوتی ہے اور آپ یاد آتے ہیں، آپ کے کئی اوصاف ہیں جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا، آپ کے سینکڑوں شاگرد ہیں جو آپ کی نجات کے لیے کافی ہیں، آپ مجلہ ''تعمیر حیات'' کے نائب مدیر بھی تھے، حضرت مولانا علی میاں

صاحب نور اللہ مرقدہ اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی زید مجدھم کی رفاقت میں آپ رہتے تھے اور ان کے خطوط قلمبند کرتے اور مجلس میں کتابیں پڑھتے تھے اور خدمت ورہنمائی میں رہتے تھے۔

آپ کی سعادت وعلو درجات کے لیے یہی کافی ہے کہ ان بزرگوں کا اعتماد آپ کو حاصل تھا، اللہ تعالیٰ آپ کے اہل خانہ و متعلقین وطلبائے عظام واہل ندوہ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مولانا کو اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے۔ آمین!

میکدہ سے اٹھ گیا وہ ساقی مینا بدوش

مولانا محمد طاہر ندوی
(سب ایڈیٹر بصیرت آن لائن و ہفت روزہ ملی بصیرت۔ممبئی)

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مایہ ناز استاذ، حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے نورِ نظر، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم و آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر سیدی و مرشدی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے قلب وجگر، خانوادۂ حسنی کے چشم و چراغ، معروف صاحبِ قلم و قرطاس، صاحبِ فکر و عمل، صاحبِ طرزِ تحریر، مشہور سوانح نگار، کئی کتابوں کے مصنف ومؤلف، ماہنامہ ''رضوان'' لکھنؤ کے معاون مدیر، دارِعرفات رائے بریلی کے ترجمان ''پیام عرفات'' کی مجلس ادارت کے رکن خاص، مجلہ ''تعمیر حیات'' لکھنؤ کے نائب مدیر حضرت مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ آج دارِ فانی سے دارِ بقا کی طرف کوچ کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

ابتدائی حالات:

حضرت مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۲/ جولائی ۱۹۷۱ء کو سر زمین لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ایک مکتب سے حاصل کی۔ پھر ابتدائی عربی درجات کی تعلیم کے لیے مدرسہ ضیاء العلوم تکیہ کلاں رائے بریلی تشریف لے گئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آپ دار العلوم ندوۃ العلماء تشریف لائے، جہاں آپ نے عالمیت کی سند حاصل کر کے مدرسہ ضیاء العلوم سے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

آپ کی عظیم ترین خدمات:

حضرت مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسے شخص تھے جو اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بڑی ضخیم ضخیم کتابیں اور سوانح عمری جو کئی کئی جلدوں میں ہیں اتنی کم عمری میں تصنیف وتالیف فرمادیں جو کم ہی لوگوں کو نصیب ہوئی ہیں۔

عائشہ بی:

آپ نے ہمشیرۂ مفکر اسلام، ریاض الصالحین کی اردو مترجم، محترمہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم رحمہا اللہ کے حالات وواقعات اور علمی وروحانی کمالات پر ''عائشہ بی'' کے نام سے ۳۲۸ صفحات پر مشتمل ایک عظیم سوانح لکھی جس کی کمی سالوں سے علمی وروحانی حلقوں میں محسوس کی جارہی تھی۔

تذکرہ حضرت مولانا محمد زبیر الحسن کاندھلویؒ:

اسی طرح آپ نے ''تذکرہ حضرت مولانا محمد زبیر الحسن کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ''

کے نام سے ۲۹۶ صفحات پر مشتمل ایک سوانح حیات لکھی، جس میں آپ نے ان کی خاندانی، سوانحی، دعوتی اور تبلیغی خدمات کا ایک اجمالی جائزہ لے کر سپرد قرطاس کر دیا۔

سیرت داعی اسلام حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ:

آپ کی عظیم خدمات میں ایک معلم، مبلغ، داعی، رہبر شخصیت، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمان و خلیفہ، ان کی تحریک ''پیام انسانیت'' کے قائد اور ملت کے حکیم و مصلح اور مرشد ہستی کی سوانح حیات بھی داخل ہے، جسے زمانہ ''سیرت داعی اسلام حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ'' کے نام سے جانتا ہے۔ جس میں شخصی احوال، علمی کمالات، ارشاد و تربیت، دینی، دعوتی و تبلیغی جدوجہد، ملکی و بین الاقوامی اسفار، تحاریر و تقاریر کے زریں اقتباسات اور ان کے تئیں علمی حلقوں میں پائے جانے والے قیمتی تاثرات کا ایک باب بھی ہے جو آپ کے مقام و مرتبہ کو ظاہر کرتا ہے۔

تذکرہ مولانا عبدالباری ندوی بھٹکلی رحمۃ اللہ علیہ وسوانح حضرت مولانا ابرار الحق حقی رحمۃ اللہ علیہ:

اسی طرح آپ نے ایک عظیم داعی، خطیب، مبلغ، معلم، مربی شخصیت پر قلم اٹھایا اور ''تذکرہ مولانا عبدالباری ندوی بھٹکلی رحمۃ اللہ علیہ'' کے نام سے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ان کے ایمان افروز و روح پرور حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی۔ اسی طرح آپ نے ''سوانح حضرت مولانا ابرار الحق حقی رحمۃ اللہ علیہ'' کے حالات زندگی کو ۲۳۶ صفحات پر لکھا۔

تاریخ اصلاح وتربیت:

آپ کی عظیم ترین خدمات میں اگر ''تاریخ اصلاح وتربیت'' کا تذکرہ نہ ہوتو یہ ظلم عظیم کے مرادف ہوگا، جس میں آپ نے محسن عالم، خیر القرون کے مربی اول، دنیائے انسانیت کے مصلح اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ، خلفاء راشدین کے احوال، خانوادۂ نبوت کے چشم و چراغ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے تذکرے کو ۶۵۶ صفحات پر جمع فرمادیا ہے۔

تجدید معاشرت:

آپ کے علمی کمالات اور تصانیف و تالیفات کا سلسلہ کافی طویل ہے، جس میں ''تجدید معاشرت'' (از مولانا عبدالباری ندوی بھٹکلی) نامی کتاب بھی شامل ہے، جس میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے عقائد، دیانات، عبادات، خاندانی و دیگر معاشرتی معاملات میں کن کن بنیادی باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور کن تجدیدی کوششوں کو واضح فرمایا ہے، آپ نے اس کتاب کی تحقیق و مراجعت اور تعلیق و ترتیب جدید کر کے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا۔

تاریخ وفات:

آپ رحمۃ اللہ علیہ گزشتہ کئی دنوں سے بیمار چل رہے تھے۔ علاج کے لیے چنڈی گڑھ بھی تشریف لے گئے۔ لیکن طبیعت میں بہتری نہ ہونے کی وجہ سے دوبارہ لکھنؤ کے ہی ایک ہاسپٹل میں زیر علاج تھے۔ ادھر آپ کے متعلقین، اہل خانہ، آپ کے چاہنے والے، آپ کے اساتذہ اور آپ کے شاگرد برابر آپ کی صحت یابی کے

لیے دعا کرتے رہے، لیکن اللہ کے یہاں فیصلہ ہو چکا تھا اور قضا کے فیصلے پر رضا ہی ہمارا ایمان ہے اور آج بتاریخ ۱۳؍محرم الحرام ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۲؍ اگست ۲۰۲۲ء بروز جمعہ آپ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللہ سے دعا ہے کہ اللہ آپ کی مغفرت فرمائے، درجات کو بلند فرمائے، آپ کی عظیم ترین خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے، اپنی رضا وخوشنودی نصیب فرمائے، آپ کے متعلقین واہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

جانے والے چلے جاتے ہیں لیکن ان کی یادیں ہمیشہ ساتھ رہتی ہیں، ان کی باتیں دلوں کو گرماتی رہتی ہیں، ان کے اقوال و افعال، اعمال و کردار، اخلاق و عادات، زندگی کی گراں قدر خدمات، تصانیف وتالیفات سے انشاءاللہ ایک زمانہ صدیوں تک اپنی علمی پیاس بجھاتا رہے گا۔

حق مغفرت کرے عجب مرد آزاد تھا

مولانا ابوصالح ندوی
(صدر جمعیۃ علماء ہند، نوادہ- بہار)

آج بروز جمعہ جیسے ہی موبائل کھولا اور گروپ ''عالمیت ۸۹ ندوہ'' دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا، جس کا ڈر تھا، جو اندیشہ تھا، بالآخر وہ سامنے آ گیا کہ مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ اب ہمارے درمیان نہیں رہے، کیا لکھوں کیا عرض کروں۔

دل کی کیفیت کیا بیان کروں، بس دل کی کیفیت عجیب سی ہوگئی جو ضبط تحریر سے باہر ہے، آنکھوں پر قابو نہ رہا، آنکھیں اشک بار ہوگئیں، بہت دیر تک اشکبار رہیں اور زبان سے سوائے ''اناللہ وانا الیہ رجعون'' اور ''حق مغفرت کرے'' کے کچھ اور نہ نکلا۔

ابھی کچھ روز قبل ہی ان کے بیمار ہونے کی اطلاع ملی اور ساتھ ہی ساتھ وینٹی لیٹر پر جانے کی افسوسناک خبر، مولانا کے لیے ہمہ وقت دعا کرتا رہتا کہ باری تعالیٰ انہیں مکمل صحت یاب فرمادے اور راقم الحروف کو یہ خوش خبری سنادے کہ مولانا روبہ صحت ہوکر اب گھر لوٹ آئے ہیں، لیکن پھر بھی کھٹکا لگا رہتا پتہ نہیں کیا حال ہے؟ مولانا محمود حسنی صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟ پھر دل کو یہ کہہ کر بہلا لیتا کہ مولانا اب ٹھیک ہوکر

گھر آ گئے ہوں گے، بعافیت گھر پہنچ چکے ہوں گے، لیکن موت نے جو اٹل حقیقت ہے، ان تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا، جس نے کہا ہے سچ کہا ہے ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج ان کی کل ہماری باری ہے

اور یہ بھی سچی حقیقت ہے کہ

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

اور

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

مولانا محمود حسن حسنی ندوی جن کو اب نور اللہ مرقدہ لکھنا پڑ رہا ہے، ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی؟ بمشکل ۵۰ر سال، مولانا تو ابھی جواں سال تھے، کم عمری ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے ؎

حق مغفرت کرے عجب مرد آزاد تھا

مولانا موصوف مادر علمی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ التحصیل تھے، راقم الحروف سے ایک سال جونیر، لیکن انہوں نے اپنی بے پناہ محبت ولگن، جدوجہد اور انتھک کوششوں سے اپنی کم عمری کے باوجود اپنے آپ کو اس مقام بلند پر پہنچایا، جہاں ہر ایک کی رسائی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، یہ سب مولانا مرحوم کی نیکی، شرافت، تقوی وطہارت اور اخلاص وللّٰہیت کی برکت اور ان کے بزرگوں کی دعائیں ہیں، سچ ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا بلاشبہ بڑے باصلاحیت، بڑے قابل، بڑے باکمال، بڑے بااخلاق، بڑے متواضع، منکسر المزاج، بڑے ملنسار، صاحب کردار، بڑے خوش اخلاق، سادہ مزاج، بڑے سنجیدہ، بڑے باوقار، مقبول ومعروف عالم دین، بڑے صاحب قلم، بہترین انشا پرداز، عظیم صحافی، عظیم داعی اسلام، علم دوست، وسیع المطالعہ، وسیع النظر، اپنے چھوٹوں پر سراپا مہربان، اپنے بڑے بزرگوں کے قدرداں، گونا گوں اوصاف وکمالات سے متصف، ہمہ جہت شخصیت کے حامل عظیم المرتبت انسان تھے، سچ ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا کوئی میرے درجہ کے ساتھی نہ تھے، نہ کلاس میٹ، نہ روم میٹ، نہ میں رائے بریلی میں رہا ہوں اور نہ تکیہ شاہ علم اللہ میں، مجھ سے ان کی انسیت ومحبت صرف اور صرف استاذی ومرشدی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب دامت برکاتہم العالیہ سے تعلق خاطر کے سبب تھی، مخدوم گرامی قدر سے میری قربت طالب علمی کے زمانہ سے رہی جو الحمدللہ دن بدن بڑھتی گئی۔

مولانا محمود حسنی صاحب حضرت مولانا ناظم اعلیٰ صاحب مدظلہ العالی سے میری بیعت کا شرف حاصل کرنے میں بڑے معاون ثابت ہوئے، راقم الحروف کی کتاب ''صحبتِ صالح ترا صالح کند پر'' حضرت مولانا دامت برکاتہم العالیہ کا نہایت قیمتی تبصرہ انہی کا مرہون منت ہے۔

جب ۲۰۱۳ء میں اپنے ادارہ دار العلوم فریدیہ روہ نوادہ بہار میں تعلیمی بیداری کانفرنس وجلسہ دستار بندی کا پروگرام رکھا گیا تو اس پروگرام کو نہایت کامیاب اور تاریخ ساز بنانے اور جانشین مفکر اسلام حضرت مولانا مدظلہ العالی کی تشریف آوری

کو یہاں یقینی بنانے میں محترمی الحاج شاہد حسین صاحب معاون ناظم اعلیٰ کے علاوہ دوسرا نام مولانا مرحوم ہی کا ہے اور خود بھی بنفس نفیس حضرت مولانا کے ساتھ شریک اجلاس ہونے اور موجود سامعین وحاضرین کے درمیان تقریباً ایک گھنٹہ نہایت پر مغز خطاب بھی کیا، ماشاء اللہ پوری تقریر دل پذیر محفوظ ہے۔

مولانا لکھنے پڑھنے کے بڑے رسیا تھے، گویا لکھنا پڑھنا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، اسی بے انتہا لکھنے پڑھنے کے باعث مولانا نے متعدد بڑی اہم کتابیں تصنیف وتالیف فرمائی ہیں، جنہیں اللہ نے شرف قبولیت سے بھی نوازا ہے اور یہ ذخیرۂ آخرت بھی ثابت ہوں گی، مولانا کو ندوہ اور فکر ندوہ سے بھی بہت مناسبت تھی، مولانا ندوہ کے بہترین ترجمان بھی تھے اور ''تعمیر حیات'' کے نائب مدیر بھی، تعمیر حیات میں مختلف کتب پر تبصرے بھی خوب کرتے اور بہترین تبصرے لکھتے، راقم الحروف کی کتاب ''صحبتِ صالح ترا صالح کند'' پر ایک وقیع تبصرہ مولانا نے قلمبند فرمایا تھا، اللہ تعالیٰ انہیں اس کا بہترین صلہ دے۔

مادر علمی سے فراغت کے بعد ندوہ مہمان خانہ جب بھی جانا ہوتا، مولانا سے ملاقات عموماً ہوتی اور کبھی کبھار تکیہ شاہ علم اللہ جاتا، حضرت ناظم اعلیٰ سے شرف ملاقات کے لیے، تو مولانا مرحوم سے ضرور ملاقات ہوتی، مولانا خیر خیریت کے بعد مختلف امور پر تبادلہ خیال کرتے اور ہمارے کاموں سے اپنی انتہائی خوشی کا اظہار کرتے، ہمت وحوصلہ سے نوازتے، خصوصاً تصنیفات وتالیفات کی طرف توجہ دلاتے اور ترغیب دیتے کہ کتابیں لکھیے، یہاں تک کہ مفکر اسلام رحمہ اللہ پر بھی لکھنے ترغیب دیتے، لیکن میں دل میں سوچتا کہ

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل

مولانا بڑے مہمان نواز بھی تھے، ایک بار کا واقعہ ہے جب استاذ محترم حضرت

مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سخت علیل تھے، خاتون منزل میں صاحب فراش تھے، میں حضرت کی عیادت کے لیے کشاں کشاں خاتون منزل چلا گیا، حضرت سے تو ملاقات نہیں ہوئی، لیکن برادرم مولانا محمود حسن حسنی ندوی سے ملاقات ہوگئی، مولانا نے ہم سے کہا کہ آپ مکتبہ اسلام گوئن روڈ میں رہیے، میں آپ سے کچھ دیر میں وہاں ملتا ہوں، میں وہاں چلا گیا، کچھ دیر میں ایک نوعمر نوجوان حسین وجمیل لڑکا نمودار ہوا، جو چہرہ مہرہ سے خانوادۂ حسنی سے تعلق رکھتا تھا، اس نے مجھ نو وارد سے میرا نام پوچھا اور جب اسے معلوم ہوا کہ ابوصالح ندوی ہوں تو وہ فوراً مجھ سے لپٹ گیا اور گرم جوشی سے مجھ سے معانقہ کیا اور گویا ہوا کہ آپ ہی ''صحبتِ صالح ترا صالح کند'' کے مصنف ہیں؟ میری روحانی ملاقات تو آپ سے پہلے سے تھی، آج آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی، یہ محترمی مولانا حمزہ حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ سابق ناظر عام ندوۃ العلماء لکھنؤ کے چھوٹے ندوی چشم وچراغ تھے، اللہ سلامت رکھے۔

مولانا محمود حسن حسنی ندوی بھی آ گئے اور ہمیں لے کر نظیر آباد پہلوان ہوٹل پہنچ گئے اور وہاں لسی اور شاہی ٹکڑے سے ضیافت فرمائی، یہ ہیں حسنی خاندان کے نہایت حسین وجمیل اخلاق واطوار وعادات اور خصائص۔

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کی شخصیت بڑی پر بہار اور علم دوست شخصیت تھی، مولانا کی اچانک رحلت ملک وملت کا عظیم ترین خسارہ ہے اور ساتھ ہی ساتھ راقم الحروف کا بھی عظیم ذاتی خسارہ، مولانا میرے بڑے کرم فرما اور مخلص رفیق تھے۔

اللہ ان کی قبر کو نور سے منور فرمائے، انہیں غریق رحمت فرمائے، بیوی بچوں اور تمام متعلقین، محبین ومنسلکین اور ہم سب لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

مولانا محمد فصیح الدین ندوی (حیدرآباد)

قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''زمین پر جتنے ہیں سب کو فنا ہے اور باقی رہے گی تمہارے رب کی ذات عظمتوں و بزرگی والی۔''

(الرحمن:۲۶-۲۷)

اللہ تعالیٰ کے اس عظیم ضابطہ کے مطابق ہر انسان عارضی وفانی دنیا میں اپنی مقررہ زندگی مکمل کر کے اللہ کے دربار میں حاضر ہوجاتا ہے، یہ ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ جس کا انکار آج تک کوئی نہ کرسکا، اسی اصول کے تحت روزانہ بے شمار لوگ اس دارِ فانی سے دارِ آخرت کی طرف ہمیشہ کے لیے چلے جاتے ہیں اور ایک دن ہمیں بھی جانا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے کرم سے اس کی بھرپور تیاری کرتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ان جانے والوں میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ جن کا چلا جانا اللہ کے فیصلے کے مطابق وقت پر ہی ہوتا ہے، لیکن ان میں موجود خوبیوں کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی تمنا وآرزو اور دعائیں ہوتی ہیں کہ ان کی عمر دراز سے دراز تر ہو، ایسے ہی عظیم لوگوں میں مولانا سید محمود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو اپنے بزرگوں کے سامنے ہی

اپنی کم عمری وعظیم خدمات کے ساتھ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مولانا سید محمود حسنی ندویؒ سے میرا زیادہ رابطہ اس وقت ہوتا جب وہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی حیات میں مفکر اسلام کے ساتھ اور حضرت کی وفات کے بعد جانشین مفکر اسلام مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ (ناظم ندوۃ العلماء) کے ساتھ حیدرآباد تشریف لاتے، جب بھی ملاقات ہوتی تپاک سے ملتے، محبت سے ہاتھ پکڑے رہتے اور فوراً ہی آپ کی کوئی نئی تصنیف ہوتی تو ہدیہ کرتے اور اچھی کتابوں کو خرید کر لوگوں تک پہنچانے کی ترغیب دیتے، جو کچھ کام ہم لوگوں سے ہو پاتا اس کی بہت تعریف کرتے اور ہمت افزائی فرماتے۔

۱۹۹۵ء میں میری فراغت کے بعد سے ان ۲۷؍سالوں میں وہ کئی مرتبہ حیدرآباد آئے، لکھنؤ اور ہندوستان کے کئی شہروں میں رابطہ ادب اسلامی کے سیمیناروں میں ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، لیکن میں نے ان کو بہت زیادہ قریب سے ان کے حیدرآباد کے آخری دو سفروں میں دیکھا، اول الذکر سفر نائب مہتمم ندوۃ العلماء استاذِ محترم حضرت مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی مدظلہ العالی کے ساتھ انہوں نے اس وقت کیا جب جانشین مفکر اسلام نے انہیں میزبان حسنی خانوادہ وعلماء حق جناب محمد بھائی پٹنی کے فرزند ارجمند محترم ابوالحسن پٹنی رکن شوریٰ ندوۃ العلماء کی وفات پر اپنے تعزیتی پیغام کے ساتھ بھیجا تھا، وہ پیغام جانشین مفکر اسلام کا تھا، اس کو قلمبند مولانا سید محمود حسنی ندویؒ نے کیا تھا، تاہم جب اس کو ابوالحسن بھائی کے رشتے داروں کے سامنے پڑھ کر سنانے کا موقع آیا تو نائب مہتمم صاحب کے اصرار کے باوجود محمود حسنیؒ نے وہ تحریر نہیں پڑھی، کہتے رہے کہ آپ پڑھیں، مجبوراً نائب مہتمم صاحب نے تفصیل کے ساتھ وہ پیغام ان کے رشتہ داروں کو اپنی کچھ وضاحتوں کے

ساتھ پڑھ کر سنایا، آپ اس سے اندازہ کریں کہ مولانا میں کس قدر تواضع اور اپنے بڑوں کا احترام تھا، ان کی موجودگی میں کسی طرح کی پیش قدمی انہیں گوارہ نہ تھی، اس میں ہم جیسے طالب علموں کو سیکھنے کے لیے عظیم سبق ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے بزرگوں کا احترام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

مولانا سید محمود حسنی رحمۃ اللہ علیہ کا وفات سے پہلے حیدرآباد کا آخری سفر علاج و معالجہ کی غرض سے برادر عزیز مفتی سید مسعود حسنی ندوی کے ساتھ ہوا تھا، مفتی مسعود حسنی ندوی ہمارے دوست اور ہمارے ہی بیچ کے ہیں، دوائی تو ہومیو پیتھک کی وجے واڑہ کے کسی ڈاکٹر کی جاری تھی، دو چار دن آرام کے لیے حیدرآباد آنا طے ہوا، حسنی خانوادہ سے قربت رکھنے والے ہمارے دوست سید قطب الدین ندوی و نثار احمد ندوی صاحبان کے مشورہ پر ہمیں یہ سعادت ملی کہ مولانا کا قیام ہمارے مدرسہ دار العلوم عثمانیہ راجندر نگر حیدرآباد میں رہے گا، چنانچہ مولانا دو چار دن یہاں رہے، ہم لوگوں نے اپنا بیشتر وقت مولانا کے ساتھ گذارا، اس وقت جو چیز میں نے خاص طور پر محسوس کی وہ یہ کہ مولانا کی ساری زندگی ”کُن فی الدنیا کأنک غریب أو عابر سبیل“ کی عملی تفسیر تھی، بیماری کی جن کیفیات میں تھے اسے سب سے زیادہ وہ اور رفیق سفر مفتی مسعود حسنی اور خانوادۂ حسنی جانتا تھا، لیکن جب بھی بات کرتے دین کی اور علم کی بات کرتے، اپنی تکلیف کا کبھی اظہار نہ کرتے۔

ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ فصیح بھائی ایسا لگتا ہے کہ ہم مر جائیں گے، لیکن قربان جایئے اس بندۂ خدا پر کہ اس کے بعد کوئی ایک جملہ بھی کہا ہو کہ میرے بعد میرا کیا ہوگا؟ یا میرے گھر والوں کا کیا ہوگا؟ ایسا لگتا تھا ان چیزوں سے انہیں کوئی مطلب ہی نہیں، بس وہ آخرت کے مسافر ہیں اور اسی کی تیاری میں مصروف ہیں۔

دوسری بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ کہ ان کا اللہ سے تعلق بہت قوی اور ان پر عبادت کا ذوق غالب تھا، میں اس بات کا چشم دید گواہ ہوں کہ ایک مرتبہ دوران قیام وضو کیا اور ضعف کی وجہ سے دو قدم چلتے ہی کرسی پر بیٹھ گئے اور وہیں نوافل شروع کر دی، یہ وہی آدمی کر سکتا ہے جو تعلق مع اللہ میں کامل اور ہمیشہ خدا کے ذکر میں ذاکر و شاغل رہتا ہو، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنی معرفت و تعلق عطا فرمائے۔ آمین!

جہاں تک آپ کی تصنیفات سے استفادہ کا تعلق ہے، میں نے ''حیات عبد الباری ندویؒ'' بالاستیعاب پڑھی اور ان کی بعض دیگر تحریریں بھی، میں اس میدان کا آدمی نہیں ہوں، ایک ادنیٰ طالب علم ہوں، تاہم میں نے آپ کی تحریروں میں جو بات محسوس کی وہ یہ کہ آپ کی زبان میں سلاست تھی، فکر و تحریر میں اعتدال تھا، کسی بھی شخصیت کے بارے میں جو کچھ لکھا اس کا حق ادا کیا، یہ ایک مصنف و سوانح نگار کا کمال ہوتا ہے کہ وہ شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے حقیقت بیانی و اعتدال کے دامن کو ہاتھ سے چھوٹنے نہ دے، یہ وصف مولانا سید محمود حسنی ندویؒ میں موجود تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ کی تحریریں شوق سے پڑھی جاتی ہیں، مولانا کے بعد اس طرح کے مصنفین بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔

بیشتر لوگ آپ کو ایک استاذ و مصنف اور سوانح نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن آپ ایک اچھے خطیب بھی تھے، عام گفتگو تو بہت آہستہ کرتے تھے، لیکن جب خطاب کا موقع ہوتا تو بہت بلند آواز و گھن گرج کے ساتھ خطاب کرتے، ایسا لگتا کہ اپنے دل کی بات کسی طرح لوگوں کے دل میں اتار دیں، یہ کیفیت خطیب میں اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ معاشرہ کے بگاڑ پر دن رات کڑھتا ہو اور اس کو پوری طرح ختم کرنے کے لیے ہر طرح کی قربانی دیتا رہتا ہو، مولانا مرحوم انہی لوگوں میں

سے تھے۔

مذکورہ چند خوبیوں کے علاوہ بے شمار خوبیاں آپ کے اندر موجود تھیں، ان سب کا احاطہ مجھ جیسے طالب علم کے لیے ناممکن ہے، بس اس دعا پر اپنی تحریر کو مکمل کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے، درجات بلند فرمائے، ان جیسی خوبیوں والوں کو پیدا فرماتا رہے اور ہمیں بھی ان کی اچھائیوں کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

مولانا محمد عمر عابدین
(المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

مولانا محمود حسنی ندوی اب ہمارے درمیان نہیں رہے، عمر عزیز کی کم و بیش پچاس بہاریں گزار کر وہ داغ فراق دے گئے، جہانِ بے ثبات سے منہ موڑ کر جہانِ ثبات و زیست کی جانب ہو لیے۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اِک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

مولانا مرحوم اخلاقی قدروں کے آئینہ دار، خاندانی روایتوں کے پاسدار اور حسنی نسبتوں کے تاجدار تھے، تواضع و انکساری کے پیکر اور مہمان نوازی کے خوگر تھے، جو ان سے ملتا ان کا ہو جاتا تھا، سادگی و درویشی میں ڈھلے اور قلندرانہ رنگ و آہنگ میں سجے سجائے تھے، سنجیدگی و متانت کے ساتھ ساتھ تبسم آمیز لب و لہجہ ان کی شخصیت کا عکس خاص تھا۔ ان گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے نہ جانے کتنوں کے دل و دماغ ان کے قائل و مائل ہو گئے۔

ہم نے ان کی شخصیت کی جلوہ سامانی اور مجلس ذکر کی سحر انگیزی کو رائے بریلی کی خانقاہ میں دیکھا، بڑے وجد و جذب کے ساتھ ذکر کرتے، دل کے تاروں کو چھیڑ دیتے، اہل دل کو آہ اور واہ کی منزلوں سے گزارتے، کوئی پارسا ہو کہ سیاہ کار اس ''روحانی لمس'' سے محروم نہ رہتا۔

وہ خانوادۂ علم اللّٰہی کے چشم و چراغ اور اس کی علمی وفکری روایت کے مشعل بردار تھے، صلاح وصلاحیت کا حسین امتزاج رکھتے تھے، تصوف وسلوک ان کے مزاج و مذاق کا حصہ ہی نہیں خاصہ بھی تھا، مگر ذکر وفکر کی گرما گرمی نے علم وقلم کی گہما گہمی اور صحرا نوردی میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کی، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے پیچھے لوح وقلم کی قیمتی جاگیریں چھوڑ گئے۔

انہیں بزرگوں کی تاریخ اور سوانح عمری سے خوب دلچسپی تھی، سینکڑوں صفحوں پر مشتمل کئی کتابیں لکھ ڈالیں، متعدد بزرگوں کے خاکے سپرد خاک ہونے سے پہلے سپرد قلم کردیے اور حیات جاوداں عطا کی۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ہندوستان میں کاروان تحفظ شریعت کے روح رواں اور میر کارواں ہیں، اس پر آشوب دور میں ان کی موجودگی و رہنمائی کتنے ہی فتنوں کو دبائے اور کتنے ہی اختلافات پر بند لگائے ہوئے ہے، مولانا محمود حسنیؒ ان ہی کے پروردہ اور تربیت یافتہ تھے، وہ حضرت مولانا کے مزاج شناس، حاضر باش اور خدمت گزار بھی تھے، ظاہر ہے باغباں ہی کسی ''شاخ آرزو'' کے سوکھنے کا غم محسوس کر سکتا ہے اور بات زخم دو زخم کی نہیں بلکہ صورت حال یہ ہے:

ایک دو زخم نہیں جسم ہے سارا چھلنی

گزشتہ چند برسوں میں آپ کے کئی عزیز بچھڑے اور بچھڑتے چلے گئے۔

حضرت مولانا عبد اللہ حسنیؒ، حضرت مولانا واضح رشید حسنیؒ، جناب مولانا حمزہ حسنیؒ اور اب جناب مولانا محمود حسنیؒ۔ ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، بارالہا! ان سب کو جوار رحمت میں جگہ دے اور بال بال مغفرت فرمائے۔ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب اور دیگر پسماندگان کی خدمت میں اس دل سوگوار کی جانب سے حرف تعزیت اور دعائے مغفرت پیش ہے۔

اس کارگہ حیات میں انسان کتنے ہی خواب دیکھتا، منصوبے بناتا اور خاکے تیار کرتا ہے، مگر یہ سب ریگ رواں اور فریب نظر سے زیادہ کچھ نہیں، خدا جانے کب دل کی ڈھرکن تھم جائے، نبض ہستی ڈوب جائے اور سانسوں کا یہ سفر رک جائے، حقیقت یہ ہے کہ "أنتم سلفنا و نحن بالأثر" کوئی طلسماتی جملہ نہیں بلکہ ایمانی بیانیہ ہے، جو غفلت شعاری، خدا فراموشی اور خود فریبی سے انسان کو باہر نکالتا ہے۔

حدیث کا یہ شہ پارہ نہ جانے کسی فرنگی شاعر John Donne تک کیسے پہنچ گیا، اس نے یہی بات اپنے انداز میں یوں کہی ہے:

"Any man’s death diminishes me, because I am involved in mankind, and therefore never send to know for whom the bells tolls."

(کسی بھی آدمی کی موت مجھے گھلا دیتی ہے، کیونکہ میں انسانی سماج کا حصہ ہوں، اس لیے یہ نہ پوچھو کس کی موت کا اعلان ہو رہا ہے؟ کیونکہ کسی کی موت کا اعلان دراصل آپ کی موت کا اعلان ہے۔)

جنہیں گذرنا تھا وہ گذر گئے، مگر یہ جگ بیتی کبھی بھی آپ بیتی بن سکتی ہے۔

اللهم إنا نسألك توبة مقبولة قبل الموت و كلمة طيبة عند الموت.

گلستان دین کے برگ وثمر محمود تھے

(مولانا محمود حسن حسنی ندوی ۱۹۷۱ء-۲۰۲۲ء)

حیدر میواتی ندوی

اہل علم و فضل کے نور نظر محمود تھے
علم و فن کی انجمن میں معتبر محمود تھے

نیکی و تقویٰ، تواضع، انکساری تھا شعار
لاڈلے اسلاف کے، لخت جگر محمود تھے

تھے سراپا حسن دیں، حسن یقیں، حسن عمل
صاحب نور بصیرت، دیدہ ور محمود تھے

ان کے سر پر شفقتیں مردان حق بیں کی رہیں
گلستان دین کے برگ و ثمر محمود تھے

داستانیں وہ سناتے تھے اکابر کی ہمیں
نازش اہل یقیں، اہل نظر محمود تھے

وعظ تھے بھرپور ان کے حکمت و دانائی سے
ایک ندوی القلم، بالغ نظر محمود تھے

پیکر صبر و عزیمت، مشعل راہ ہدیٰ
دین کے داعی ، نقیب و راہبر محمود تھے

صاحب خلق حسن تھے شیخ محمود حسن
سچ ہے حیدر وارث خیر البشر محمود تھے

جانے کیوں اک خیال سا آیا

مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی
(پوچری، دھنباد-جھارکھنڈ)

جس کا دغدغہ تھا بالآخر وہی ہوا، کیونکہ ہوتا وہی ہے جس کے ہونے کو کوئی روک نہیں سکتا، اَن ہونی کو ہوتے کس نے دیکھا ہے؟ شجر سایہ دار کا پتہ بھی ہلتا ہے، سوکھتا ہے پھر گرتا ہے، لیکن یہ اَن ہونی نہیں ہوتی، انسان کے سارے معاملات بھی ہونی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں، استقرارِ حمل سے لے کر آغوشِ قبر تک اس کے سارے پروگرام طے شدہ ہوتے ہیں، لیبر روم کے باہر ٹکٹکی باندھ کر دروازہ کی طرف دیکھنے والوں کے کان میں بچہ کی کلکاری پڑنے کے ساتھ جو آنسو آنکھوں سے نکلتے ہیں، کیا یہ اس طے شدہ پرگرام کا حصہ نہیں ہے؟ بچپن سے مراہقت پھر جوانی سے ادھیڑ عمری، پھر بوڑھاپا اور آخر کار آغوشِ قبر میں، یہ سب اسی پروگرام کا حصہ ہیں اور ہر صاحب ایمان کو اس پروگرام کی اطلاع بھی ہے، جس پر اس کا ایمان بھی کامل و مکمل طور پر ہے۔

لیکن انسان کی جو فطرت بنائی گئی ہے اور اس فطرت کے اندر جو ترس و ترحم

کا جذبہ رکھا گیا ہے، اس کی وجہ سے اس کا دل سنگ ہونے کے بجائے موم ہے، جس کی وجہ سے غم کی کیفیات میں اشکوں کی جھڑی لگ جاتی ہے، یہ بے ساختہ اور غیر اختیاری ہوتی ہے، اس کے روکنے پر انسان قادر نہیں رہتا، نہ اس کے بہنے پر کوئی پابندی ہے، یہ تو عین زندگی کی علامت ہے، یہ تو رحم وترس کا نشان ہے، یہ علامت تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ سے بھی ظاہر ہوئی ہے، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے سوال کیا: ''اے اللہ کے رسول! آپ بھی روتے ہیں؟'' جواب دیا: ''اے ابن عوف! یہ تو عین رحمت ہے۔'' مزید فرمایا:

''إن العین تدمع، والقلب یحزن، ولانقول إلاما یرضی ربنا، وإنا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون''

(آنکھ اشک ریز ہیں اور دل ماتم کناں، لیکن ہم تو وہی کہیں گے، جس سے ہمارا رب راضی ہو، بلاشبہ اے ابراہیم! تمہاری جدائی پر ہم مغموم ہیں)

آج ہمارا دل بھی غم واندوہ میں ڈوبا ہوا ہے، رہ رہ کر کسک محسوس ہو رہی ہے، بار بار آنکھوں کے سامنے ایک کشادہ جبیں کا مسکراتا چہرہ نمودار ہو رہا ہے، جو کثیف وبھرپور ریش والا ہے، مکمل طور پر کالے ریش، صحت مند وتندرست، بیماری کی کوئی علامت نہیں، وہ دیکھیے درجہ میں داخل ہو رہے ہیں، ایک موٹی سی کتاب ہاتھ میں ہے، تاریخ کی کتاب، اسلامی عظمت رفتہ کی تاریخ، طلبہ قلم وقرطاس سنبھال کر بیٹھ چکے ہیں، کتاب کھل چکی ہے اور وہ لکھوانے کے لیے تیار، وہ لکھوا رہے ہیں، طلبہ لکھ رہے ہیں، وہ بول رہے ہیں، طلبہ املا کر رہے ہیں، درمیان میں کوئی سوال کیا گیا، اس کا جواب دیا گیا، ایک طالب علم نے پوچھا: آپ کو نحو سے کتنا شغف ہے؟ جواب میں بتایا گیا کہ ایک نحو کے امام سے سوال کیا گیا اور کہا گیا کہ نحو کی روشنی میں

جواب دیں ''اگر نماز میں سجدہ سہو کر لینے کے بعد دوبارہ غلطی ہوجائے تو کیا کرنا چاہیے؟'' امام نحو نے جواب دیا: ''نماز ہوجائے گی، سجدۂ سہو دوبارہ کرنے کی ضرورت نہیں۔'' پوچھا گیا: ''کہاں سے یہ مسئلہ اخذ کیا؟'' جواب ملا: ''نحو کے قاعدہ سے کہ تصغیر کے بعد تصغیر نہیں ہوتی۔'' یہ سنانے کے بعد مسکراتے ہوئے کہا گیا کہ ''نحو سے میرا کتنا تعلق ہے اس سے اندازہ لگالو۔''

یہ کثیف و بھرپور ریش اور چوڑی پیشانی والا مسکراتا چہرہ استاذ مکرم جناب مولانا محمود حسنی ندوی رحمہ اللہ کا ہے اور ۲۰۰۱ء سے شناسا، جب میرا داخلہ مدرسہ ضیاء العلوم میدانپور رائے بریلی کے عالیہ اولیٰ شریعہ میں ہوا، مولانا کے ذمہ ہمارے دو گھنٹے تھے، ایک تاریخ کا اور دوسرا تعبیر کا، دونوں گھنٹے مکمل فرض شناسی کے ساتھ پڑھاتے تھے، تعبیر میں عمومی طور پر وہ مولانا علی میاںؒ کے کسی مضمون کا ترجمہ کرواتے تھے، جس کی وجہ سے طلبہ نرا ادب نہیں بلکہ اسلامی ادب سیکھتے تھے، تعلیمی آغاز سے ہی انہیں پتہ چل گیا کہ میں عم محترم جناب مولانا آفتاب عالم ندوی دھنبادی صاحب کا بھتیجا ہوں، چنانچہ جب بھی ملاقات ہوتی، میری خیریت کے ساتھ عم محترم کی بھی خیریت دریافت کرتے، اس سے اہل تعلق کے ساتھ ان کے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتابوں سے انھیں بے حد لگاؤ تھا، درجہ کے علاوہ تعلیمی ایام میں جب بھی ان سے ملاقات ہوئی، خواہ تکیہ سے میدانپور آرہے ہوں یا میدان پور سے تکیہ جارہے ہوں، یا پھر تکیہ سے کہاروں کے اڈہ کے لیے رواں دواں ہوں، ہاتھ میں عموماً کوئی نہ کوئی کتاب ضرور دیکھی، کتابوں سے اس طرح کا عشق آج کے دور میں خال خال ہی نظر آتا ہے، تکیہ سے کہاروں کا اڈہ حالانکہ کافی دور ہے اور ہم جیسا طالب علم بھی یا تو رکشہ سے جاتا یا کرایہ کی سائیکل سے، لیکن استاذ محترم کو بارہا پیدل جاتے ہوئے

دیکھا، ایک مرتبہ ہم دو تین ساتھی عصر کے بعد چہل قدمی کے لیے تکیہ کی طرف گئے ہوئے تھے، راستہ میں مولانا سے ملاقات ہوگئی، مصافحہ کیا اور پھر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے کہاروں کے اڈہ تک پیدل چلے آئے، راستہ میں کچھ خواتین کا گزر ہوا، شیطان کے مکر سے بچنے کی کئی دعائیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ خود بھی استغفار پڑھنے لگے اور ہمیں بھی اس کی تلقین کی اور بتایا کہ ''یہ حبائل الشیاطین ہیں، ان سے ہمیشہ بچنے کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔''

مولانا کے اندر دینی غیرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور یہ کیوں نہ ہو؟ آپ کا سارا خاندان ہی اسی نسبت سے معروف ہے، مولانا کی اس غیرت کا ظہور کبھی کبھار مدرسہ میں بھی ہو جایا کرتا تھا، ہم ناسمجھ طلبہ اس وقت اسے ان کے ''جلال'' سے تعبیر کرتے تھے، اس تعلق سے ایک واقعہ آج بھی ذہن کے پردہ میں ہچکولے لے رہا ہے، ششماہی امتحان کا موقع تھا، تمام طلبہ امتحان ہال (مدرسہ ضیاء العلوم کی مسجد) میں بیٹھ چکے تھے، امتحانی پرچہ ہاتھوں میں تھمایا جاچکا تھا، کچھ طلبہ نے جوابات بھی لکھنا شروع کر دیا تھا، کچھ ابھی پرچہ کو سمجھنے میں لگے ہوئے تھے، اچانک مولانا کی نظر ایک ایسے طالب علم پر پڑی جو اپنے پچھلے دامن اور ران کے اوپر پاجامہ میں چیٹنگ کرنے کی غرض سے کچھ لکھ کر لایا تھا، چیٹنگ کے لیے ایسی جگہوں کے انتخاب پر مولانا مرحوم آپے سے باہر ہوگئے اور امتحان ہال میں ہی اس کی جم کر کٹائی کی، دراصل مولاناؒ علم کی یہ توہین برداشت نہیں کرسکے، جس کا اظہار انہوں نے یاد پڑتا ہے کہ بعد میں بھی کیا تھا، یہ مولاناؒ کی دینی غیرت ہی تھی جس نے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔

مولانا مرحوم کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ طالب علم جب کچھ لکھ کر آپ

کو دکھاتا تو آپ نہ صرف یہ کہ اسے چیک کرتے، بلکہ اس کی ہمت افزائی بھی کرتے، یاد آتا ہے کہ اسی زمانہ میں فقیہ عصر قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی وفات حسرت آیات کا واقعہ پیش آیا، میں نے بھی ان پر مضمون لکھنے کی ایک طالب علمانہ کوشش کی، پورا پڑھنے کے بعد سراہا بھی اور امارت شرعیہ کے آرگن ''نقیب'' میں بھیجنے کا بھی مشورہ دیا، طالب علمی کے زمانہ میں کئی قسم کا شوق چراتا ہے، مجھ پر عربی نظم کا خبط سوار ہوا، یہ وہی موقع تھا جب اسرائیل کا وزیر اعظم اریل شیرون تھا اور اس کے ناپاک قدم نے فلسطینیوں کے ہزار احتجاج کے باوجود بیت المقدس کو روندا تھا، میں نے ''خیبر خیبر یا یھود - جیش محمد سوف یعود'' پر تضمین کرتے ہوئے کچھ تک بندی کی، مولاناؒ میرے تعبیر کے استاد تھے، میں نے انہیں دکھایا، بہت خوش ہوئے اور کہا: ''جمعرات کو حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم تشریف لائیں گے، تم یہ لے کر آنا، مولانا کو دکھائیں گے۔'' لیکن اپنی اس بری عادت سے مجبور کہ بڑوں کے سامنے جانے سے ہی ایک قسم کی جھجھک ہوتی ہے، سو نہیں گیا، درجہ میں مولانا نے اس تعلق سے پوچھا بھی، ظاہر ہے اس کا میرے پاس کیا جواب ہوتا؟! اب سوچتا ہوں کہ اے کاش! میں چلا گیا ہوتا تو شاید یہ سلسلہ بند نہ ہوتا۔

عالیہ ثانیہ کی تعلیم کے بعد ہم لوگ ندوہ چلے آئے، پھر وہاں سے عالمیت کے بعد سہارنپور اور حیدرآباد میں تعلیمی سلسلہ جاری رہا، اس دوران بھی استاد محترم سے گاہے گاہے ملاقاتیں ہوتی رہیں، جب بھی ملاقات ہوتی، علمی کام کے سلسلہ میں مشورے بھی دیتے، لیکن سب سے زیادہ ملاقات کی سعادت جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور کرناٹک میں دوران تدریس ہوئی، ہر سال سردیوں کے موسم میں خصوصیت کے ساتھ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے وفد کے ساتھ کیرلا،

مینگلور، بھٹکل اور ممبئی کے سفر میں مولاناؒ بھی ساتھ ہوتے، جس کا ایک پڑاؤ جامعہ ضیاء العلوم بھی ہوتا اور پورے وفد کے ساتھ ہماری ملاقات ہوتی، آخری ملاقات گزشتہ سال نومبر ۲۰۲۱ء کے اواخر میں اس وقت ہوئی جب میں اپنی دو کتابوں ''مقاصد شریعت-تدوین وتعارف'' اور ''عصری نظام تعلیم-مسائل اور حل'' کی رسم اجرا کے لیے استاد گرامی قدر حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ کی اجازت سے رائے بریلی گیا ہوا تھا، مولانا کو دیکھا، پہلی نظر میں دھوکہ کھایا گیا، میں ہی نہیں بلکہ میرے ساتھ میرے ہم درس ذوالقرنین بھی چونک گئے، بالکل کمزور اور نحیف تھے، لیکن چلنے پھرنے سے معذور نہیں تھے، تکیہ کے مہمان خانہ میں ملاقات ہوئی، پھر کتابوں کی رسم اجرا کے بعد ان کے گھر پر تھوڑی دیر کی ملاقات رہی، مسکراتے چہرے کے ساتھ ملے، اپنی کتابیں پیش کیں، کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے، پوچھتے رہے: ''اور کس کس موضوع پر لکھتے ہو؟'' میں نے افسانہ اور انشائیہ وغیرہ کا بھی تذکرہ کیا کہ کبھی کبھی ان پر بھی قلم اٹھاتا ہوں، خوش ہوئے اور سلسلہ کو جاری رکھنے کے لیے کہا، اس موقع پر مولاناؒ نے ایک ڈائری بھی تحفہ میں مجھے دی۔

آج ۱۱/اگست ۲۰۲۲ء کو ان کی وفات پر یہ سب باتیں ایک ایک کر کے یاد آ رہی ہیں، یقین نہیں ہو رہا ہے کہ مولانا ہم سے بچھڑ گئے ہیں، لیکن یقین تو کرنا ہی پڑے گا، قضا وقدر کے فیصلے پر راضی رہنا ہی ایک مسلم کا شیوہ ہے، مولاناؒ کی عمر بہت زیادہ تو نہیں تھی، جولائی ۱۹۷۱ء کی پیدائش ہے، اس اعتبار سے تقریباً اکیاون باون سال کے آپ تھے، دنیاوی سوچ کے لحاظ سے یہ جانے کی عمر نہیں کہلاتی، لیکن تقدیر کے لحاظ سے یہ ان کے جانے کی ہی عمر تھی، سو وہ چلے گئے، لیکن اس کم عمر جانے والے نے اپنے پیچھے سینکڑوں شاگردوں اور دسیوں کتابوں کا ذخیرہ چھوڑا، جو ان کے ان

مٹ نقوش ہیں، یہ ان کے لیے ذخیرۂ آخرت بھی ہے، ان کے جانے کا غم یقیناً ہر اہل علم کو ہے، کیونکہ وہ ایک ابھرتے ہوئے مصنف تھے، ان کے جانے سے تصنیفی میدان میں ایک بڑا خلا پیدا ہوا ہے، جس کی بھرپائی شاید ہو، لیکن جاتے جاتے یہ سبق ہم اخلاف کو دے گئے کہ ''وقت سونے سے زیادہ قیمتی ہے۔'' اور ''وقت تلوار کی مانند ہے، تم اگر اسے نہیں کاٹو گے تو وہ تمہیں کاٹ دے گی۔'' بیماری کے آخری لمحات میں بھی تالیف سے جڑے رہے اور اس موقع سے بھی کئی کتابیں مرتب کیں۔

اللہ تعالیٰ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی بال بال مغفرت فرمائے، ان کے کاموں کو قبول فرمائے اور ہم شاگردوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

چمنستان حسنی کا ایک چہکتا بلبل

مولانا محمد عمران صدیق

زمانہ ہر گھڑی منقلب اور تغیر پذیر ہے، آج ہم دوسروں کا ماتم کر رہے ہیں، کل دوسرے ہم پر ماتم کریں گے، کل تک جن کو ہم آنکھوں سے دیکھتے تھے، آج وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں اور کل خود اپنی آنکھیں بند ہو جائیں گی، یہ ردو بدل تابقائے عالم ساری و جاری رہے گا، لیکن اس کارخانۂ عجائب میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی ہے۔

ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

یہ تو دنیا کی ظاہری وجسمانی صورت ہوئی، اگر حقیقی ومعنوی حیثیت سے بہ نظر غور دیکھا جائے تو شخصیت کے غائب از نظر ہو جانے سے خانوادۂ شاہ علم اللہ کی علمی اوج و شان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، ایک طرف سادات رائے بریلی کی علمی شخصیتیں غائب از نظر ہوتی جاتی ہیں، لیکن ان کا علمی دربار اسی اوج واقبال کے ساتھ قائم ہے، یہ خانوادہ ہر فن کے باکمالوں اور فاضلوں سے مالا مال ہے، کوئی عالم ہے کوئی حافظ، کوئی مفتی ہے کوئی فقیہ، کوئی تاریخ میں طاق ہے، کوئی ادب عربی میں مشاق، کوئی درس

وتدریس میں مشغول ہے تو بعضوں نے مسند فقر کو زینت بخشی، الغرض ع

این خانہ تمام آفتاب است

اس خانوادہ کے بعض افراد سلاطین اسلام کے درباروں میں، بعض فقر و تصوف کے میدانوں میں ممتاز ہوئے، بعض درس و تدریس کی چٹائیوں پر اور بعض علم و تصنیف کی مسندوں پر جلوہ آرا ہوئے اور کچھ میدان شہادت کے شہسوار ہوئے۔

حضرت مولانا محمود حسنی ندویؒ اسی علمی خانوادہ کے روشن چراغ تھے، ان کی شمع حیات آج اگر بجھ گئی ہے، تو یقیناً یہ درو غم کی بات ہے اور سب کو اس ماتم غم میں شریک ہونا چاہیے، کیونکہ ان کا وجود بہت سے تاریک دلوں کے لیے اجالا تھا، ان کی ذات تشنگان علوم کے واسطے آب حیات تھی اور ان کے علم کا معتد بہ حصہ تاریخ اور سوانح عمریوں کی صورت میں سینہ سے سفینوں میں منتقل ہو چکا ہے، جن کا مطالعہ تشنگان ذوق کے لبوں کو تر کر سکتا ہے، وہ دن یاد کے قابل ہے جب مولانا رحمہ اللہ مدرسہ ضیاء العلوم کے عالی درجات میں پڑھاتے تھے اور کچھ مدت کے بعد اپنا پورا وجود ندوہ کے لیے وقف کر دیا، رسالہ ''تعمیر حیات'' میں نائب مدیر کے فرائض انجام دیتے، ساتھ ساتھ ماہنامہ ''رضوان'' اور ''پیام عرفات'' اور اس کے علاوہ اور دوسرے رسائل ان کی علمی وفکری جولان گاہ تحریر کا مرکز تھی، زندگی کی ساعتیں گھٹتی جاتی تھیں، لیکن ان کے علم وفن کے حدود وسیع ہوتے جاتے تھے، خواص وعام دونوں جماعتوں میں ان کا فیض عام ہوتا جاتا تھا، علمی اور مجلسی اور دعوتی کاموں میں مصروف رہتے، تاہم تصنیف وکتابت کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور یہ ملکہ ان کے خاندان میں متوارث چلا آ رہا ہے۔

اس وقت میری آنکھوں کے سامنے مولانا رحمہ اللہ کا ایک مضمون ''واقعہ

طائف'' ہے، نہایت سادہ، سلیس، لطیف اور دلآویزی، کہیں کہیں قافیہ بندی ہے، مترادفات کی کثرت ہے، ادب کی چاشنی ہے، علم کی حلاوت ہے، ان کی ہر تحریر نہایت سادہ، شستہ اور رواں ہوتی ہے۔

جو دوسروں کو شخصیتوں کی داستانیں سناتا تھا، آج ان کی ذات خود دوسروں کے لیے علم و تصوف کی عمدہ داستان ہے، دل تو چاہتا تھا کہ چمن حسنی کا یہ بلبل ہمیشہ چہکتا ہی رہے۔ خدا ان کی تربت پر رحمتوں اور مغفرتوں کے پھول برسائے ؎

تیری لحد پہ خدا کی رحمت، تیری لحد پر سلام پہنچے
مگر ان کی مرگ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے

ایک گمنام مگر بلند مقام ولی

مولانا طالب بشیر ندوی (کشمیر)

۱۲/اگست ۲۰۲۲ء تقریباً صبح ساڑھے نو بجے واٹس ایپ کے ذریعہ یہ خبر ملی کہ استاد محترم مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ (جولائی ۱۹۷۱ء تا ۱۲/اگست ۲۰۲۲ء بروز جمعہ) اس دار فانی سے دار بقا کی جانب کوچ کر گئے، مولانا سے گرچہ براہ راست کوئی کتاب نہیں پڑھی، لیکن بہت سی نجی مجلسوں میں بیٹھ کر استفادہ کا موقع ملا، ابھی نومبر ۲۰۲۱ء میں آخری ملاقات مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے دفتر میں ہوئی، مولانا سے کچھ دیر گفتگو ہوئی، اس دوران بھی مولانا کسی کتاب کی تصحیح کر رہے تھے، چند دن قبل مولانا کی طبیعت کی ناسازی کی خبر ملی تھی، اتنا جلد جدا ہوں گے سوچا بھی نہیں تھا، بہر حال فیصلہ اللہ تعالیٰ کا اور صبر بندوں کا، ہر فیصلہ خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم!

مولانا سے پہلی ملاقات رائے بریلی میں ہوئی تھی، مولانا نے ہی پہلی مرتبہ مجھے مدرسہ سید احمد شہیدؒ کے بارے میں کہا تھا کہ یہ سید صاحبؒ کا گھر ہے، مولانا نے شفقت سے میرا ہاتھ پکڑ کر مسکراتے ہوئے حسنی خانوادہ کی مختصر مگر جامع تاریخ سنائی تھی، وہ ملاقات اور آج کا دن مولانا کو جب بھی دیکھتا تھا بس رائے بریلی کی وہ

پہلی ملاقات یاد آجاتی تھی، وہ شفقتیں اور ادائے دلبرانہ، وہ مسکراہٹ دردمو جودتھا، ظاہرنہیں تھا انہیں بھولنا بھی چاہیں تو بھلا نہ پائیں، بھیڑ میں بھی بالکل الگ ایک بے ضرر انسان، اللہ کے بڑے بڑے ولیوں کے سوانح نگار، لیکن خود اس قدر گمنام تھے کہ ڈھونڈنے سے بھی نہ ملنے والے، ہاں جب بھی ملتے تو ہونٹوں پر ایک خاص قسم کی مسکراہٹ لیے، ہائے وہ مسکراہٹ! مسکراہٹ سے یاد آگیا کہ میرا رائے بریلی کا سفر حضرت مولانا عبداللہ حسنیؒ سے ملاقات کے لیے ہوا تھا اور آپؒ ہی نے اس وقت مولانا محمود حسن حسنیؒ سے کہا تھا کہ پہلی مرتبہ آئے ہیں ان کو اپنے ساتھ لے جا کر مدرسہ دکھلاؤ، اس سفر میں ہمارے مہمان مولانا رئیس احمد ندوی کشمیر سے آئے ہوئے تھے، اس کے بعد جب بھی مولانا محمود حسن حسنیؒ سے ملاقات ہوتی تھی انتہائی محبت سے ملتے تھے اور حضرت مولانا عبداللہ حسنیؒ کا تذکرہ کرتے، مولانا سے کئی مرتبہ وادی تشریف لانے کے لیے گزارش کی، مولانا ہر بار صرف اتنا کہتے تھے کہ اب حضرت (حضرت مولانا رابع حسنی ندوی صاحب دامت برکاتہم) کے بغیر کہاں کہیں جایا جاتا، ان کا جنازہ دیکھ کر کسی نے مجھ سے پوچھا تھا یہ کون تھے اور یہ کن کا جنازہ تھا؟ میں نے کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ایک گمنام ولی تھے جو محفلوں میں بھی تنہا اور تنہائیوں میں بھی ایک انجمن کے برابر تھے۔اللہ تعالیٰ مولاناؒ کے درجات بلند فرمائے۔آمین!

مولانا مرحوم اپنے شاگردوں کی نظر میں

مولانا محمد زاہد حسین ندوی (جمشید پور)

یادوں کے دریچے سے:

بات ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۶ء کی ہے، جب میرا داخلہ عالمیت کے ابتدائی سال درجہ ثانویہ ثانیہ میں مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی میں ہوا، یاد آتا ہے کہ سب سے پہلے ہم نے استاذ محترمؒ کو تکیہ شاہ علم اللہؒ سے مدرسہ کی طرف آتے ہوئے دیکھا تھا، رام پوری ٹوپی ہاتھ میں تھی اور مولانا اپنے خاص انداز میں تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے، میرے بڑے بھائی جان مولانا محمد اعظم ندوی نے بتایا کہ یہ مولانا محمود حسنی صاحب ہیں، یہ بھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے رشتے میں نواسے لگتے ہیں۔ پھر مولانا کو ہم نے حضرت مولاناؒ کی مجلس میں دیکھا، ہمارے زمانہ میں حضرت مولانا جب تکیہ تشریف لاتے تو ایک ایک ہفتہ قیام فرماتے تھے۔ عصر بعد کی مجلس میں ہم طلبہ بڑے ذوق وشوق سے حاضر ہوتے، ہم لوگ دیکھتے کہ مولانا ہی حضرت مولاناؒ کی مجلس میں کتاب پڑھا کرتے تھے، کبھی ''تذکرہ حضرت فضل رحمٰن گنج مراد

آبادی''، کبھی ''جب ایمان کی باد بہار چلی'' اور کبھی ''تاریخ دعوت وعزیمت'' وغیرہ۔

حضرت مولانا کی مجلس میں جو سکون اور روح کو جو بالیدگی ملتی تھی، اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا، ایسا محسوس ہوتا کہ ایک چادر سکینت ہے جو ہمارے سروں پر تنی ہے۔

مولانا محمود صاحبؒ کو اسلامی تاریخ، سیرت نبوی وسیرت صحابہ رضی اللہ عنہم اور بزرگان دین کی سوانح عمریوں سے بڑی دلچسپی تھی اور لگتا ہے کہ اس ذوق کو جلا بخشنے میں حضرت مولاناؒ کی خصوصی نگاہِ تربیت کے ساتھ ساتھ ان کے عظیم ونامورنانا، مشہور سوانح نگار واسلامی شاعر حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کی سیر وسوانح پر لکھی گئی کتابوں کا بھی بڑا دخل تھا جو ان کے گھر کا علمی اثاثہ تھیں، اچھی طرح یاد ہے خود حضرت مولاناؒ سے جب کوئی ان کی تاریخ پیدائش پوچھتا تو حضرت مولاناؒ مولانا محمود صاحب کو طلب فرماتے اور مجمع میں ان سے پوچھتے کہ ہماری سن ولادت کیا ہے؟ تو مولانا بڑے پر اعتماد لہجہ میں بتاتے کہ ۱۹۱۳ء ہے، حضرت مولاناؒ بہت خوش ہوتے اور مسکراتے، گویا مولانا محمود صاحب کی ہمت افزائی فرماتے اور ان کے تاریخی ذوق کو اعتماد بخشتے۔

یادش بخیر! حضرت مولاناؒ سے سب سے پہلی ملاقات مولانا محمود صاحب ہی کے ذریعہ میسر ہوئی، عصر کے بعد حضرت مولاناؒ اپنے کمرہ میں تشریف فرما تھے، مولانا نے مجھے اور میرے، ہم سبق وہم دیار برادرم مولوی مشتاق ندوی کو یہ کہہ کر اندر بھیجا کہ جاؤ مصافحہ کر آو، ہم لوگوں کی عمر اس وقت یہی کوئی ۱۲ / ۱۳ برس تھی، ہم لوگ سیدھے گئے اور سلام کرکے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھادیا، حضرت مولاناؒ نے مصافحہ کیا اور پھر شفقت سے فرمایا: ''جاؤ باہر کھیلو۔'' غالباً حضرت مولاناؒ کو اس وقت تخلیہ کی ضرورت تھی اور آپؒ اپنا کوئی معمول پورا فرمارہے تھے۔

ایک مرتبہ اور ہم لوگ عصر بعد کی مجلس میں پہنچے، میں تھا، برادرم مشتاق اور ہمارے

مہتمم صاحب جناب مفتی راشد حسین صاحب کے دونوں بھتیجے مولوی مرشد ندوی اور اور مولوی محفوظ تھے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بالکل تنہا تشریف فرما تھے، ہم لوگ بالکل سامنے جا کر بیٹھ گئے، تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد حضرت مولانا نے مجھ سے پوچھا: ''کہاں گھر ہے؟'' میں نے بتایا: جمشید پور۔ اس وقت مولانا گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے تھے، یہ سن کر ٹیک چھوڑ دی اور فرمایا: ''وہی جمشید پور! جہاں خون کی ہولی کھیلی گئی تھی۔'' پھر سکوت کیا اور فرمایا: ''ماشاءاللہ! اب طلبہ دور دور سے آنے لگے۔''

(''وہی جمشید پور!'' سے حضرت مولاناؒ کا اشارہ ۱۹۶۴ء میں پیش آنے والے فرقہ وارانہ فسادات کی طرف تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: کاروان زندگی: ۱/ ۴۹۵-۴۹۶، بعنوان: ''کلکتہ، جمشید پور اور راوڑ کیلا کے ہولناک فرقہ وارانہ فسادات'')

اس کے بعد حضرت مولاناؒ نے پینے کا پانی طلب فرمایا، مولانا نے گلاس بھر کر دیا اور جب حضرت مولاناؒ نے تھوڑا سا پی کر چھوڑ دیا، تو مولانا محمود صاحبؒ نے ہم لوگوں کو اشارہ سے بنگلہ کے بیچ والے ہال سے پیچھے والے کمرہ میں بلایا اور کہا: ''تم لوگ پی لو۔'' ہم لوگوں نے باری باری حضرت مولاناؒ کا تبرک نوش کیا۔

اسی زمانہ کی بات ہے کہ ہمارے مدرسہ ضیاء العلوم کے اونچے درجہ کے طلباء کو مولاناؒ حضرت مولاناؒ سے اپنی اصلاح وتزکیہ کے لیے باقاعدہ بیعت ہونے کی ترغیب دیتے، کئی سینئر ساتھی بیعت ہوئے اور آج ماشاءاللہ ان میں سے اکثروں کو اس کا بڑا دینی فائدہ ہے۔

دینی زندگی:

مولانا مرحوم نے بڑی زاہدانہ زندگی گذاری، کبھی بھی دنیاوی مال ومتاع، عہدہ

واسٹیٹس کو اہمیت نہیں دی، بلکہ اپنے قول وعمل سے اپنے شاگردوں کو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے کا سبق دیتے رہے، نمازوں کا اہتمام اور سنن ونوافل سے خاص اشتغال تھا، اپنے خانوادہ کے بزرگوں کے طریقہ پر تہجد وتلاوت کا بھی معمول رکھتے تھے، عصر بعد بلاناغہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے، پہلے سورۂ یس پڑھتے اور اس کے بعد ''الحزب الیومی'' روزانہ کا جو پارہ ہوتا اسے پڑھتے اور پورے تدبر کے ساتھ پڑھتے، بعض آیات پر رک جاتے اور بار بار اس کا تکرار کرتے اور اس کا حظ اٹھاتے، مجھے یاد ہے تکیہ کی مسجد میں ایک مرتبہ سورۂ مومن پڑھ رہے تھے، جب اس آیت پر پہنچے:

''الَّذِيْنَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْماً فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ'' (المؤمن: ۷) (جو فرشتے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے آس پاس ہیں، وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح میں مشغول ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان والوں کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تیری رحمت اور علم ہر چیز پر حاوی ہے، تو ان لوگوں کو معاف فرما دے جنہوں نے توبہ کی اور تیرا راستہ چلے اور ان کو عذاب جہنم سے بچالے)

تو بار بار آیت کو دہراتے رہے اور ''فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوا'' پر آواز رُندھ سی گئی۔

اور جہاں تک ذکر اللہ کی بات ہے تو اس میں آپ بڑے ممتاز نظر آتے تھے، ذکر بالجہر کرتے اور ایسی محویت کے عالم میں کرتے کہ پوری مسجد گونج جاتی، ہم لوگ جب چھوٹے تھے، حفظ کر کے گئے تھے تو اسے مزاح کے پیرائے میں لے لیتے تھے،

لیکن جب کچھ شعور آیا اور بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ مولانا کو ذکر میں کس درجہ استغراق وفنائیت کا مقام حاصل ہے، ان کی کیفیت کچھ اس طرح کی ہوتی ۔

آئی جب ان کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقش ما سوا کو مٹاتی چلی گئی

ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگے کہ جب ہم حضرت مولاناؒ سے بیعت ہوئے تو ابتداء میں کوئی خاص اثر نظر نہیں آیا، لیکن جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں، حضرت کے بتائے ہوئے معمولات کے فوائد وثمرات ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔

بڑوں کی خدمت اور ان کا اعتماد:

ابتداء میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی بھی خدمت میں رہتے تھے، کوئی مہمان آیا تو مطلوبہ کتابیں لا کر دینا، یہ مولانا ہی کا کام تھا، حضرت مولاناؒ کے اخیر عمر کے چار پانچ روزنامچے بھی مولانا نے تیار کیے تھے جو شائع ہونا چاہیے۔

اس کے بعد ہم سب کے مخدوم مرشد الملت خلیفہ مفکر اسلامؒ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم اور ان کے عزیز ترین چھوٹے بھائی، مردِ بزرگ اور عربی واردو کے عظیم ادیب وصحافی حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کی آپ نے بھرپور رفاقت اٹھائی اور دیر وحرم کے اسفار میں ان بزرگوں کی خوب خدمت کی، بھرپور علمی استفادہ کیا اور خوب کسب فیض کیا، حضرت مولانا دامت برکاتہم کی تحریروں کو جمع کرنا، آپ کے حالات کو قلم بند کرنا، آپ کے مضامین کا املا کرنا مولانا کا بہترین مشغلہ تھا، ''تعمیر حیات'' میں حضرت کے بیانات کو بڑے سلیقہ سے پیش کرتے اور

اپنے چھوٹوں کو حضرت کے ملفوظات نوٹ کرنے کی ہدایت کرتے، عزیز مکرم جناب مولوی رشید حسنی ندوی صاحب نے ماشاء اللہ بڑے لگن سے حضرت کے ملفوظات پر مبنی ایک کتابچہ شائع بھی کروایا ہے۔

اسی طرح ہمارے شیخ مخدومی ومرشدی حضرت مولانا سید عبد اللہ حسنی ندویؒ کا بھی آپ کو پورا اعتماد حاصل تھا، ابتداء میں حضرت ہی کے ایماء پر مولانا نے ''سلاسل اربعہ'' مرتب کی، حضرتؒ سیرت وسوانح پر ان کے کاموں کی بڑی ستائش فرماتے، جب محی السنہ حضرت شاہ ابرار الحق حقی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح مولانا لکھ رہے تھے تو میرے سامنے کی بات ہے کہ مولانا اس کا مسودہ حضرت کو دکھانے آئے، حضرتؒ نے جب حضرت شاہ صاحبؒ کے شجرۂ نسب اور خاندانی حالات کو ملاحظہ کیا تو بڑے خوش ہوئے اور مولانا سے فرمایا:

''تم نے ماشاء اللہ اپنی تحقیق سے اس میں وہ مواد جمع کردیا ہے جس سے دوسرے لوگ واقف نہیں ہیں۔''

اسی طرح خاندان کے علاوہ بھی دیگر بزرگان دین کے حالات دیکھنا اور اس میں سے نمایاں لوگوں کی سوانح مرتب کرنا' مولانا کا بہترین مشغلہ تھا، حتی کہ ان بزرگ کے خانوادہ کا اگر کوئی باصلاحیت فرد آجاتا تو ان بزرگ کی نسبت کا خیال رکھتے ہوئے اس سے بڑے اکرام سے پیش آتے اور خود ان کے خاندان کے حالات اس تفصیل سے بتاتے کہ انہیں بھی اس کی خبر نہ ہوتی، پھر انہیں فوراً بیٹھے بیٹھے ایک خاکہ بنا کر دیتے کہ آپ اس پر ایک کتاب مرتب کیجیے۔

حضرت شاہ سید نفیس الحسینی رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ حضرت شاہ عبد القادر رائے پوریؒ نے آپ کو اجازت بیعت مرحمت فرمائی تھی اور عزیز مکرم مولوی رشید حسنی کی اطلاع

کے مطابق حضرت مولانا دامت برکاتہم نے بھی آپ کو اجازت عطا فرما دی تھی۔
حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوریؒ سے بھی بڑی عقیدت کا تعلق رکھتے تھے اور حضرت انہیں مانتے تھے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خانوادہ سے بھی گہرا تعلق رکھتے تھے۔ بزرگوں سے تعلق قائم کرنے کا ہنر مولانا کے پاس تھا، ایک مرتبہ اپنی مجلس میں ہم لوگوں سے کہنے لگے کہ

''اگر کسی بزرگ کی توجہات حاصل کرنی ہیں تو سب سے پہلے وقت و معمولات کا لحاظ کرتے ہوئے ملنا چاہیے اور خادم کی جھڑکی بھی سننا پڑے تو سن لینی چاہیے، کیا آپ اگر کسی دنیوی عہدہ دار کے پاس جاتے ہیں تو اس کا پروٹوکول نہیں ہوتا؟ اس کے حاجب و دربان نہیں ہوتے؟ لیکن وہاں سب ان کے نخرے برداشت کرتے ہیں، وہ بھی محض کسی دنیوی مفاد کی خاطر، تو کیا اللہ والوں کے اوقات و معمولات کا خیال نہیں کر سکتے؟ جب کہ آپ وہاں اللہ کی خاطر اپنی اصلاح کے مقصد اور اخروی فائدہ حاصل کرنے کے لیے حاضر ہو رہے ہیں، یہ سب سمجھنے کی باتیں ہیں، لوگ آج کل بے صبرے ہو گئے ہیں اور فوراً غصہ میں آجاتے ہیں اور بڑے فائدہ سے محروم رہ جاتے ہیں۔''

دوسری بات یہ کہ ''ان بزرگ سے ان کے شیخ کے مناقب وحالات بیان کیجیے تو فوراً آپ کو ان کی توجہات حاصل ہوں گی۔''

مولاناؒ کا ایک اور بڑا امتیازی وصف اداروں اور تحریکات کے تعصب سے بالکل بالاتر ہو کر سب سے ملنا تھا، تبلیغ کے کام کے نہ صرف مداح تھے بلکہ ایک زمانہ میں عملی طور پر بھی بڑے متحرک ہو گئے تھے، تکیہ کی مسجد سے باقاعدہ لوہانی پور کی مسجد کے اطراف میں گشت کرنے جاتے۔ اسلاف دیوبند کا ذکر بڑی عقیدت سے کرتے، گویا

مولانا کی ذات اداروں اور تحریکات کے افراد کے مابین ایک ہمزۂ وصل کی تھی۔

طریقۂ اصلاح وتربیت:

عقائد کی درستگی اور نفس کی اصلاح پر مولانا کے یہاں بہت زور تھا، عقیدۂ توحید کے معاملہ میں تو ادنیٰ تساہل برداشت نہ کرتے تھے، سخت خفا ہوجاتے تھے اور بات کرتے کرتے جلال میں آجاتے تھے، اسی طرح اتباع سنت کی فہمائش کرتے، بدعات سے بہت نفور تھا، اس کی شناعت کو دلوں میں بٹھاتے، موت اور آخرت کا تذکرہ کرتے اور اس یقین کے ساتھ کرتے کہ تھوڑی دیر کے لیے دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کے بقاودوام کا نقش دل پر قائم ہوجاتا، قرآن وسنت کے مرکزی مضامین کو اپنی مجلس میں بار بار بیان کرتے، مخاطب چاہے عالم ہو یا دیہاتی، ہر ایک سے وہی باتیں کرتے، گویا اس شعر کی ترجمانی کرتے ؎

گل دستہ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

اسی طرح طلبہ کی اصلاح کا مولانا پر ایسا غلبہ تھا کہ اکثر طلبہ کے احوال پر ان کی نظر رہتی اور کبھی ایسا ہوتا کہ اچانک کسی کو بلاتے اور اس کا ہاتھ تھام لیتے اور راہ چلتے اس کو سمجھاتے جاتے، لہجہ گاہے نرم اور گاہے سخت ہوجاتا، مولانا کے انداز میں ایک قسم کا رعب داب ہوتا، جو بھی خامی دیکھتے اس پر بے تکان بولتے اور ٹوکتے جاتے، درمیان میں کسی کو بولنے اور اپنی عذرخواہی کا یارانہ ہوتا، اگر کوئی کچھ بولنا شروع کرتا تو مولانا بالکلیہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھتے، انگلی دباتے جاتے اور بیچ بیچ میں بہت بامعنی انداز میں مسکراتے بھی جاتے، پورے طور پر اسے اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیتے، یہاں تک کہ جب اسے اپنی غلطی کا اعتراف ہوجاتا اور مولانا

سے خود کو سدھارنے کا وعدہ کر لیتا تو مولانا ہاتھ چھوڑ دیتے اور آگے بڑھ جاتے۔

اچھی طرح یاد ہے کہ داخلہ کے وقت مولانا طلبہ کے ہی کسی کمرہ میں موجود ہوتے اور داخلہ فارم چیک کرتے، اگر ہم میں سے کسی طالب علم کو اپنے نام کے ساتھ ''سید'' کا لاحقہ لگاتے دیکھتے اور ساتھ ہی غیر مستطیع بھی لکھا دیکھتے تو فوراً ٹوکتے اور عار دلاتے کہ جب سید ہو تو پھر زکوٰۃ کیوں کھاتے ہو؟ یہ ہرگز جائز نہیں۔ نہ جانے ہم میں سے کتنے طلبہ مولانا کی بروقت تنبیہ سے اس سے بچ گئے اور خوراکی دے کر طعام جاری کروایا اور پھر اخیر تک خوراکی دے کر ہی کھانے کی نیت کی اور اللہ تعالیٰ نے نیت کی برکت سے اخیر تک اس کا بآسانی غیب سے انتظام بھی کر دیا۔

یہ تھا مولانا کی تربیت کا وہ عملی انداز جس سے ہم لوگوں کی آخرت کا فائدہ ہوا اور یہ تھا مولانا کا ہم پر وہ عظیم احسان جسے جیتے جی ہم بھلا نہیں سکتے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

طریقۂ تعلیم وتدریس:

مجھے مولاناؒ سے باقاعدہ درجہ عالیہ اولیٰ میں ''انشاء'' پڑھنے کا موقع ملا، یوں تو انشاء کی بنیاد میرے دو کرم فرما اولین استاد جناب مولانا مختار ندوی اور جناب مولانا ناصر علی ندوی صاحبان حفظہما اللہ ورعاہما نے ڈالی تھی، ذوق تو انہی دونوں اساتذہ کی محنت وتوجہ سے پیدا ہوا، لیکن اس میں تدریجاً ترقی جناب مولانا نیاز احمد ندوی بستوی مرحوم اور پھر ہمارے مولانا ممدوح کے واسطہ ہوئی، مولانا نیاز صاحب مرحوم نے نوک پلک درست کرائے اور مولانا محمود صاحبؒ نے ندوہ کے مجلّات سے ہٹ کر عالم عربی

سے نکلنے والے مجلّات سے آشنا کرایا، ''الرائد'' ہی نامی ایک عربی پرچہ سے مولانا ہم لوگوں کو طویل طویل مضامین ترجمہ کے لیے دیتے اور اچھے ترجمہ پر بہت شاباشی دیتے اور اسی لحاظ سے اچھے نمبرات بھی دیتے۔ پھر عالیہ ثانیہ میں مولانا نے ہم لوگوں کو ''مجموعة النظم'' پڑھائی، اول اول عام روش پر حافظ ابراہیم بک وغیرہ کی نظموں کے ترجمے کرائے، نمونوں کو سمجھایا اور پھر کچھ دنوں کے بعد رخ بدل دیا، درجہ میں باقاعدہ عصا لے کر آتے اور فرماتے:

''کتاب کے نام پر تم لوگوں نے غور نہیں کیا، دیکھو! مصنف نے کتاب کے نام کے آگے ''للحفظ و التسميع'' لکھا ہے، اس کا مطلب ہے: ''یاد کرو اور سناؤ'' اور اب تم لوگ اونچے درجہ میں پہنچ چکے ہو، حاشیہ دیکھ کر اشعار خود حل کرو۔''

واقعۃً اس کتاب کا حاشیہ بہت ہی کافی وشافی ہے، اگر طالب علم ذرا سنجیدگی سے لغت کی مدد لے کر اسے حل کرے تو! اس طریقہ کا خاطر خواہ ہم لوگوں کو فائدہ بھی ہوا، لیکن ہفتہ میں جس دن مولانا کا گھنٹہ آتا تو ہم لوگوں کی حالت خراب رہتی، اس عصا کا اصل میں رعب مستقل رہتا تھا اور کبھی کسی کی درجہ میں مستقل بے توجہی، غیر حاضری یا اخلاقی خرابی دیکھتے تو پھر ''ضرب-یضرب'' کی گردان بھی اچھی طرح کرتے تھے، لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا اور یہ سب بھی مولانا کی طلبہ کے ساتھ نصح و خیر خواہی کے باعث ہی ہوا کرتا تھا، دوسرے وقت پھر سب کچھ نارمل ہو جاتا اور مولانا پہلے کی طرح بے تکلف ہو جاتے۔

جہاں تک آپ کے درس ''تہذیب الاخلاق'' کا قصہ ہے، وہ تو براہ راست آپ سے پڑھنے والے ہی بتائیں گے، لیکن حدیث کا درس مولانا اس شان کے ساتھ دیتے تھے کہ اس کی دھمک اگلے پچھلے کلاسز میں بھی سنائی دیتی تھی، کبھی گھنٹہ خالی رہنے پر ہم لوگ بھی سماعت کرتے، مولانا پوری تیاری کے ساتھ آتے اور چاہتے کہ

مطالعہ کا پورا نچوڑ طلبہ کے سامنے رکھ دیں اور پھر ختم کتاب پر طلبہ کو تکیہ بلاتے اور حضرت مولاناؒ سے دعا کرواتے۔

”القراءة الراشدة ثالث“ میں ”لدی عمر أمیر المؤمنینا“ جس معرکہ کی نظم ہے، مولانا اسے اسی معرکۃ الآراء انداز میں پڑھاتے تھے ع

باتیں ان کی یاد آتی ہیں بہت

تالیف وتصنیف:

تاریخ وتذکرہ نویسی تو گویا مولاناؒ کی زندگی کا محبوب ترین مشغلہ تھا، ایسا لگتا تھا کہ وہ خود کو اس کام کے لیے مفوَّض سمجھتے ہیں، خاص کر اخیر دور میں سارے مشاغل سے دور ہوتے گئے اور اسی کے ہو کر رہ گئے تھے، جب دیکھو کچھ نہ کچھ لکھ ہی رہے ہیں، کسی کتاب سے مطلوبہ مواد تلاش رہے ہیں، بار بار مراجعت کر رہے ہیں اور اس سے لمبے لمبے اقتباس نوٹ کر رہے ہیں، ایک سودا تھا جو سر میں سمایا ہوا تھا، قلم وقرطاس سے وہ لگاؤ تھا کہ جیب ودامن کا ہوش نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ چند سالوں میں بڑی ضخیم ضخیم کتابیں لکھ ڈالیں اور تاریخ میں خود بھی اپنا نام درج کرالیا، جن میں سے چند اہم تصنیفات یہ ہیں: تاریخ اصلاح وتربیت (دو جلدیں)، سوانح حضرت شاہ ابرار الحق حقی، سوانح حضرت مولانا عبدالباری ندوی، اوراق زندگی اور مسک الختام ہدیہ درود وسلام۔

طلب کی راہ میں گر بے خودی نہیں ہوتی
قسم خدا کی خدا آگہی نہیں ہوتی

مصنف گر:

مزید برآں مولاناؒ صرف اپنی ذات میں مصنف نہ تھے، بلکہ مصنف گر بھی

تھے، کتنے ہی ایسے مولانا کے قلم کارشاگرد ہیں، جن کی قلمی اکتسابات مولانا کی توجہات کی مرہون منت ہیں، جہاں کسی میں قلمی جوہر دیکھتے فوراً اسے ایک کتابی خاکہ تیار کرکے دیتے اور مراجع کی طرف رہنمائی کرتے، اس سلسلہ میں بطور مثال ایک نام ہم مولانا کے خاص شاگرد اپنے قابل رشک معاصر، جواں سال وجواں مرگ، فاضل ندوہ، برادرم سید الیاس ہاشمی ندوی مرحوم (سابق رفیق علمی دائرۃ المعارف-حیدرآباد) کا لے سکتے ہیں۔

مولانا مرحوم کی بندۂ عاجز کے حال پر بھی شروع سے خصوصی نظر کرم تھی، مطالعہ کے لیے کتابوں کی نشان دہی کرتے، ترجمہ کے لیے کتاب دیتے، کسی شعری مجموعہ کی پروف ریڈنگ کرواتے، مولانا اپنے چھوٹوں کو مواقع فراہم کرتے تھے، قابل ذکر ہے کہ ایک مرتبہ جناب مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کو اپنے مضامین املا کرنے کے لیے کسی خوش نویس کی ضرورت پڑی، تو مولانا نے مجھے اور برادرم الیاس ہاشمی کو اس سعادت کا موقع دیا تھا، اسی طرح جب مولانا حمزہ حسنی ندویؒ مکتوبات مفکر اسلام کا مسودہ صاف کروارہے تھے تو مولانا مرحوم کے مشورہ سے مجھے بھی چند خطوط تبییض کے لیے دیئے تھے، یاد آتا ہے کہ ان میں سے اکثر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے نام تھے۔

۲۰۰۶ء میں اللہ تعالیٰ نے جب راقم آثم کو حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت میں تکیہ کی خانقاہ میں رہنے کا موقع دیا، تو ہمارے شیخ نے ہمیں مولانا ہی کی نگرانی میں رکھا تھا، مولانا میری حرکتوں پر گہری نظر رکھتے اور اس کی رپورٹ حضرت کو دیتے، کوئی خلاف تزکیہ بات ہوتی تو فوراً ٹوکتے اور اصلاح کرتے اور ہمارا ہر طرح پورا خیال رکھتے۔

گھر آنے کے بعد ایک مرتبہ حضرت کی وفات کے بعد تکیہ جانا ہوا تو ہم نے حضرت کے صاحبزادہ گرامی اور ہمارے مخدوم زادہ برادر مکرم محمد میاں حسنی کو تحفہ میں شیخ محمد متولی الشعراویؒ (عصر حدیث کے مشہور مصری مفسر قرآن) کی ویڈیو پر مشتمل ان کی عربی تفسیر کی ایک سی ڈی دی، مولانا آگئے اور ہماری گفتگو سننے لگے، درمیان میں فرمایا:

''سب ٹھیک ہے، لیکن تفسیر کے باب میں حضرت تھانویؒ کے ''بیان القرآن'' سے ہم لوگ مستغنی نہیں ہو سکتے۔''

مرض وفات اور حادثہ فاجعہ:

اسی گذشتہ سنہ ۱۴۴۳ھ کے رمضان میں مولانا شمیم احمد ندوی جمشید پوری کی رفاقت میں تکیہ حاضری ہوئی، تو مولانا کو وھیل چیئر پر بڑا زار و نحیف دیکھا، بیماری کی خبر تھی لیکن اس کا بالکل اندازہ نہ تھا کہ مولاناؒ کی یہ حالت ہوگئی ہوگی، دیکھ کر طبیعت غیر ہوگئی، بڑھ کر سلام و مصافحہ کیا اور نیاز مندی کے ساتھ شفا و تسلی کے مسنون کلمات کہے، مولانا نے بس آہستہ سے فرمایا: آمین!

وہ جو ہر وقت چہکنے والا تھا، اسے کمزوری کے عالم میں پا کر بہت رونا آیا، جدا ہوا تو مسجد کے کونہ میں جا کر بے اختیار دعا کو ہاتھ اٹھ گئے اور دیر تک اٹھے رہ گئے، اللہ تعالیٰ سے مولانا کی صحت و شفا مانگتے رہے اور میں کیا اور میری حقیقت کیا؟! مولانا کے سارے تلامذہ دعا مانگتے رہے، لیکن قضا و قدر کی جو باتیں اللہ کی طرف سے طے ہوتی ہیں، وہ اپنے اجل مسمّٰی پر ہو کر رہتی ہیں، مولاناؒ بالآخر مرض کی سختیاں جھیل کر اور اپنے حق میں کفارۂ سیئات بنا کر بتاریخ ۱۳ر محرم ۱۴۴۴ھ - ۱۲ر اگست ۲۰۲۲ء بروز

جمعہ ہم کو سوگوار چھوڑ کر دار فانی سے دار بقا کی طرف کوچ کر گئے، کم عمری اور کام کی زیادتی کے معاملہ میں آپ اپنے خانوادہ کے دو بزرگ مولانا محمد الحسنیؒ اور مولانا عبد اللہ حسنیؒ کے مماثل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے درجات بلند فرمائے، بشری لغزشوں سے درگذر فرمائے اور امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

یوں تو مولاناؒ کو اللہ کے حضور جانا تھا چلے گئے، لیکن جس طرح گئے اس نے موت کے سبق کو پکا کر دیا، اب ایسا لگتا ہے کہ مولاناؒ کی روح اپنے شاگردوں اور چھوٹوں سے یہ کہہ رہی ہے کہ

''میاں! دنیا کے چکر میں زیادہ نہ رہو، جو کرنا ہے جلدی جلدی کرلو اور اللہ سے ملاقات کے لیے نہ صرف تیار رہو بلکہ اس کا اشتیاق رکھو ؎

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو''

خانوادۂ علم اللہ کی ایک گراں مایہ شخصیت

مولانا محمد سلمان ندوی بجنوری
(استاد دار العلوم ندوۃ العلماء- لکھنؤ)

ایک نا قابلِ انکار حقیقت:

اِنَّ لِلّٰہِ مَا اَخَذَ وَ لَہٗ مَا اَعْطٰی وَ کُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِاَجَلٍ مُّسَمًّی فَلْتَصْبِرْ وَ لْتَحْتَسِبْ.

دین اسلام نے مومنین کے لیے ایسی ہدایات تعلیم کی ہیں جن سے ان کو سخت ترین حالات اور شدید رنج وغم کے عالم میں بھی صبر وسکون، استقامت و پامردی سے جمے رہنے کی ہمت اور حوصلہ ملتا ہے، امت مسلمہ کے لیے جس دن کو سب سے سخت ترین اور شدید رنج والم کا کہا جاسکتا ہے وہ دن ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کا دن تھا، جس وقت بڑے بڑے صحابہ کا سنبھلنا مشکل ہو رہا تھا اور کوئی یہ یقین کرنے کو تیار نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات پاچکے ہیں، یہ وہ حقیقت ہے جس سے ہر فرد بشر کو گزرنا ہے، ”کل نفس ذائقة الموت“ ایسے موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ لوگوں کے درمیان خطیب کی حیثیت سے کھڑے ہوتے ہیں اور لوگوں کو سنبھالا

دیتے ہوئے یہ آیت شریفہ تلاوت فرماتے ہیں: ’’وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِيْن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللّٰهَ شَيْـئًا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشَّاكِرِينَ‘‘ (آل عمران: ۱۴۴)

ایک المناک سانحہ:

امت مسلمہ نے کتنی ہی عظیم ترین، محبوب ترین ہستیوں کے دنیا سے رخصت ہو جانے کا غم سہا ہے، اللہ کے نیک، برگزیدہ بندے دنیا سے مسکراتے ہوئے چلے جاتے ہیں، لیکن ایک عالم کو اپنے پیچھے غمگین اور روتا چھوڑ جاتے ہیں، ایسا ہی ایک غم ناک حادثہ جانکاہ میرے مشفق و کرم فرما خانوادۂ علم اللہ کے چشم و چراغ، عاشق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، نادرۂ روزگار، بے مثال و رواں اور سیال قلمکار، وہبی صلاحیتوں کے مالک، پیکر مہر و وفا، بزرگان دین کے سرمایہ کے امین، تاریخ وسیر کے دل دادہ، ملت بیضا کی شان، فکر ندوہ کے ترجمان حضرت مرشد الامۃ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے چہیتے نواسے اور دست راست مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ و برد مضجعہ کی وفات کا پیش آیا، جس نے بے کل اور بے قرار کر دیا، ہر ایک کی آنکھیں نم اور دل غم سے لبریز ہو گئے، اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا کافی وقت سے بیمار چل رہے تھے، لیکن یہ کسی نے نہیں سوچا تھا کہ مرض میں افاقہ کے بجائے اضافہ ہی ہوتا جائے گا، اس حادثہ فاجعہ نے ہر اہل تعلق کو رنجیدہ اور غمگین کیا ہے، کتنوں نے بہترین مشیر، سرپرست، خیر خواہ اور سراپا شفقت ومحبت انسان کھو دیا۔

خانوادۂ حسنی کا گوہر شب چراغ:

مولانا مرحوم خانوادۂ حسنی کے ایک نایاب گوہر اور قندیل فروزاں بن کر امت کی رہنمائی کا ساماں فراہم کر رہے تھے، مولانا کا رحلت فرمانا ملت اسلامیہ ہندیہ اور

خانوادۂ علم اللہ کے لیے خصوصاً مخدومی مرشد الامۃ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم (صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ و ناظم ندوۃ العلماء) کے لیے اس پیرانہ سالی میں سخت آزمائش اور تکلیف کا باعث ہے، اب تک کتنے چھوٹے اور قریب ترین افرادِ خانہ داغِ مفارقت دے چکے ہیں۔ مولانا مرحوم کو عرصہ دراز سے حضرت مولانا دامت برکاتہم کے ساتھ سفر و حضر میں معیت کا شرف حاصل رہا، مولانا حضرت کے سب سے زیادہ قریب رہنے کے سبب حضرت کے سب سے زیادہ مزاج شناس تھے، حضرت کے مضامین کی ترتیب، سفر ناموں کی ترتیب، بیانات کی ترتیب، خطوط وغیرہ کا دیکھنا سب مولانا مرحوم کے ذمہ تھا، مولانا مرحوم کی بیماری کی وجہ سے حضرت مولانا کو بہت فکرمند اور غمگین دیکھا، انتقال سے دو تین دن قبل راقم نے حضرت مولانا کی طبیعت دریافت کی تو فرمایا: ’’الحمد للہ میں ٹھیک ہوں، لیکن محمود کے تعلق سے بڑی تشویش ہے۔‘‘

جمعہ کا مبارک دن اور مولانا کی رحلت:

مولانا مرحوم میٹرو سٹی ہاسپٹل گومتی نگر میں ایڈمٹ تھے، جہاں ان کا علاج چل رہا تھا، ہسپتال دور ہونے کے سبب عام طور سے لوگ پہنچ نہیں پا رہے تھے، مولانا آئی سی یو میں داخل تھے، حالت تشویش ناک ہونے کے سبب ان کو وینٹی لیٹر پہ رکھ دیا گیا، دو تین مرتبہ ہسپتال جانا ہوا، ایک بار حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم کے ہم راہ، اس وقت طبیعت سخت تشویشناک تھی، حضرت مہتمم صاحب نے بڑی آہ و زاری کے ساتھ دعائیں کیں اور بعد تک کرتے رہے اور مستقل خیریت معلوم کرتے رہے، حضرت مہتمم صاحب کے آنے کے بعد طبیعت میں کافی افاقہ ہوا، اس کے بعد راقم کی مولانا سے آئی سی یو میں پھر ملاقات ہوئی، ساتھ میں مولوی سید محمد میاں سلمہ اور مولوی

سید عفان سلمہ تھے، مولانا نے بڑے اطمینان سے ہم لوگوں دیکھا، ہم لوگوں کے دعا پڑھنے پر آمین بھی کہا، لیکن کوئی بات نہیں کر سکتے تھے، انتقال سے دو دن قبل بڑی خوش کن خبریں آنے لگیں کہ طبیعت میں کافی افاقہ ہے، وینٹی لیٹر بھی ہٹا دیا گیا، لیکن کیا خبر تھی یہ طبیعت میں افاقہ رخصت ہونے کا الارم ہے کہ جب چراغ بجھا چاہتا ہے تو اس کی لو بھڑکنے لگتی ہے، آخرکار (۱۳/ محرم الحرام ۱۴۴۴ھ ۱۲/ اگست ۲۰۲۲ء) جمعہ کے مبارک دن صبح کے وقت اٹیک پڑا اور مولانا نے اپنے رب کی ندا پر لبیک کہا اور اس کے حضور حاضر ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون!

تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ:

جمعہ کی صبح خبر ملتے ہی ندوہ پہنچنا ہوا، حضرت مولانا دامت برکاتہم کو ابھی کچھ نہیں بتایا گیا تھا اور کسی میں ہمت بھی نہ تھی کہ یہ اندوہ ناک خبر حضرت کو بتا سکے، حافظ مصباح صاحب کو اِدھر اُدھر دوڑتے دیکھا، وہ فکر مند تھے کہ حضرت دامت برکاتہم پر صدمہ کا اثر زیادہ نہ پڑے، لہٰذا کسی نہ کسی کو حضرت کے پاس بھیجتے رہے کہ حضرت قرائن سے کچھ اندازہ بھی لگا لیں، لہٰذا کچھ دیر جناب مولانا عبد العزیز صاحب بھٹکلی مدظلہ (نائب مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء) حضرت کے پاس رہے، تو کچھ وقت جناب مولانا شمس الحق صاحب ندوی مدظلہ (مدیر مسؤول تعمیر حیات) حضرت کے پاس بیٹھے رہے اور جناب مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی مدظلہ (ناظر عام ندوۃ العلماء) کے رائے بریلی سے آنے کا انتظار کیا جا رہا تھا کہ مولانا آئیں اور حضرت کو یہ تکلیف دہ خبر سنائیں، میت ہسپتال سے ندوہ پہنچی ہی تھی کہ کچھ دیر بعد مولانا بھی ندوہ پہنچ گئے اور حضرت مولانا کو اس جانکاہ حادثہ کی اطلاع دی، عزیزوں کے رخصت ہونے پر تکلیف اور رنج والم کا ہونا فطری بات ہے، حضرت مولانا دامت برکاتہم کی آنکھیں نم ہوئیں، لیکن صبر و ثبات

کے ساتھ اللہ کی قضاو قدر پر راضی رہے، زبان پر وہی بات آئی جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! حضرت مولانا نے دوسرے غموں کی طرح اس غم کو بھی سینے میں کہیں دفن کر دیا اور ملنے والوں سے اسی خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے رہے، مخدوم گرامی حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتہم (مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء) نے حضرت ناظم صاحب سے مہمان خانہ میں ملاقات کی اور اپنے رنج وغم کا اظہار کیا، تجہیز وتکفین دار العلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں عمل میں آئی اور پہلی نماز جنازہ حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم نے جمعہ کے بعد احاطہ ندوہ میں پڑھائی اور دوسری نماز جنازہ بعد نماز عصر مسجد شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں مرشد الامۃ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم نے پڑھائی اور ہزاروں سوگواروں کے درمیان دائرہ شاہ علم اللہ میں تدفین عمل میں آئی۔

پیدائش اور تعلیم وتربیت:

مولانا محمود حسن حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ خانوادۂ علم اللہ کے چشم و چراغ تھے، انہوں نے ۲۲ / جولائی ۱۹۷۱ء میں علمی ودینی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اپنے نانا حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی ندوی رحمہ اللہ اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ کے آغوش تربیت میں پروان چڑھے اور اپنی عمر کے آخری لمحات تک مرشد الامۃ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے دست راست رہے اور انہی کے مشورے سے اپنا علمی سفر طے کرتے رہے۔

مولانا مرحوم کی ابتدائی تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء کے مکتب (مرکز امین آباد) سے شروع ہوئی، نیز گھر ہی میں بزرگوں کے زیر نگرانی تعلیم وتربیت کے مراحل طے

ہوتے رہے، پھر ۱۹۸۱ء کے آس پاس آپ کے والدین تکیہ رائے بریلی منتقل ہو گئے تو وہاں مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور (رائے بریلی) میں ابتدائی عربی درجات (ثانویہ رابعہ) کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور ۱۹۹۰ء میں عالمیت اور ۱۹۹۲ء میں فضیلت کی سند حاصل کی اور ۱۹۹۳ء میں المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی کا ایک سالہ کورس مکمل کیا، مولانا طالب علمی ہی کے زمانہ سے بڑے نیک صالح، شریف الطبع، بے ضرر اور فرشتہ صفت انسان تھے، ہر ایک کا خیال رکھتے، اپنے ساتھیوں کے بڑے خیر خواہ تھے، کسی کی دلآزاری کا کبھی (تفریحاً) ذہن میں تصور بھی نہ لاتے، آپ کے ساتھیوں میں مولانا یحییٰ ندوی بھٹکلی قطر، مولانا طارق شفیق ندوی، مولانا نیاز سجاد ندوی کویت، مولانا ڈاکٹر عبد الوحید ندوی ازہری (امام وخطیب دبئی) مولانا شاہد ندوی (آئی ایس کمشنر گجرات) مولانا اسماعیل صاحب ندوی (استاد معہد سیدنا ابی بکر صدیق مہپت مئو) مولانا عبد المتین ندوی (استاد درالعلوم ندوۃ العلماء) مولانا عمیر حسینی ندوی (استاد مدرسہ مظہر الاسلام بلوچ پورہ) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اساتذہ سے تعلق ومحبت:

مولانا مرحوم اپنے اساتذہ کا حد درجہ ادب و احترام کرتے تھے، کبھی کسی کا تذکرہ چھڑ جاتا تو بڑے اہتمام سے ان کا ذکر خیر کرتے اور ان کے لیے ایصال ثواب کا بھی اہتمام کرتے، اکثر حضرت مفکر اسلام علیہ الرحمہ کی مثال پیش کرتے کہ حضرت مولانا اپنے محسنین کے لیے روزانہ گیارہ مرتبہ یٰس شریف پڑھ کر ایصال ثواب کرتے تھے، مولانا کے چند بڑے اساتذہ میں حضرت مولانا مفتی ظہور صاحب ندوی، حضرت مولانا ناصر علی صاحب ندوی، حضرت مولانا عارف صاحب سنبھلی، حضرت

مولانا واضح رشید حسنی ندوی، حضرت مولانا محمد برھان الدین صاحب سنبھلی، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم، حضرت مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی دامت برکاتہم جیسی عظیم شخصیات شامل ہیں، جن کے سامنے مولانا مرحوم نے زانوئے تلمذ تہ کیا اور خصوصی طور پر مولانا نے حضرت مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ کے منبع علم وعرفان سے سیرابی حاصل کی اور اپنی شخصیت کو سنوارتے رہے اور اپنی علمی وروحانی پیاس بجھاتے رہے، اس کے علاوہ مولانا نے محدث کبیر شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ، علامہ شیخ محمد عوامہ رحمہ اللہ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جونپوری رحمہ اللہ سے مختلف مناسبتوں سے خصوصی استفادہ کیا اور اپنے وقت کے تمام ہی مشائخ اور بزرگوں سے آپ کا خصوصی تعلق وربط رہا، بعض بزرگوں سے آپ کو اجازت وخلافت بھی حاصل تھی، جن میں قابل ذکر حضرت شاہ نفیس الحسینی رحمہ اللہ اور حضرت مرشد الامۃ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم ہیں۔

تصنیف وتالیف اور علمی خدمات:

مولانا مرحوم کے قلم گہر بار سے بہت سی قیمتی اور وقیع کتابیں منظر عام پر آئیں، سیرت وسوانح آپ کا خاص موضوع تھا، اس کے علاوہ اسلامی تاریخ پر بھی آپ کی گہری نظر تھی، تصوف سے آپ کو خاص شغف رہا، آپ نے ''تاریخ اصلاح وتربیت'' کا ایک بہترین سلسلہ شروع کیا تھا جو ابھی ناتمام ہی ہے، جس کی صرف دو جلدیں ہی منظر عام پر آسکیں، پہلی جلد نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ، خلفاء راشدین اور خانوادۂ نبوت کے چشم وچراغ حضرات حسنین کے تذکرہ پر مشتمل ہے، دوسری جلد صحابہ کرام یعنی خیر القرون کی نمائندہ شخصیات کے تذکرہ پر مشتمل ہے، اللہ تعالیٰ اس تاریخی سلسلہ کی تکمیل کے اسباب مہیا فرمائے۔ اس کے علاوہ آپ کی مشہور کتابوں میں تذکرہ مولانا سید محمد

ثانی حسنی ندوی، فرشتہ صفت انسان، تذکرہ مولانا زبیر الحسن کاندھلوی، شیخ الحدیث حضرت مولانا یونس جونپوری، سلاسل اربعہ، عائشہ بی وغیرہ شامل ہیں، علاوہ ازیں مولانا نے کافی وقت تک مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی میں تدریسی خدمات بھی انجام دیں، بعد میں اپنے آپ کو تصنیف وتالیف اور حضرت مولانا دامت برکاتہم کی سفر وحضر میں رفاقت کے لیے یکسو کرلیا، مولانا بہت سے اداروں، مجلّات اور مدارس عربیہ کی سرپرستی بھی فرمارہے تھے، دارعرفات مدرسہ ضیاء العلوم کے علمی معاون بھی رہے، ''پیام عرفات'' کے رکن اداری رہے، پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' کے ایک عرصہ تک نائب مدیر کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے، اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی اس عظیم علمی ودینی خدمات کو قبول فرمائے اور اجر عظیم عطا فرمائے۔

مولانا کی بعض اہم خصوصیات مشاہدات کی روشنی میں:

مولانا مرحوم ہر ایک سے خاص شفقت فرماتے تھے، جس سے ملتے اس کو لگتا کہ سب سے زیادہ قربت مجھ ہی سے ہے، سب کے ساتھ شفقت وہمدردی کا معاملہ رکھتے، اگر کوئی اجنبی ہوتا اور پہلی مرتبہ ملتا تو اس کو اس بات کا احساس نہ ہوتا کہ میں پہلی مرتبہ مل رہا ہوں، مولانا مرحوم نبوی اخلاق کا عملی نمونہ تھے، آپ خیر خواہی کے جذبہ سے لبریز تھے، اساتذہ وطلبہ، چھوٹے بڑے ہر کوئی مولانا سے ربط رکھتا اور استفادہ کرتا، تواضع وانکسار، بے نفسی اور فنائیت کی اعلی مثال تھے، اپنے اساتذہ اور بڑوں کا حد درجہ احترام کرتے، ان کے سامنے خادم کی طرح پیش ہوتے، مولانا مرحوم حضرت مولانا محمد برہان الدین سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے مداح تھے، حضرت کی حیات میں اکثر ان کے پاس آیا کرتے، مخدومی حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتہم کی قربانیوں اور ندوے کے لیے آپ کی خدمات کا خوب تذکرہ کرتے،

مزید کہتے کہ ’’ایسا بے لوث اور مخلص شخص ندوہ کی تاریخ میں دوبارہ آنا مشکل ہے، ہم ناکارہ لوگ حضرت مہتمم صاحب کی قدر نہیں کرتے، اللہ ہمیں معاف فرمائے۔‘‘

طلبہ کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی:

مولانا ہر ایک کے لیے خیر خواہی و ہمدردی کے جذبہ سے لبریز رہتے تھے، ہر ایک سے تواضع اور محبت سے ملتے، ہم جیسے چھوٹوں اور طلبہ سے بھی اسی محبت اور تواضع سے ملتے، کوئی اگر اپنا ذاتی مسئلہ پیش کرتا تو دیر تک اس کی بات سنتے اور اس کا حل پیش کرتے، طلبہ کسی بھی وقت کسی بھی جگہ مولانا سے بے تکلف مل سکتے تھے اور اپنی بات رکھ سکتے تھے، اکثر فرماتے کہ ’’میرے لیے کیا حکم ہے؟‘‘ راقم کا طالب علمی کے زمانہ سے مولانا مرحوم سے تعلق رہا، شروع ہی سے لکھنے کی ترغیب دیتے، فرماتے کہ جو پڑھو اس کو خلاصہ کے طور پر لکھ لو۔ راقم کے اردو کے تمام مضامین اور کتابچے مولانا از خود چیک کرتے۔

مضامین کا استحضار اور تحریر کی بے پناہ صلاحیت:

مولانا مرحوم قلم کے بادشاہ تھے، مضمون کا استحضار اور اس پر مکمل گرفت رکھتے تھے، یہ ان کی خداداد صلاحیت تھی، جو دیکھتا وہ حیرت و استعجاب میں پڑ جاتا، کبھی راقم کو علامہ شبلی لائبریری اور مجلس تحقیقات و نشریات یا دفتر تعمیر حیات میں اپنے ساتھ لے جاتے، قلم اتنا سیال اور لکھنے میں اتنی روانی اور تسلسل تھا کہ قلم کو ایک لمحہ کے لیے بھی آرام نہ دیتے، اپنے آرام کی تو فکر ہی نہ تھی، گویا مضمون پورا نگاہوں کے سامنے ہو اور وہ نقل کرتے جا رہے ہوں۔

سیرت وسوانح قلمبند کرنے کا طریقہ:

خانوادۂ علم اللہ کی پوری تاریخ مع نسب نامہ اور اپنے تمام بزرگوں کے احوال مولانا کے نوک زبان رہتے، مولانا نے اپنے خاندان کے کئی بزرگوں کی سوانح عمری مرتب کی، دیگر بزرگوں کی سوانح بھی ترتیب دی، جن میں بعض خاصی ضخیم بھی ہیں، اس کے علاوہ مولانا خاندانِ کاندھلہ اور سہارنپور کے تمام بزرگوں کے احوال سے واقف تھے، ایک بار راقم نے معلوم کیا کہ جب آپ سوانح لکھتے ہیں تو اتنی معلومات کیسے کتاب میں جمع کر دیتے ہیں، فرمایا: ''اہم معلومات شروع ہی سے نوٹ رکھتا ہوں اور جو خاص متعلقین ہوتے ہیں ان سے خصوصی احوال دریافت کرتا رہتا ہوں۔'' مزید فرمایا کہ ''جب آدمی کوئی کام کرتا ہے تو راستے خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں، آپ بس ہمت وارادہ کریں۔''

خمسون حدیثاً کی جمع وترتیب میں مولانا کا اہم رول:

راقم طالب علمی کے زمانہ میں مخدوم گرامی حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتہم کو فجر بعد گھر چھوڑنے جاتا تو راستہ کے درمیان ایک حدیث سناتا، جس کی حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم عربی میں تشریح فرماتے، کئی سال یہ سلسلہ چلا، ایک روز مولانا محمود حسنی صاحب نے کہا کہ ''تم روزانہ حضرت کے گھر جاتے ہوئے حدیث شریف سناتے ہو اور حضرت حدیث کی تشریح فرماتے ہیں، اس کو لکھتے کیوں نہیں؟ تم کو اندازہ نہیں کہ کتنی قیمتی باتیں آتی ہوں گی۔'' مولانا نے توجہ دلائی اور راقم نے لکھنا شروع کر دیا اور ''خمسون حدیثاً'' کے نام سے کتاب مرتب ہو کر منظر عام پر آ گئی، یقیناً یہ کام مولانا ہی کی فکر وتوجہ سے ہو پایا، اللہ تعالیٰ مولانا کو اس کا بہترین بدلہ عطا فرمائے اور آپ کے لیے اس کو صدقہ جاریہ بنائے۔

بزرگوں کے افادات کی ترتیب کا طریقہ:

مولانا مرحوم اپنے بڑوں اور بزرگوں کا بڑا ادب واحترام کرنے والے اور ان کے افادات وفرمودات کو بڑی اہمیت وقدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، فرماتے کہ ان کی باتوں میں بڑے قیمتی لعل وگہر چھپے ہوتے ہیں، یہ ان کی پوری زندگی کا نچوڑ ہوتے ہیں، ندوۃ العلماء کے طالب علمی کے زمانہ سے ہی حضرت ناظم صاحب دامت برکاتہم کی عشاء بعد کی مجلس میں-الحمدللہ-شرکت کا موقع ملتا رہا ہے، ان مجلسوں کو لکھنے کی ترغیب بھی مولانا ہی دیتے، ابھی چند مہینوں سے ان مجالس کے بکھرے ہوئے اوراق کو جمع وترتیب دینا شروع کیا تھا اور مولانا محمود صاحب ہی اس کو چیک کر رہے تھے، جن کو وقتاً فوقتاً ''تعمیر حیات'' میں بھی دے دیا جاتا، مولانا فرماتے: ''اس طرح کی بزرگوں کی مجلسیں بے تکلف ہوا کرتی ہیں اور اس میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے، لہٰذا مرتب کو چاہیے کہ صاحب مجلس کے الفاظ اور ان کی منشا کو سمجھے، پھر اس کو ترتیب دے، کہیں کوئی ایسا جملہ یا لفظ جو مناسب نہ ہو تو اس کو ہٹا دے اور کوئی جملہ تشریح طلب ہو تو اس کی تشریح کر دے۔''

ایمانی غیرت وحمیت:

مولانا کی طبیعت میں بہت زیادہ نرمی تھی، کبھی اپنی ذات کے لیے غصہ نہ ہوتے، لیکن کبھی کوئی خلاف شریعت بات پیش آتی یا دینی شعائر پر کوئی آنچ آتی تو ایمانی غیرت وحمیت جوش میں آجاتی، بڑا ہی غضبناک ہوتے پھر کوئی آپ کے سامنے ٹک پاتا نہ ہی لب کشائی کی جرأت کر پاتا، اہل اللہ اور اولیاء اللہ کی شان میں کوئی بے ادبی برداشت نہ کرتے، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے تعلق سے اگر کوئی بات آتی، یا کسی صحابی کی شان

میں کسی سے ادنیٰ بھی گستاخی کا شائبہ ہوتا تو بپھر جاتے، فرماتے کہ ’’تمام دلائل ایک طرف، ایمانی غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم صحابہ کے متعلق ادنیٰ درجہ کا استخفاف بھی برداشت نہیں کر سکتے، اگر کوئی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تربیت و فیض یافتہ اور پاکیزہ ہستیوں کے تعلق سے ذرہ برابر بھی اپنے دل میں بدگمانی پیدا کرتا ہے تو وہ اپنی خیر منائے۔‘‘

معمولات کی پابندی:

اوراد و وظائف کا بڑا اہتمام کرنے والے تھے، اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرتے، تلاوت کلام پاک بھی پابندی کے ساتھ کرتے، آپ کے جہری ذکر کا تو ایک خاص انداز تھا، رمضان المبارک کے مہینے میں تکیہ کی مسجد میں بڑے ہی دلنشین انداز اور عجیب و غریب کیفیت و وجد میں ذکر کراتے، حاضرین پر جس کا ایک خاص اثر دیکھنے کو ملتا۔

تواضع اور طبیعت میں سادگی:

مولانا مرحوم بڑی سادہ طبیعت کے مالک تھے، مزاج میں بڑی سادگی تھی، طلبہ کے ساتھ اگر بیٹھتے تو ایک طالب علم ہی کی طرح دوزانو بیٹھتے، کوئی امتیاز ہی نہ ہوتا، نہ کوئی خاص نشست اختیار کرتے، خاص و عام ہر ایک کے ہر دل عزیز، ہر ایک کا خیال کرنے والے، کسی کی دل آزاری کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اگر کوئی دعوت دیتا یا کہیں لے جاتا اور کوئی تقاضا نہ ہوتا تو ساتھ چلنے میں کوئی تکلف نہ کرتے، دینی کام کے لیے تو ہر وقت تیار رہتے، راقم کی مسجد میں بھی تشریف لائے اور جمعہ میں خطاب فرمایا، لیکن دنیاوی معاملات سے بالکل دور رہتے، نہ دنیاوی بات کرتے ہوئے کبھی دیکھا۔

بیماری میں بھی علمی کاموں سے اشتغال اور اس کی فکر:

مولانا کافی عرصہ سے بیمار تھے، پیروں میں ورم آجانے کی وجہ سے چلنا پھرنا بھی

مشکل تھا، خاتون منزل میں ہی قیام تھا، راقم کی اکثر وہاں ملاقات ہو جایا کرتی، جب بھی ملاقات ہوتی، معلوم کرتے کہ کیا کر رہے ہو؟ ''تذکرۂ برہان'' کا کیا ہوا؟ (حضرت مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی رحمہ اللہ کی سوانح) فرماتے کہ ''کام کرتے رہو، اطمینان سے دیکھا جائے گا، مجالس مرتب کرتے رہو۔'' ایک روز جب ملاقات ہوئی تو ایک (پاکٹ سائز) کتابچہ ''آسان حج وعمرہ'' کے نام سے یہ کہتے ہوئے راقم کو عنایت فرمایا کہ یہ مختصر ہے، اسی کی روشنی میں تفصیل سے حج وعمرہ کے مسائل آسان زبان میں مرتب کرو، یہ مجھے مرتب کتاب سید محمد عاقل قادری صاحب نے حج وزیارت کی دعا اور اپنے دستخط کے ساتھ عنایت فرمایا تھا، اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے مجھے حج بیت اللہ کی سعادت بخشی تھی، تم اس کو صاحب کتاب کے لیے ایصال ثواب کی غرض سے ازسرنو مرتب کرو، تمہیں بھی اس کی برکتیں حاصل ہوں گی، اسی فکرمندی کا نتیجہ تھا کہ اسی بیماری کے زمانہ میں آپ کے قلم سے ''ہدیہ درود وسلام'' نامی کتاب منظر عام پر آئی، جس سے ان کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق ومحبت اور تعلق کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے بعد حضرت ناظم صاحب دامت برکاتہم کی خودنوشت سوانح کا پروف دکھایا اور بتایا کہ یہ دو جلدوں میں ہے، اس کا نام ''اوراقِ زندگی'' تجویز کیا گیا ہے، اس میں حضرت مولانا کے تعلق سے تعلّی کا کہیں شائبہ تک نہیں، یہ پہلی جلد پریس میں جانے کے لیے تیار ہے اور دوسری جلد بھی تیار ہو چکی ہے، تیسری جلد حضرت مولانا پر انشاء اللہ میں لکھوں گا۔ (کیا خبر تھی کہ خود مولانا کی سوانح لکھی جائے گی اور مولانا کی خواہش یوں ہی ناتمام رہ جائے گی۔)

بعض نصائح اور ملفوظات:

مولانا کی بہت سی قیمتی نصیحتیں راقم نے گرہ سے باندھ رکھی ہیں، جن سے راقم کو

بہت فائدہ ہوا، راقم سردست ان میں سے بعض ہدیہ قارئین کرتا ہے:

☆اللہ تعالیٰ سے جب بھی مانگو تو کہو کہ اے اللہ! بلا استحقاق عطا فرما۔

☆سعادت مندی بڑی چیز ہے اس کا ہمیشہ خیال رکھو۔

☆اپنے بڑوں اور اساتذہ کی ہمیشہ تعظیم کرتے رہو، ان کی تحقیر کا کبھی خیال بھی نہ آئے۔

☆ کتنے ہی بڑے بن جاؤ ہمیشہ اپنے آپ کو چھوٹا سمجھو، اس سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے، اگر آدمی اپنے کو بڑا سمجھ لیتا ہے، تو اس کے سیکھنے کا مرحلہ ختم ہو جاتا ہے۔

☆ کام کرتے رہو، لوگوں کے تبصروں پر دھیان نہ دو، جن کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا وہ دوسروں پر تبصرہ کرنے کا کام کرتے ہیں۔

☆سنی سنائی باتوں کو خاطر میں مت لاؤ، نہ کسی کے تعلق سے بدگمانی پیدا کرو، کوئی بات ہو تو براہ راست صاحب معاملہ سے معلوم کرلو۔

☆بزرگوں سے ملاقات اور ان کی مجلسوں میں شرکت کرتے رہو۔

☆ کچھ وقت ذکر کے لیے مختص کرلو، اس سے دل تر و تازہ رہے گا۔ دین کے کسی بھی رکن کو معمولی نہ سمجھو۔

☆اہل علم کی قدر کرو، حضرت مفکر اسلام علیہ الرحمہ کا یہی معمول تھا، حضرت اپنے سے چھوٹوں کا بھی اکرام کرتے تھے، بارہا ہم نے دیکھا کہ مولانا برہان الدین صاحب جب حضرت مفکر اسلام سے ملنے آتے تو حضرت مولانا اٹھ کر بیٹھ جاتے، بعد میں حضرت مولانا فرماتے کہ ایسا ہم نے علم کی تعظیم میں کیا۔

☆نعمتوں کی قدر کرتے رہو اور شکر ادا کرتے رہو، جتنا شکر کروگے اللہ تعالیٰ اتنا ہی نوازتا رہے گا۔

یہ اور اس کے علاوہ بہت سے قیمتی لعل و گہر مولانا بیٹھے بیٹھے یا چلتے پھرتے لٹاتے چلے جاتے تھے، پچاس سال کے قلیل عرصہ میں مولانا نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے اور انہوں نے ہم طلبہ کے لیے ایک قیمتی نمونہ چھوڑا کہ زندگی کے ایک لمحہ کو بھی ضائع نہ کیا جائے اور امت کے لیے ایسا سرمایہ چھوڑ کر جائیں جو امت کے لیے نفع بخش ثابت ہو، وقت کی قدر اور اس کے صحیح استعمال کے تعلق سے حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم کی مثال دیتے، فرماتے کہ اس طرح وقت کا پابند اور اس کی قدر کرنے والا ہم نے آج تک نہیں دیکھا، تصنیف و تالیف اور سیرت و سوانح نگاری کے علاوہ مولانا کا عظیم کام خاموشی کے ساتھ طالبان علوم نبوت کی تربیت و رہنمائی کرنا تھا، نہ جانے کتنے ہوں گے جو مولانا کے تربیتی، روحانی و عرفانی چشمہ سے فیضیاب ہوئے ہوں گے، اللہ تعالیٰ تمام مستفیدین کو مولانا مرحوم کے لیے صدقہ جاریہ بنائے اور مولانا کے جو نامکمل کام ہیں اس کے پورا ہونے کے انتظامات فرمائے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نَورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مخدوم گرامی حضرت ناظم صاحب دامت برکاتہم کا سایہ عاطفت صحت و عافیت کے ساتھ ہم سب پر دراز فرمائے، تمام اہل خانہ خصوصاً جناب مولانا مسعود حسن حسنی اور مولانا منصور حسن حسنی مدظلہما کو صبر جمیل نصیب فرمائے۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

قصیدہ ان کی یادوں کا

مولانا مبین احمد اعظمی ندوی
(استاذ معہد دار العلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

محبت کسی حرفِ اظہار کی محتاج نہیں، تعلقات کو بیان کی حاجت نہیں، دل کے نہاں خانوں میں چھپے ہوئے راز، بیٹھے ہوئے ارادے اور خاموش الفتیں خدائے علیم وخبیر سے مخفی نہیں۔ ہماری زندگی کا ہر ایک لمحہ اس کے سامنے آئینہ کی طرح عیاں ہے۔ یہی وہ خیال تھا جس نے قرطاس وقلم سے گہری وابستگی کے باوجود اپنوں کے بارے میں کچھ لکھنے سے اکثر روکے رکھا، مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ کے بارے میں کچھ لکھوں مگر کیا لکھوں؟ وہ محبت بھرے بول، وہ حوصلہ بڑھاتی ہوئی باتیں، وہ ہمہ وقت کی شاباشیاں، وہ کچھ نہ کچھ کر گذرنے کی مسلسل نصیحتیں جواب کبھی بھی سننے کو نہ ملیں گی۔

حشر تک اب زباں نہ کھولیں گے
تم پکاروگے ہم نہ بولیں گے

وہ مسکراتا ہوا چہرہ، وہ سجدۂ نیم شبی کا راز کھولتی ہوئی پیشانی، وہ اشک گریاں سے دُھلی ہوئی آنکھیں، وہ نرم لہجہ، وہ شیرینیٔ گفتار، وہ پاکیزگیٔ کردار، وہ فکر عمیق کا نشاں، کلاہِ سر کا بانکپن، وہ پیراہن کی بے تکلفی، سب کچھ تو یاد آتا ہے، مگر ہائے افسوس! قلم کی

ظاہری آنکھیں دلِ بے تاب کی کیفیت کیا جانیں، کورے کاغذ کو سیاہ کرنا تو کوئی کام نہیں اور احساس کی گہرائی اس پر کیسے آئے، ان کی یادوں کے امنڈتے ہوئے بادل اشک بن کر کبھی کبھار آنکھوں سے ٹپک پڑتے ہیں اور ذرا دیر کو کل پڑتی ہے، سکون آتا ہے، مگر تابہ کے؟

یادوں کا عجیب سلسلہ ہے
سویا ہوا درد جاگ اٹھا ہے

حضرت مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ کی شخصیت کے سوانحی پہلو، ان کی عظمت کے تاریخی زاویے، ان کے روز وشب، ان کے سحر وشام، اخلاق وعادات، اشغال ومعمولات، ان کی تصنیفی خدمات اور تدریسی خصوصیات، ان سب موضوعات پر اہل قلم نے خوب لکھا ہے اور آئندہ بھی لکھیں گے، مگر میں کیا لکھوں! وہ میرے محسن تھے، انہوں نے مجھ کو ہمیشہ حوصلہ بخشا، میری بے تکی خامہ فرسائیوں پر بھی مجھے مبارک باد دی، دعاؤں سے نوازا، نیک مستقبل کی پیشین گوئی کی۔ ان کی یہی یادیں، یہی باتیں میرے لیے اور میری نسلوں کے لیے سرمایۂ حیات ہیں، خدا مجھے ان کی امیدوں پر کھرا اترنے کی توفیق بھی دے اور ہمت بھی۔

تیری یادوں کا ہی سرمایہ لیے بیٹھے ہیں ہم کبھی بے سروسامان نہ ہونے پائے

قلم کے مسافر ان کی زندگی کو نمونہ بنائیں، علم وعرفان کے متوالے ان سے روشنی حاصل کریں اور ان کے لیے دعا کریں کہ ربِ کریم انہیں جنت الفردوس میں جگہ عنایت کرے۔ ایک دن ہم بھی اس دنیا سے جائیں گے اور بعد از دخولِ جنت انشاء اللہ ایک بار پھر محفل سجے گی، جام وسبو کا دور چلے گا، کچھ نکتہ آفرینیاں ہوں گی، وہی بزم آرائیاں ہوگی۔ ہے ہے حیاتِ لافانی کے جلوے!!

وہ عیش جنت ِ ابدی، نہیں زوال جسے
خدا نصیب کرے ہم کو بھی اور تم کو بھی

خانوادۂ حسنی کی روایتوں کا محافظ

مولانا سید محمد ریاض ندوی کھجناوری
(رئیس جامعۃ الحسنین صبری پور)

ہندوستان کے مشہور علمی، تاریخی وروحانی خاندان کے چشم وچراغ اور بزرگان دین کے معتمد خاص، نورانی نفوس کی صحبتوں سے فیض یافتہ، امام العرب والعجم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی نگاہِ تربیت واصلاح نفس اور شب وروز ان کے ساتھ رہ کر اپنی علمی، ادبی، اخلاقی وروحانی پیاس بجھانے والے مشہور عالم دین اور معروف سوانح نگار، ہردل عزیز حضرت مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ بھی آج اپنی خدمات جلیلہ کا صلہ پانے کے لیے اپنے رب کے جوار چلے گئے اور خانوادۂ حسنی کا ایک چمکتا دمکتا روشن چراغ گل ہوگیا، یہ حادثہ علم وکتاب سے تعلق رکھنے والوں، مدارس وخانقاہ، ان کے شاگردگان ومنتسبین کے ساتھ ساتھ مرشد الملۃ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے لیے ذاتی حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائے اور آپ کو صحت وسلامتی کے ساتھ ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔

مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ ایک کریم النفس، اعلیٰ اخلاق سے متصف، تواضع

وانکساری کے پیکر اور جلوت وخلوت عظیم تھے، بزرگان دین کی محبت ان کے رگ و ریشہ میں سما گئی تھی اور اکابرین کی خدمت کو وہ اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے، اسی لیے وہ حقیقی طور پر محمود و مسعود بن گئے، ان کو اپنے وقت کے عباقرۂ علم وفن اور تصوف و سلوک کے آفتاب و ماہتاب کی مصاحبت ملی، جس سے ان کی زندگی میں صالح انقلاب پیدا ہوا اور وقت کی قدر نے ان کو طویل العمر مصنفین ومؤلفین کی سنہری قطار میں لا کھڑا کیا۔

علامہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کے بارے میں آتا ہے آپ تین کاموں میں سے ایک کام میں ہمیشہ مشغول رہتے تھے مطالعہ کتب، تصنیف وتالیف، عبادت، یہی اوصاف مولانا کے اندر سما گئے تھے، مطالعہ کتب میں غرق رہ کر تصنیف وتالیف کا کام انجام دینا اور پھر راتوں کو خدا تعالیٰ سے راز ونیاز کی باتیں کرنا۔

اسی طرح نابغہ عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی شخصیت سے کون ناواقف ہے؟ زمانہ ان کو علم کی وجہ سے جانتا ہے، جب مرض الوفات میں ہاتھ ملانے کی طاقت نہ رہی تو کروٹ پر لیٹ جاتے اور سامنے کرسی پر کتاب کھلی ہوئی کھڑی رہتی، جب پورا صفحہ مطالعہ فرما لیتے تو کسی کی طرف ورق پلٹنے کا اشارہ کرتے، وہ ورق پلٹ دیتا اور آپؒ مطالعہ میں مشغول ہوجاتے، یہی حال اس وقت مولانا کا تھا، آپ مرض الوفات میں ہاسپٹل میں آخری سانسیں لے رہے تھے اور آپ کی کتاب ''ہدیہ درود وسلام'' کا اجراء عمل میں آرہا تھا، آپ نے اس فانی دنیا سے جانے سے قبل بارگاہِ نبوی میں درود وسلام کا ہدیہ پیش کرکے اپنے کو مقبول ترین وبارگاہ الٰہی میں اپنے محبوبین میں شامل کرالیا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے بارے میں لکھا ہے جو کچھ ملا وہ اساتذہ اور بزرگوں کے ساتھ ادب ومحبت اور تعلق رکھنے کے نتیجہ میں ملا، مولانا کی

زندگی میں بھی یہ وصف غالب تھا، آپ اپنے اساتذہ و بزرگوں کا احترام حددرجہ فرماتے تھے، ادب سے پیش آتے، خادم بن کر زندگی گزاری، اسی ادب اور خدمت کی بنا پر آپ سے خدا تعالیٰ نے کم عمری ہی میں وہ کام لیا زمانہ جس پر ناز کرے گا۔

تذکرہ وسوانح کا وزیر اعظم، دل شیشے کی طرح صاف، اخلاق حسنہ سے متصف، ہمیشہ شکر خداوندی واعتراف نعمت سے لبوں پر تبسم، کام کے دھنی، طلب علم اور فروغ علوم میں منہمک، قلم و کتاب کے بادشاہ کا اسم گرامی مولانا محمود تھا، آپ کے قلمی احسانات وخدمات سے ملک وملت گراں بار رہے گی، قدرت خداوندی کی مہربانی کہ آپ نے سیرت وادب، سوانح وتذکرہ نگاری کا ایک ایسا گلشن وچمن آباد کیا، جس کی بہاریں دیر تک قلم و کتاب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے راحت کا سامان بنیں گی۔

آپ ۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۲/ جولائی ۱۹۷۱ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم ندوۃ العلماء کے ایک مکتب میں حاصل کی، ابتدائی عربی درجات کی تعلیم مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی میں حاصل کرنے کے بعد ثانویہ اور عالمیت کی تکمیل دار العلوم ندوۃ العلماء سے کی۔ حدیث شریف کا دو سالہ کورس ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء میں کیا اور پھر المعھد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی کا ایک سالہ کورس کر کے مدرسہ ضیاء العلوم سے تدریس کا آغاز کیا اور دارِ عرفات رائے بریلی میں تصنیف وتحقیق سے وابستگی اختیار کی۔ ۲۰۰۱ء سے معاون ایڈیٹر کے طور پر پھر کچھ عرصہ بعد نائب مدیر کے طور پر ''تعمیر حیات'' سے وابستہ رہے، اس کے ساتھ ماہنامہ ''رضوان'' لکھنؤ کے معاون مدیر اور دارِ عرفات رائے بریلی کے ترجمان ''پیامِ عرفات'' کی مجلس ادارت کے رکن تھے۔

قدرت خداوندی نے آپ کو قلم و کتاب سے وابستگی عطا فرمائی تھی اور آپ بے انتہا مشغولیات کے جھمیلوں سے جلد فارغ ہو کر ہاتھ میں قلم پکڑتے اور لکھتے ہی

جاتے، ان کا محبوب مشغلہ ہاتھ میں قلم پکڑنا اور ملت اسلامیہ کو اپنے عباقرہ علم سے روشناس کرانا تھا، حافظہ بڑا پختہ تھا، علم مستحضر تھا، اس لیے سفر وحضر میں ان کا قلم اشہب جاری رہتا، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے علمی مزاج، کچھ کرنے کی دھن، ملت اسلامیہ کی زبوں حالی پر افسوس، بزرگان دین واولیاء للہ کی زندگی کے پراثر واقعات سناتے رہتے، تصوف وسوانح نگاری آپ کا خاص ومحبوب مشغلہ تھا، مشورہ دینے میں بڑے مخلص تھے، علم وحلم اور حکمت ودانائی سے خدا عز وجل نے نوازا تھا، بزرگان دین کے ملفوظات ارشادات، مکتوبات، خطابات کے اہم حصے ان کو از بر تھے، آپ کا تعلق صرف قلمی دنیا اور ادبی شہ پاروں کے لکھنے سے نہ تھا، بلکہ شب بیداری، ذکر واذکار، کثرت استغفار، بزرگوں سے تعلق اور ان کی مصاحبت آپ کی طبیعت کا خاصہ تھی۔

جب بھی کوئی علمی، ادبی، تاریخی وروحانی شخصیت کوچ کر جاتی اور آپ کو کچھ لکھنا ہوتا تو چند روز یا چند ہفتوں کے لیے الگ تھلگ ہوجاتے، جس کی خاندان کے چند افراد کو خبر رہتی اور ایک ضخیم تصنیف لے کر نمودار ہوتے، قلم کار حیرت واستعجاب میں پڑ جاتے، اتنی جلد یہ تحقیقی ومستند کام کیسے انجام پا سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال صالحہ کی بدولت ان کے وقت میں عجیب برکت عطا فرمائی تھی۔

ہمارے مربی، مصلح ملت حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کی حیات پر آپ کی کتاب ”سیرت داعی اسلام“ ایک زندہ جاوید قلمی کاوش ہے جو مختصر عرصہ میں منظر پر آئی، حضرت مولانا زبیر الحسن کاندھلویؒ کی سوانح ”تذکرہ مولانا زبیر الحسن“ بے مثال کارنامہ ہے اور عظیم فلسفی ومربی حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کی شخصیت کو آئینہ دکھاتے ہوئے آپ نے ”تذکرہ مولانا عبدالباری“ اور ”فرشتہ صفت انسان“ تحریر فرما کر علمی دنیا میں ایک یادگار اضافہ کیا ہے، محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق

ہردوئی کی حیات جاوداں اہل علم وقلم کے لیے ایک تحفہ ہے، امیر المومنین فی الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب جونپوریؒ کی علمی وتاریخی شخصیت کا جائزہ بھی آپ نے قلمی عدالت میں ''تذکرہ مولانا محمد یونس'' کے نام سے پیش کیا ہے جس کو بے حد پسند اور مقبولیت حاصل ہوئی، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ پر آپ کے قلم سے نکلنے والی ضخیم کتاب ''تاریخ اصلاح وتربیت'' ایک تاریخی انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، یہ مقام ان کو اس وجہ سے نصیب ہوا کہ ان کو اصحاب علم وقلم اور صاحب نسبت افراد کی خدمت ومصاحبت میسر رہی، جس نے ان کو کندن بنایا اور حصول علم میں ''بچہ'' بنے رہنا بھی ان کے لیے مفید اور کارگر ہوا۔

طلباء کے لیے لکھے گئے میرے مضامین کا مجموعہ ''اپنی دنیا آپ پیدا کر'' کو جب شائع کرنے کا ارادہ کیا تو مادر علمی دار العلوم ندوۃ العلماء میں اپنے اکابر اساتذہ سے کتاب کے بارے میں کچھ تحریر کرانے کا ارادہ کیا، مادر علمی کے مہمان خانہ میں جس شخصیت سے پہلی ملاقات ہوئی وہ مولانا محمود حسنی صاحبؒ تھے، اپنا مقصد سفر بتلایا، بڑی خوشی کا اظہار فرمایا اور کتاب کا مسودہ اپنے سپرد کرلیا، ناشتہ سے فارغ ہوکر حضرت مولانا دامت برکاتھم سے ملاقات ہوئی، آپؒ بھی ساتھ تھے، مقصد سفر بتلایا اور حضرت سے درخواست کی، یوں گویا ہوئے کہ یہ طلبہ کے لیے مفید مضامین ہیں، آپ سے کچھ لکھوانا چاہتے ہیں۔ حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا: انشاءاللہ لکھ دیں گے۔ آئندہ صبح دس بجے ملاقات کی تو حضرت کی تحریر جو کتاب کا مقدمہ ہے عنایت فرمائی اور بڑی دعاؤں سے نوازا، فون پر ملاقات رہتی، ہمیشہ دعاؤں سے نوازتے، بہترین مشوروں سے شاد فرماتے۔

الغرض آج ہم نے ایک عظیم انسان کو رخصت کردیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اعلیٰ علیین میں اپنی نیک ارواح کے ساتھ ان کا حشر فرمائے۔

علم و دانش کا ایک روشن تارہ جو غروب ہو گیا

ڈاکٹر غیاث الاسلام صدیقی ندوی
(سکریٹری رابطہ ادب اسلامی، برانچ دہلی)

مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ کی رحلت علمی و دینی حلقوں کے لیے بڑا المناک سانحہ ہے، وہ ایک عرصہ سے علیل تھے، ان کی بیماری سے متعلق خبریں وقتاً فوقتاً موصول ہوتی رہتی تھیں، لوگ ان کی صحت کے لیے دعا گو تھے، لیکن مالک حقیقی کو کچھ اور ہی منظور تھا، ۱۴/محرم الحرام ۱۴۴۴ھ بمطابق ۱۲/اگست ۲۰۲۲ء کی صبح مولانا کی وفات حسرت آیات کی جانکاہ خبر ملی، دل دھک سے رہ گیا، آنکھوں کے سامنے ان کا چہرہ پھر گیا اور زبان سے نکلا ''انا للہ وانا الیہ راجعون!'' پھر ان کی یادیں ذہن میں گردش کرنے لگیں، رائے بریلی میں بارہا رمضان کے قیام میں حضرت مولانا رابع حسنی ندوی دامت برکاتہ کی مختلف مجلسوں میں راقم نے مولانا محمود صاحبؒ کو سیرت وفضائل کی کتابوں میں سے پڑھتے ہوئے سنا تھا، اسی طرح ندوہ میں اپنی طالب علمی کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی کئی بار ان کی زیارت ہوئی اور ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا، وہ سوانح نگاری کے ماہر، بحث و تحقیق میں سرگرداں، تدریس و تربیت میں

مشغول، علم وادب اور دینی اقدار کے پاس دار، ذکر وفکر کے شیدائی، پیکر ذہانت وشرافت، بڑوں کے نورنظر، چھوٹوں کے مشفق ومحسن، ساتھیوں اور ہم عمروں میں معزز ومکرم، دسیوں کتابوں کے مصنف، خانوادۂ علم الٰہی کے چشم وچراغ اور دانش کدہ ندوۃ العلماء کے ممتاز فضلاء میں سے تھے، ان کی وفات کی خبر سے دل تڑپ اٹھا اور بڑی تکلیف کا احساس ہوا اور حفیظ جالندھری کے اس شعر میں اس حادثہ کی علت نظر آئی:

زندگی فردوس گم گشتہ کو پاسکتی نہیں
موت ہی آتی ہے یہ منزل دکھانے کے لیے

جناب حسن حسنیؒ کے فرزندار جمند اور مولانا سید محمد مسلم حسنیؒ کے پوتے مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ کی ولادت ۱۹۷۱ء کو تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں ہوئی، آپ مشہور سوانح نگار حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی کے نواسے تھے، آپ کی تربیت ایسے ماحول میں ہوئی جہاں ہر طرف علم نافع اور عمل صالح کی فراوانی تھی اور پورے خانوادے کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (۱۹۱۴-۱۹۹۹ء) کی سرپرستی حاصل تھی، ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ پہنچے، جہاں سے عالمیت اور تخصص فی الحدیث کرکے ۱۹۹۲ء میں سند فضیلت حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی میں آپ مدرس ہوگئے، جہاں عرصہ دراز تک علم وادب کی آب یاری میں مشغول رہے، طلبہ کی بڑی تعداد نے آپ سے استفادہ کیا، آپ کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی صحبت وخدمت کا وافر حصہ ملا تھا، ان کے بعد آپ نے اپنی زندگی اپنے

بزرگوں کی خدمت، ان سے استفادہ اور علمی تعاون میں لگادی،
مولانا شمس الحق ندوی مدظلہ کے بیان کے مطابق ''حضرت مولانا کی
وفات کے بعد مولانا محمود صاحب نے خود کو ناظم ندوۃ العلماء حضرت
مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہ اور سابق معتمد تعلیم ندوۃ
العلماء مولانا سید محمد واضح حسنی ندویؒ کے گویا حوالے کردیا اور ان کی
تربیت وتوجہ ان کو حاصل رہی اور آخر کے کئی سال انہوں نے مدرسہ
ضیاء العلوم میں تدریسی خدمت کو بھی ترک کر کے خود کو حضرت مولانا
مدظلہ کی خدمت اور علمی معاونت کے لیے وقف کردیا اور آخر کار علمی
و تصنیفی معاون اور مزاج شناس بنے۔''

(تعمیر حیات: ۲۵/اگست، ۲۰۲۲ء، صفحہ ۵)

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد ۲۰۰۱ء میں ''تعمیر حیات'' کے نائب مدیر کے طور پر مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ کا تقرر ہوا، اس ذمہ داری کو آپ آخری وقت تک بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، مولانا کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بڑے ملنسار اور بے تکلف ہونے کے ساتھ ایک شریف النفس اور علمی آدمی تھے، تدریس کے علاوہ تصنیف وتالیف ان کا بڑا مشغلہ تھا، اہل علم وتقویٰ کی سوانح نگاری سے ان کو خاص دلچسپی تھی، اس موضوع پر ان کی بہت سی کتابیں شائع ہوکر مقبول خاص وعام ہوئیں، آئندہ سطور میں مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کی علمی و تصنیفی کوششوں کا ایک مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے:

تاریخ اصلاح وتربیت:

مولانا کا بڑا کارنامہ ''تاریخ اصلاح وتربیت'' کی تالیف ہے، یہ کتاب دو

جلدوں میں ہے، پہلی جلد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ اور خلفائے راشدین نیز حضرات حسنین کی سیرت اور ان کے کارناموں کو بڑی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کا سولہ صفحات پر مشتمل پر مغز مقدمہ اس کتاب کی اہمیت وافادیت کو سند بخشتا ہے، مولانا مدظلہ اس کتاب کے سلسلہ میں یوں رقم طراز ہیں:

”مولوی سید محمود حسن حسنی ندوی سلمہ نے تاریخ اسلام کے مختلف ادوار کی شخصیتوں میں مرکزی شخصیتوں کو نمونہ کے طور پر لیا ہے اور ان کی سیرت کو پیش کرنے کے ساتھ ان کے اصلاح وتربیت کے منہج کو بھی پیش کیا ہے، انہوں نے ایک تسلسل دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کا درخت اپنے موسم میں برابر پھل دیتا رہا ہے۔“

(تاریخ اصلاح وتربیت:۱/ ۳۹)

اس کے علاوہ حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ (۱۹۳۲-۲۰۱۹ء) کا سترہ صفحات پر مشتمل معلومات افزا مقدمہ نیز حضرت مولانا سید عبد اللہ حسنی ندویؒ (۱۹۵۷-۲۰۱۳ء) کا سولہ صفحات کا پیش لفظ اس کتاب کی قدر ومنزلت میں اضافہ کا باعث ہے، مولانا محمد واضح حسنی ندویؒ اس کتاب کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

”حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کسی ایک عہد اور قوم کے ساتھ محدود نہیں تھی، ساری انسانیت کے لیے اور ہمیشہ ہمیش کے لیے تھی، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کا دائرہ زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے اور عہد بہ عہد اس سلسلہ کو آگے بڑھانے کا کام علماء ربانیین، مصلحین

امت، فاتحین ومجاہدین اور دیگر خادمین دین ملت نے انجام دیا اور اصلاح وتربیت کا عمل بلا انقطاع جاری ہے، ضرورت تھی کہ اسلامی تاریخ کا یہ حصہ اسی تسلسل کے ساتھ سامنے آتا جو اسلام کی سیاسی تاریخ کے نیچے دب کر رہ گیا تھا۔‘‘ (حوالہ سابقہ:۱/۵۶)

اس کتاب کے شروع میں عرض مصنف کے عنوان کے تحت مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ نے احسان وسلوک کی ابتداء وارتقاء پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، صحابہ کرام اور ان کے بعد سے اپنے زمانہ تک کی اصلاح وتربیت سے متعلق شخصیات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سلسلہ وار ذکر کیا ہے، اس سلسلہ میں بڑی عمدہ معلومات فراہم کی گئی ہیں، بعد ازاں مقاصد بعثت سے بحث کرتے ہوئے دعوت وتعلیم دین، اصلاح وتربیت اور تزکیہ واحسان کو مؤلف نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تشریف آوری کے اہم مقاصد میں سے بتایا ہے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ولادت باسعادت سے وفات کے سانحہ عظیم تک کے اہم واقعات کو بیان کیا گیا ہے، پھر بڑی تفصیل سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اخلاقی تعلیمات وہدایات سے بحث کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان ہر موقع پر دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا اور اپنی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی ادا کرنے والا ہوتا ہے، وہ ہمیشہ اللہ کے حضور میں اپنے آپ کو گنہگار گردانتے تھے، استغفار وانابت کا اہتمام کرتے ہوئے، استغفار وانابت کا اہتمام کرتا ہے، امانت داری، وفاداری اور صبر وشکر سے اس کی زندگی عبارت ہوتی ہے، نرمی وبردباری اس کی طبیعت اور سچائی اس کی عادت ہوتی ہے، خوش اخلاقی اور تواضع اس کا امتیاز ہوتا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا ایک مضمون ’’خلفائے اربعہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بے نظیر وحدت امتزاج ووحدت منہاج‘‘ شامل کتاب ہے، جس میں

حضرت مولانا نے خلفائے راشدین کی ترتیب زمانی کی مصلحتوں کو آشکار کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام کی زندگی میں پیش آنے والے تمام ادوار ومراحل کی نمائندگی خلافت راشدہ کے مختصر سے دور میں کردی گئی ہےاور ہر آنے والے نازک دور کے لیےاس میں رہنمائی کا سامان موجود ہے، حضرت مولانا فرماتے ہیں:

”آغاز کا اقبال وترقی اورفتنہ آشوبی کے دور میں کس استقامت اورایمان ویقین کا مظاہرہ کرنا چاہیے، اس کی رہنمائی ہم کوحضرت ابوبکرصدیقؓ کی حیات طیبہ اور خلافت راشدہ سے حاصل ہوتی ہے، عروج وشباب اور امن ونظام کے زمانہ میں کس استقامت اور ایمان ویقین کا مظاہرہ کرنا چاہیے، اس کی رہنمائی ہم کو فاروق اعظمؓ کے دور خلافت سے ملتی ہے، مخالفتوں، شورشوں اورفتنوں اور بے نظمی اور انتشار کے وقت کس ثبات واستقامت، کس پامردی، کس ایمان ویقین کی ضرورت ہے، اس کا نمونہ حضرت عثمان اور حضرت علی کی زندگی میں ملتا ہے۔“

(حوالہ سابقہ:۱/ ۳۶۷)

مؤلف نے امت محمدی کا امتیاز واعجاز، خلافت نبوت اورخلفائے راشدین کے عنوان سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت وخلافت پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور خلافت راشدہ کے نظام اوراس میں پوشیدہ حکمتوں سے پردہ اٹھایا ہے، ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

”خلافت راشدہ کا بڑا امتیاز اور خصوصیت یہ تھی کہ جس طرح اس میں معاشرت وسیاست کی کلیات وجزئیات کو اسلامی رنگ میں رنگ دیا گیا، اسی طرح ایمانیات واخلاقیات کے ایک ایک پہلو کو بھی پیش

کر کے صالح ایمانی معاشرہ قائم کر دیا گیا، اس میں اگر الحاد و بے دینی وارتداد، نفاق، شرک اور فسق و فجور، شقاق و عداوت، قتل وسفا کی کے واقعات نظر آتے ہیں تو اس موقع پر خلفائے راشدین کے اقدام نے قیامت تک کے لیے ایسے حالات میں اقدام وعمل کی وہ نظیر پیش کر دی جس کی روشنی میں ہمیشہ رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔"

(حوالہ سابقہ:۱/۳۵۹)

اس کتاب کے باب ششم میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، باب ہفتم میں حضرت عمر فاروقؓ، باب ہشتم میں حضرت عثمان غنی اور باب نہم میں حضرت علی مرتضیٰ کے حالات زندگی اور خلافت کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز باب دہم میں خاندان نبوت کے چشم و چراغ سید حضرت حسنؓ اور سیدنا حضرت حسینؓ کی سوانح بیان کی گئی ہے، یہ اس کتاب کی پہلی جلد ہے جو ۶۵۶ صفحات پر مشتمل ہے، اس کی اشاعت ۲۰۱۵ء میں سید احمد شہید اکیڈمی دار عرفات تکیہ کلاں رائے بریلی سے ہوئی۔

دوسری جلد میں پہلے قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں صحابہ کرامؓ کے مقام ومرتبہ کو واضح کیا گیا ہے، پھر ان کی ۱۳۱ نمائندہ شخصیات، حضرت ابو عبیدہ بن جراح، حضرت عبد الرحمن بن عوف، حضرت طلحہ، حضرت زبیر بن عوام وغیرہ نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھیوں اور دیگر سولہ جلیل القدر صحابیات کی ایمان وعزیمت اور اصلاح وتربیت سے عبارت زندگیوں کو پیش کیا گیا ہے، یہ جلد ۵۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی اشاعت ۲۰۲۰ء میں سید احمد شہید اکیڈمی سے ہوئی۔

سوانح حضرت مولانا ابرار الحق حقیؒ:

یہ کتاب محیی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق (۱۹۲۰-۲۰۰۵ء) کی حیات

وخدمات پیش کرتی ہے، وہ مولانا تھانویؒ کے آخری خلیفہ تھے، احیائے سنت، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کی دعوت، اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی تلقین، مولانا کی زندگی کے نمایاں ترین مقاصد تھے، مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ اپنی اس تصنیف کا محرک یوں تحریر کرتے ہیں:

''راقم آثم پر یہ اللہ تعالیٰ کا بے پایاں فضل وکرم ہے کہ اسے اہل اللہ کی خدمت میں حاضری کا شوق اور ان کی بات سننے اور ان کی تحریریں پڑھنے کا جذبہ شروع سے رہا ہے، ان بزرگان دین کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو نسبت اور تعلق حاصل ہوتا ہے، اس کا فیض متعدی ہوکر ان سے متعلق لوگوں کو بھی پہنچتا ہے، ان کی سیرت وتذکرے اور ملفوظات ومکتوبات کا مطالعہ، ان کی صحبت اور بلاواسطہ استفادہ کا قائم مقام ہوتا ہے، دین کی نسبت سے آج یہی شوق وجذبہ ان نقوش وتاثرات کو پیش کرنے کا محرک بنا جو اس کے مشاہدے وتجربے میں آئے یا جن کے مشاہدے میں آئے تھے، ان سے سننے کو ملے۔''

(سوانح حضرت مولانا ابرارالحق حقی:۱۱)

مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ (۱۵۵۱-۱۶۴۲ء) جو کہ مولانا ابرارؒ کے جد اعلیٰ تھے، ان کا اور اسی طرح مولانا کے خاندان کے دیگر بزرگوں کا قدرے تفصیل سے اس کتاب میں ذکر آیا ہے، تصوف کی اہمیت وضرورت سے متعلق مؤلف نے سیر حاصل بحث کی ہے اور ہندوستانی معاشرے پر مرتب ہونے والے اس کے اثرات پر روشنی ڈالی ہے، انہوں نے بڑی تفصیل سے مولانا ابرار الحق کی علمی واصلاحی

کوششوں کا جائزہ پیش کیا ہے، کتاب کے آخری حصہ میں مولانا ابرار الحق کے پندرہ ممتاز معاصر اہل علم وتعلق کے تاثرات کومختلف رسائل وجرائد سے جمع کر دیا گیا ہے، دس ابواب اور ۲۳۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی اشاعت ''صدق فاؤنڈیشن گولہ گنج لکھنؤ'' سے ۲۰۰۷ء میں ہوئی۔

سوانح حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی:

مولانا محمود صاحب کے نانا محترم حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی (۱۹۲۵-۱۹۸۲ء) کے حالات زندگی پر مشتمل یہ کتاب صرف ایک سوانح نہیں ہے، بلکہ اس میں خانوادہ شاہ علم اللہی کی پوری تفصیل اور تاریخ آ گئی ہے، مولانا کے اجداد میں شیخ الاسلام سید قطب الدین محمد کے دربار میں سیرت وسوانح کی شہرہ آفاق کتاب نزہۃ الخواطر کے حوالہ سے یہ بات رقم کی گئی ہے کہ وہ شیخ عبدالقادر جیلانی کے بھانجے تھے، ۵۸۱ءکو وہ بغداد میں پیدا ہوئے، علم ومعرفت میں ممتاز علماء واساتذہ سے انہوں نے کسب فیض کیا، تاتاریوں کے ہنگاموں کے بعد بغداد سے اس وقت کوچ کیا جب ان کے والد ماجد سید رشید الدین کی شہادت ہو چکی تھی، غزنی آئے اور وہاں کچھ مدت رہنے کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور قطب الدین ایبک کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کیا، کڑا، مانک پور اور ہنسوہ کے علاقہ ان کی زیر قیادت فتح ہوئے، سلطان شمس الدین التمش ان کا نہایت اکرام کرتا تھا۔ (سوانح حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی: ۴۴-۴۲)

علاوہ ازیں خاندان کے دیگر بزرگوں حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی، سید شاہ آیت اللہ، مولانا محمد صابر، مولانا سید محمد واضح محدث، مولانا سید غلام جیلانی وغیرہ کا تذکرہ تفصیل سے کیا گیا ہے، بعد ازاں شخصیت کے تشکیلی عناصر کے عنوان کے تحت مولانا

ثانی کی ولادت ونشو ونما، والدین کے حالات، ڈاکٹر عبد العلی حسنی کی فکر وتوجہ اور سرپرستی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حضرت سید محمد ثانی حسنی نے اپنی زندگی میں گوناگوں ذمہ داریوں کو بڑی عمدگی سے انجام دیا، ماہنامہ رضوان کا اجرا دسمبر ۱۹۵۶ء میں ہوا، اس کے بانی مدیر مولانا محمد ثانی حسنی قرار پائے اور ان کی خالہ صاحبہ امۃ اللہ تسنیم معاون مدیر بنائی گئیں، اس کے علاوہ قاضی عدیل عباسی اور حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی کوششوں سے دینی تعلیمی کونسل کا قیام ۱۹۵۹ء کو عمل میں آیا، مولانا محمد ثانی اس تحریک کو طاقت پہنچانے میں سرگرم عمل رہے، ان کی خدمات کی قدر کرتے ہوئے ان کو رائے بریلی میں انجمن تعلیمات دین کا صدر بنایا گیا، ان کی صدارت میں اس انجمن نے رائے بریلی میں مکاتب کا جال بچھا دیا، جن میں سے بہت سے مکاتب اب مدرسے کی شکل اختیار کر چکے ہیں، مولانا محمد ثانی نے ان مکاتب کے لیے ترانہ بھی نظم کیا۔

(حوالہ سابقہ: ۳۵۵-۳۵۶)

مدرسہ فلاح المسلمین ۲ دسمبر ۱۹۶۶ء کو تکیندوا رائے بریلی میں قائم ہوا، اس کے ناظم مولانا محمد ثانی حسنی مقرر ہوئے اور انہوں نے اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی ادا کیا، بقول حضرت مولانا علی میاں ندویؒ ''ان کو اس سے اولاد سے زیادہ تعلق پیدا ہو گیا تھا، وہ دن ورات اس کی ترقی وتوسیع کی فکر میں رہتے تھے۔'' (حوالہ سابقہ: ۳۶۱)

ان ذمہ داریوں کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ وہ بڑے صاحب ذوق شاعر بھی تھے، انہوں نے ندوہ کا ترانہ نظم کیا جس میں اس عالمی ادارے کا تعارف بڑی خوبصورتی سے کرایا، علاوہ ازیں آپ نے مختلف علمی ودینی شخصیات پر بہت سی کتابیں بھی تصنیف کیں، ان کی حیات وخدمات سے متعلق مولانا سید محمود حسن حسنی

ندوی کی یہ کتاب چودہ ابواب اور ۵۳۶ صفحات پر مشتمل ہے، اس کی اشاعت ۲۰۱۹ء میں سید احمد شہید اکیڈمی سے ہوئی۔

تذکرہ حضرت مولانا زبیر الحسن کاندھلویؒ:

اس کتاب میں حضرت مولانا زبیر الحسن کاندھلویؒ (۱۹۵۰-۲۰۱۴ء) کے جدی بزرگوں کے حالات کو تفصیل سے کیا گیا ہے، مؤلف نے اپنے اور مولانا زبیر صاحبؒ کے خاندانوں کے مابین تاریخی تعلقات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے، انہوں نے ذکر کیا ہے کہ جب حضرت سید احمد شہیدؒ ۱۲۳۴ھ میں اطراف دہلی کے سفر پر نکلے تھے، تو کاندھلہ بھی گئے تھے، جہاں مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے مکان پر قیام فرما ہوئے، سید صاحب سے مفتی صاحب نے بیعت وارادت کا تعلق قائم کیا اور ان کے خلیفہ بھی ہوئے، مفتی صاحب نے سید صاحب کے چند ملفوظات اور ان کا طریقہ ارشاد وتعلیم ''ملہمات احمدیہ'' کے نام سے مرتب کیا جو ۱۲۹۹ھ میں شائع ہوا۔

(تذکرہ حضرت مولانا محمد زبیر الحسن کاندھلوی: ۳۲-۳۳)

مفتی صاحب کے علاوہ اس کتاب میں مولانا ابوالحسن حسن کاندھلویؒ (۱۷۸۶-۱۸۵۳ء)، مولانا نور الحسن کاندھلویؒ (۱۸۱۲-۱۸۶۸ء)، مولانا حکیم ظہور الحسن محمد ابراہیم (۱۸۳۳-۱۹۴۰ء)، مولانا حکیم رضی الحسن (۱۸۷۲- ۱۹۳۲ء)، مولانا اکرام الحسن کاندھلوی (۱۸۹۱-۱۹۷۱ء) مولانا محمد زکریا کاندھلوی (۱۸۸۹-۱۹۸۲ء) اور مولانا زبیر الحسن کاندھلویؒ کے والد ماجد مولانا محمد انعام الحسن کاندھلویؒ (۱۹۱۸-۱۹۹۵ء) کے احوال بھی بیان ہوئے ہیں۔

حضرت مولانا زبیر الحسن کاندھلویؒ کی زندگی کے ابتدائی حالات اور تعلیم

وتربیت کے ساتھ ہی مختلف بزرگوں کا ان کی تربیت میں کیا کردار رہا ہے، اس کو بھی بیان کیا گیا ہے، ان کو مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے خلافت اور اجازت بیعت حاصل تھی، اسی طرح مولانا افتخار الحسن کاندھلوی سے بھی اجازت بیعت وارشاد حاصل تھی، اس کتاب کا ایک باب مرکز نظام الدین اولیاء دہلی کے لیے خاص ہے، جس میں اس مرکز کے قیام اور اس میں تعلیم وتدریس اور پھر دعوت وتبلیغ کے آغاز وارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے، اسی طرح ایک باب میں مولانا زبیر صاحبؒ کی ذمہ دارانہ حیثیت پر بھی گفتگو کی گئی ہے، نیز مولانا زبیر صاحب کے اوصاف وکمالات، یومیہ معمولات، اجتماعات میں وعظ ودعا اور دعوت وتبلیغ کے کام کی توسیع کے لیے فکرمندی پر تفصیلی بحث کی گئی ہے، ۲۹۶ صفحات پر مشتمل حضرت مولانا محمد زبیر الحسن کاندھلوی کے اس تذکرہ کا طبع دوم ۲۰۱۷ء میں سید احمد شہید اکیڈمی سے شائع ہوا۔

عائشہ بی:

مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ نے اس کتاب میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی ہمشیرہ محترمہ امۃ اللہ تسنیم (۱۹۰۸-۱۹۷۶ء) جوکہ خاندان میں عائشہ بی کے نام سے معروف تھیں، ان کی علمی وادبی اور عائلی زندگی کی تفصیلات پیش کی ہیں، اس کے ابتدائی حصے میں خانوادہ علم اللہی کی عظیم ہستیوں حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی (۱۰۳۳-۱۰۹۶ھ)، حضرت سید احمد شہید (۱۲۰۱-۱۲۴۶ھ)، مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی (۱۲۴۳-۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء) وغیرہ کی حیات وخدمات کا قدرے تفصیل سے تعارف کرایا گیا ہے، بعدازاں محترمہ کے شوہر مولانا سید ابوالخیر برق جوکہ ان کے ماموں کے فرزند تھے، ان کے حالات بھی تفصیلی طور پر آگئے ہیں،

نیز مرحومہ کی تصنیفی اور دعوتی خدمات کا تفصیل سے جائزہ پیش کیا گیا ہے، کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ ہے جو مؤلف کتاب کی والدہ محترمہ سیدہ امامہ حسنی (۱۳۶۶-۱۴۲۶ھ/ ۱۹۴۷-۲۰۰۵ء) کے تذکرہ پر مشتمل ہے، بارہ ابواب، ایک ضمیمہ اور ۳۲۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۰۱۲ء میں مکتبہ سیدہ امامہ حسنی جامعہ ام المومنین عائشہ الاسلامیہ للبنات رائے بریلی سے شائع ہوئی۔

سلاسل اربعہ:

یہ رسالہ مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ نے داعی اسلام حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کی ایما پر مرتب کیا، اس میں تصوف کے ان سلسلوں اور ان کے شجروں کا تفصیلی ذکر ہے جن میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو اجازت حاصل ہوئی تھی، اس کے ساتھ ہی حضرت مولانا نے اپنے تعلق والوں کے لیے جو ضروری نصیحتیں تحریر کی ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں، اس کتاب کے نئے ایڈیشن میں متوسلین کے لیے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کی رقم کردہ کچھ ہدایات ومشورے نیز اس سلسلہ میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے بعض قیمتی ملفوظات کو بھی شامل کیا گیا ہے، جدید اضافوں کے ساتھ ۳۲ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ سید احمد شہید اکیڈمی دار عرفات تکیہ کلاں رائے بریلی سے ۱۴۳۶ھ میں شائع ہوا۔

حیات عبدالباری:

یہ کتاب مولانا عبدالباری ندوی بارہ بنکوی (۱۸۸۸-۱۹۷۶ء) کی حیات وخدمات سے متعلق ہے، وہ ایک عظیم فلسفی، معلم، مصنف اور داعی تھے، انہوں نے فلسفے کو اسلامی رنگ میں پیش کیا کہ مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی (۱۸۶۶-

۱۹۲۶ء) کی زبان میں ''فلسفہ مولانا کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا۔''

(تجدید معاشرت: ۱/ ۱۹)

ان کے علمی ورثہ میں قرآن مجید کی تفسیر کے علاوہ کئی اہم کتابیں ہیں، جن میں مبادی علوم انسانی، برکلے کی سوانح اور اس کا فلسفہ، معجزات وعقلیات، معجزات انبیاء اور عقلیات جدیدہ، حدیقہ نفسیات، مذہب وسائنس، کاملیات سائنس، تجدید دین کامل، تجدید معاشیات، تجدید کاملیات بطور خاص قابل ذکر ہیں، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ ان کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''مولانا عبدالباری صاحب جو کہ علوم دینیہ کا صرف علم ہی نہیں حاصل کر چکے تھے، بلکہ انہوں نے ان میں تحقیق وتجدید کی صلاحیت بھی پیدا کرلی تھی، مغربی فلسفہ اور سائنس کا مہارت کے ساتھ مطالعہ کیا اور بہت کامیاب انداز میں اسلامی نظریہ کی برتری ثابت کی اور مذہب سے سائنس کے ٹکراؤ کے تصور کا ابطال کیا، جس کو دیکھ کر ممتاز اہل علم بھی متاثر ہوئے اور اسلام کے عطا کردہ حقائق کی صحت وبرتری کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے، مولانا عبدالباری نے اس سلسلہ میں کئی کتابیں تصنیف کیں، جنہوں نے موجودہ عہد کے پس منظر میں بھی بلند مقام حاصل کیا۔'' (مقدمہ حیات عبدالباری)

مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ نے اس کتاب میں مولانا عبدالباری ندوی کی سبق آموز سوانح حیات مرتب کی ہے اور ان کی دعوتی، تعلیمی، علمی وتصنیفی خدمات کا تعارف پیش کیا ہے، مولانا کی زندگی کا مختلف ناحیوں سے جائزہ لیتے ہوئے یہ کتاب علم وعمل کے کئی راز سربستہ سے پردہ اٹھاتی ہے، ضمنی طور پر کئی اہم دینی تحریکوں، جمعیۃ العلماء،

جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت، تحریک دعوۃ الحق پر گفتگو ہوگئی ہے، اسی طرح مختلف علمی وروحانی شخصیات: علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، ڈاکٹر رضی الدین، ڈاکٹر حمید اللہ (پیرس)، ڈاکٹر میر ولی الدین حیدر آباد کے احوال وکوائف کا بھی احاطہ کیا گیا ہے، اس طرح یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع ومانع ہونے کے ساتھ ساتھ گنجینہ علم ومعرفت بھی بن گئی ہے، بارہ ابواب اور ۳۸۴ صفحات پر مشتمل یہ تالیف مجلس صحافت ونشریات ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ۱۴۳۰ھ/ ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی، موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس کا عربی ترجمہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معزز ومحترم استاذ مولانا حفظ الرحمن ندویؒ (۱۹۵۵-۲۰۲۱ء) کے صاحبزادے مولانا عطاء الرحمن ندوی نے "الشیخ عبد الباری الندوی العالم الفلسفی الکبیر والداعیۃ المعلم الحکیم حیاتہ وآثارہ" کے عنوان سے کیا ہے، جس کی اشاعت "المجمع الاسلامی العلمی لکناؤ" سے ۱۴۳۷ھ/ ۲۰۱۵ء میں ہوئی۔

تذکرہ مولانا عبدالباری ندوی بھٹکلی:

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ نے اس کتاب میں مولانا عبد الباری ندوی بھٹکلی (۱۹۶۱-۲۰۱۶ء) کی حیات وخدمات کو پیش کیا ہے، مولانا کے تذکرے کے علاوہ قوم نوائط، بھٹکل اور اس کے اطراف کی خصوصیات نیز اس کے اصحاب فضل وکمال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، مزید برآں جامعہ اسلامیہ بھٹکل کے قیام، مولانا عبدالباری کی اس میں طالب علمی، ان کے اساتذہ ومعاصرین اور ممتاز رفقائے درس نیز اس زمانہ میں اس تعلیمی ادارے کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے، اس ضمن میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کا سفر بھٹکل اور وہاں ان کے خطاب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

مولانا عبد الباری بھٹکلی کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے دار العلوم ندوۃ العلماء میں ان کے داخلہ وطالب علمی اور اس دوران ندوہ میں پیش آنے والے اہم واقعات کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، بعد ازاں جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں ان کی تقرری اور بحیثیت استاذ ومربی ان کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے ساتھ ہی جامعہ اسلامیہ بھٹکل کے مہتمم کی حیثیت سے مولانا کی تعلیمی وانتظامی کاوشوں کو پیش کیا گیا ہے، نیز مولانا کی دینی ودعوتی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے، امامت وخطابت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے ساتھ وہ درس قرآن کریم کا بھی اہتمام کرتے تھے اور ۲۳ سال کی عمر میں ہی بھٹکل کی عظیم الشان جامع مسجد کے امام وخطیب مقرر ہو گئے تھے۔

(تذکرہ مولانا عبد الباری ندوی بھٹکلی: ۱۰۳)

بھٹکل اور اس کے اطراف میں درس قرآن کو مساجد اور دوسرے مقامات پر روز اور ہفتہ واری جو رواج ملا، اس میں مولانا عبد الباری ندوی کی خدمات اور ترغیب وتحریض نا قابل فراموش ہیں۔ (حوالہ سابقہ: ۱۰۷)

اسی طرح ارشاد وربانیت اور نسبت واجازت کے تعلق سے مولانا کے مقام ومرتبہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے اوصاف وخصوصیات، امتیازات وکمالات بیان کرتے ہوئے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں ان کی کوششوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے سفر آخرت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ان کی زندگی کے آخری لمحات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی اولاد واخلاف اور تلامذہ کا ذکر کیا گیا ہے، کتاب کے آخری حصہ میں مولانا کی وفات پر تعزیتی مکتوبات نیز مختلف اہل علم وادب کے تاثرات واحساسات کو پیش کیا گیا ہے، مولانا کے وصایا ونصائح کے ذکر کے ساتھ یہ کتاب اپنے پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے۔

یہ کتاب مولانا عبدالباری ندوی بھٹکلی کی زندگی کا مختلف پہلوؤں سے احاطہ کرتی ہے اور کئی گوشوں کو اجاگر کرتی ہے، مزید برآں اس میں صرف مولانا کی سوانح ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ اس میں مختلف مقامات، اداروں کی بڑی تفصیل بھی آ گئی ہے، تیرہ ابواب میں منقسم اور ۲۰۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۴۳۷ھ-۲۰۱۶ء میں مکتبۃ الشباب، شباب مارکیٹ، مکارم نگر، لکھنؤ سے شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوئی۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جونپوری:

مولانا محمد یونس جونپوری (۱۳۵۵-۱۴۳۸ھ/ ۱۹۳۷-۲۰۱۷ء) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے اجل تلامذہ میں سے تھے، اس کتاب کی ابتداء میں اس کے مصنف مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ نے مولانا جونپوریؒ کا ایک اجمالی سوانحی خاکہ پیش کیا ہے، پھر میراث نبوت کے تسلسل پر روشنی ڈالتے ہوئے سلسلہ ولی اللہی کے علماء کی دینی واصلاحی کوششوں کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے علمی و دینی مقام و مرتبہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد یونس جونپوری کے مسند حدیث پر رونق افروز ہونے اور ان کی محدثانہ شان و علمی رسوخ کو بیان کیا گیا ہے، بعد ازاں مولانا کے خاندان اور والدین کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے علاقہ کے علماء و مصلحین سے مولانا کے تلمذ و استفادے پر روشنی ڈالی گئی ہے، مولانا کے اساتذہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، حضرت مولانا شاہ محمد اسعد اللہ رامپوری، مولانا منظور احمد خان سہارنپوری، مولانا امیر احمد کاندھلوی، شیخ الحدیث مولانا سید فخر الدین مرادآبادی، فقیہ الامت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ، حضرت مولانا عبد الحلیم

جونپوری، فقیہ الاسلام مولانا مفتی مظفر حسین اجراڑویؒ کا قدرے تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے، نیز مولانا کے علم حدیث سے خاص شغف، درس وتدریس، تحقیق اور اجتہادی شان سے بحث کرتے ہوئے ان کے علمی کمالات، مسلکی ونظریاتی توسع اور علم کلام میں ان کی محدثانہ ترجیحات کا جائزہ لیا گیا ہے، حدیث شریف میں مولانا کی اجازت واسانید کا ذکر کرتے ہوئے مسند الہند حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی اور ولی اللہی سلسلہ اسناد پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس ضمن میں سہیل یمانی، شیخ حسین خزرجی اور امام شوکانی کی سند اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے اس کی اجازت، صاحب تحفۃ الاحوذی علامہ عبدالرحمن مبارک پوریؒ سے بالواسطہ اجازت، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ سے استفادہ واجازت کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔

مولانا جونپوری کے امتیازات وخصوصیات اور اخلاق ومحاسن نیز حدیث شریف کے ذریعہ اللہ تعالی کا قرب حاصل کرنے کی سعی، ارشاد وتربیت، جذبہ احسان، علمی وسعت وتبحر وغیرہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، ان کے معاصر شیوخ الحدیث میں سے مولانا ظہیر الدین اثر مبارک پوریؒ، مولانا سعید احمد پالن پوریؒ، مولانا ناصر علی ندویؒ سابق شیخ الحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء، مولانا سید محمد عاقل سہارنپوری، مولانا سلیم اللہ خان لوہاروی کے حالات زندگی اور ان کی علمی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اسی طرح مولانا کے دس ممتاز خلفاء کے حالات وخدمات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

علم حدیث میں مولانا جونپوری کے چند ممتاز اجازت یافتگان کا ذکر کیا ہے، جن میں سرفہرست مولانا محمد تقی عثمانی پاکستان، مفتی حرم شیخ عبداللہ بن احمد العرکی مکہ مکرمہ، شیخ احمد عاشور سبط آل سنبل مدینہ منورہ، شیخ فرید بن علی الباجی تیونس، شیخ محمد بن وائل

حنبلی استنبول ترکی، شیخ نظام الیعقوبی العباسی بحرین، شیخ خالد بن محمد بیضاوی حسنی مراکش، ڈاکٹر شیخ عادل حرازی ندوی، یمن/ دوحہ، قطر، شیخ علی بن احمد خلفاوی جزائر، ڈاکٹر مولانا محمد اکرم ندوی جونپوری آکسفورڈ، لندن وغیرہ شامل ہیں، کتاب کے آخری حصہ میں مولانا جونپوری کے احوال وآثار اور ملفوظات نیز ان کی مجالس اور مکتوبات کا ذکر کرنے کے بعد مؤلف نے چند ذاتی تجربات پیش کیے ہیں، موضوع کی مناسبت سے مظاہر علوم سہارنپور اور اس کے فضلاء سے متعلق مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری کا ایک مضمون شامل کتاب کیا گیا ہے، اختتام میں مؤلف نے مولانا جونپوریؒ کے تلامذہ کو بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

مولانا سید محمود حسنی ندویؒ مؤلف کی دیگر تصنیفات کی طرح اس کتاب کو پڑھتے وقت بھی قاری اپنے آپ کو ایک علمی اور روحانی ماحول میں محسوس کرتا ہے، نیز اسے لگتا ہے کہ وہ مولانا جونپوری کی مجالس میں شریک ہوکر ان سے کسب فیض کر رہا ہے، یقیناً یہ مؤلف کتاب کے اخلاص اور اس موضوع سے ان کی وارفتگی کا اثر ہے جس کو دوران مطالعہ قاری محسوس کرتا ہے، بیس ابواب اور ۵۸۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب سید احمد شہید اکیڈمی، دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی سے ۱۴۴۱ھ مطابق ۲۰۱۹ء میں شائع ہوئی، مولانا محمود حسنیؒ کی کتابوں میں اس کتاب کو اس لحاظ سے امتیاز حاصل ہے کہ اس کا ترجمہ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہوچکا ہے، اس کا عربی ترجمہ الشیخ المحدث محمد یونس الجونفوری - حیاته و خدماته مولانا عبدالرشید ندوی استاد دار العلوم ندوۃ العلماء کے قلم سے ہوا اور مؤسسة الحرم لاحیاء التراث الاسلامی عند العرب والعجم لکھنؤ سے ۱۴۴۱ھ/ ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا۔

فرشتہ صفت انسان:

یہ کتاب مولانا عبد الباری ندوی بارہ بنکویؒ کی تالیف ہے، اس پر مولانا محمود حسنی ندویؒ کا تحقیقی کام ہے، اس کتاب میں مصنف نے مولانا حکیم ڈاکٹر عبد العلی حسنی ندویؒ (۱۸۹۳-۱۹۶۱ء) سابق ناظم ندوۃ العلماء کی سوانح سپرد قلم کی ہے، جن سے مصنف کے بڑے گہرے روابط تھے، وہ مصنف کے ہم ساز وہمراہ اور ذاتی مشیر ومعالج بھی تھے، کتاب کی ابتدا میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں صاحب کتاب یوں رقم کرتے ہیں:

> ”مدت العمر کے قریب سے قریب تجربات پر مبنی ایک ایسی ملکوتی ذات کا ذکر کرنا مقصود ہے جس کی نسبت بلا مبالغہ اور بلا تشبیہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ”ان ھذا الا ملک کریم“ کے سوا اور کچھ کہا جائے۔ مراد حضرت مولانا ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی حسنی ناظم ندوۃ العلماء کی شخصیت ہے۔“
>
> (فرشتہ صفت انسان: ۴۸)

مصنف ان سے اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں: ”تعلق جس حد تک بڑھ چکا تھا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وہ نہ فیس لینے کا خیال کر سکتے اور نہ میں باوجود پوری وسعت اور جی چاہنے کے پیش کرنے کی ہمت کر سکتا۔“

(حوالہ سابقہ: ۵۰)

عرصہ تک مسودہ کی شکل میں رہنے کے بعد اس کتاب کی اشاعت مصنف مرحوم کے فرزندوں کی توجہ سے تعمیر حیات میں قسط وار ہوئی، بعد ازاں بعض جدید اضافوں اور مولانا محمود صاحب کی تحقیق وترتیب کے ساتھ اس کی اشاعت ۲۰۰۹ء میں مجلس

تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ہوئی، بقول حضرت الاستاذ مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ ”اضافوں نے رسالہ کی اہمیت اورافادیت میں بڑا اضافہ کردیا ہے اور یہ اہل علم ودعوت کے لیے، طلبہ واساتذہ اورعوام وخواص کے لیے یکساں طور پر مفید بلکہ گائڈ کی حیثیت رکھتا ہے، وہ اس مختصر رسالہ میں چار اہم شخصیتوں کے مراحل حیات اور صفات ومعاملات سے ایک نظر میں واقفیت حاصل کرسکتے ہیں، مولانا عبد الباری ندوی، ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمہم اللہ۔“ (حوالہ سابقہ:۱۸-۱۹)

تجدید معاشرت:

اس کتاب کے مؤلف مولانا عبد الباری ندویؒ ہیں، اس پر مولانا محمود حسنی کا تحقیقی کام ہے، یہ کتاب دو حصوں میں ہے: پہلے حصہ میں مصنف نے بتایا ہے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی (۱۸۶۳-۱۹۴۳ء) نے معاشرت کے سلسلہ میں کن بنیادی باتوں کی طرف توجہ دلائی اور کن تجدیدی کوششوں کی وضاحت کی اور اس سلسلہ میں خود ان کا کیا کردار تھا، یہ پہلا حصہ ۳۰۲ صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب کا دوسرا حصہ زندگی کے مختلف شعبوں میں حکیم الامت کی اصلاحی وتجدیدی تعلیمات پیش کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی دینی ودنیوی ہر طرح کی صلاح وفلاح پورا پورا مسلمان ہونے میں ہے، نیز دینی ومعاشرتی کوتاہیوں اور بیماریوں کی تشخیص اور کارگر تدبیریں بتائی گئی ہیں، یہ دوسرا حصہ ۳۵۲ صفحات پر مشتمل ہے، مولانا محمود حسنی کی تحقیق ومراجعت اور تعلیق وترتیب کے بعد اس کتاب کے دونوں حصوں کا پہلا ایڈیشن ۲۰۱۰ء میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ

العلماء لکھنؤ سے شائع ہوا۔

تذکرہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ:

حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) کے علمی، اصلاحی اور تجدیدی کارناموں کے اعتراف میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز نئی دہلی نے ان کے نام سے موسوم ایک ایوارڈ کا آغاز کیا، اس سلسلہ کا پہلا ایوارڈ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو دینا طے پایا، جس کو وصول کرنے کے لیے حضرت مولانا کے انتقال کے بعد ان کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کو مدعو کیا گیا، اس مناسبت سے ایک شاندار تقریب کا انعقاد کیا گیا، اس میں لوگوں کے اندر تقسیم کرنے کے لیے شاہ صاحب کے تعارف پر مشتمل ایک رسالہ کی ضرورت تھی۔
(تذکرہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی:۵)

اسی مقصد کے پیش نظر مولانا محمود صاحب نے حضرت مولانا کی کتاب تاریخ دعوت وعزیمت حصہ پنجم کی تلخیص مرتب کی، جس میں شاہ صاحب کے مختصر حالات زندگی، ان کے تجدیدی واصلاحی کارناموں نیز ان کی اولاد واخلاف اور تصنیفات وغیرہ کا تذکرہ بڑے جامع طریقہ پر آ گیا ہے، بعد ازاں ۶۴ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ مولانا علی میاں اکیڈمی، مدرسہ فلاح المسلمین تیندوا رائے بریلی سے ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔

تذکرہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی:

یہ کتاب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (۱۲۹۶-۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء)

سے متعلق تحریر کیے تھے، اس مجموعہ کو مولانا محمود صاحب نے حضرت مولانا کی مختلف تحریروں سے جمع کیا ہے، بقول حضرت مولانا بلال حسنی ندوی مدظلہ ''ان کی تحریروں میں جہاں کہیں بھی انہیں حضرت مدنی کا تذکرہ مل گیا، انہوں نے بڑے سلیقہ سے اس کو کتاب کا جز بنا دیا۔'' (تذکرہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی:۱۰)

اس کتاب میں مولانا مدنی کی جامعیت، علمی رسوخ، تعلیم وارشاد اور قائدانہ کردار پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے، ایک باب کو ان کے مجاہدانہ کارناموں کے لیے خاص کیا گیا ہے، جس میں ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے کردار کو اجاگر کرتے ہوئے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور ان کے شاگرد رشید مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی قربانیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز مختلف پہلوؤں سے مولانا مدنی کی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی مجددانہ عزیمت وبصیرت، مجاہدہ واستقامت، حق پسندی وخوردنوازی وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے، سات ابواب، ایک ضمیمہ اور ۱۶۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۴۳۷ھ/ ۲۰۱۶ء میں سید احمد شہید اکیڈمی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع ہوئی۔

ہدیہ درود وسلام:

یہ رسالہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مختلف اہل علم کے نذرانہ عقیدت کا مجموعہ ہے، شیخ الحدیث علامہ حبیب البشر خیری رنگونیؒ نے ایک مجموعہ درود وسلام مع فضائل واشعار مرتب کیا تھا، جس کی اشاعت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے مقدمہ کے ساتھ ''صل علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' کے عنوان سے ہوئی، مولانا محمود صاحب نے حضرت مولاناؒ کے مقدمہ اور علامہ رنگونیؒ کے مجموعہ میں سے ان کے جمع کردہ اربعین کو مع ترجمہ، اس کی اہمیت کے پیش نظر الگ سے شائع کرنے کا اہتمام

کیا، انہوں نے اس میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کا ایک قیمتی مضمون بعنوان ''روضہ اقدس پر حاضری کے آداب''، حضرت مولانا سید محمد عاقل سہارنپوری کا مضمون بعنوان صیغہ سلام، علامہ حکیم سید عبد الحی حسنی کا مضمون ''مختصر فضائل درود شریف''، حضرت مولانا کی والدہ محترمہ، ہمشیرہ محترمہ اور حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی کے منظوم کلاموں کو بھی شامل کرلیا، جس نے اس مجموعہ کی علمی وادبی حیثیت میں مزید اضافہ کیا اور اس کی اہمیت دو چند ہوگئی۔

مولانا محمود صاحب نے اپنی علالت کے آخری ایام میں اسے ترتیب دیا تھا، عجیب اتفاق ہے کہ ان کی وفات سے صرف چار دن پہلے ۱۰ محرم کو شوکت علی احاطے لکھنؤ میں حضرت مولانا بلال عبد الحی حسنی ندوی مدظلہ نے اس رسالہ کا اجرا کیا، اس کی اشاعت سید احمد شہید اکیڈمی دار عرفات تکیہ کلاں رائے بریلی سے اگست ۲۰۲۲ء یعنی عین مرتب کی وفات کے مہینہ میں ہوئی، ۷۲ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ ان کی علمی کاوشوں کی آخری کڑی ثابت ہوا، یوں اس پر علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کا یہ مصرعہ صادق ہوتا ہوا نظر آتا ہے:

خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سطور بالا میں مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی کی کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے، جس سے سیرت نگاری میں ان کی دلچسپی و مشغولیت اور اس موضوع میں ان کی مہارت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کے بیان اور صحابہ کرام کے حالات و کارناموں نیز مختلف علمی و دینی شخصیات کی سوانح نگاری میں انہوں نے ہزاروں صفحات سیاہ کیے، اس ضمن میں مختلف اہل علم کی سوانح، خاندانوں کی تاریخی حیثیت، متنوع دینی تحریکوں کے قیام کے پس منظر اور پھر ان کی تاسیس وارتقا کی پوری تاریخ کا بڑی حد تک احاطہ ہوگیا ہے، مولانا نے اپنی تصنیفات

میں حقائق و واقعات اور قدآور شخصیات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ دوران مطالعہ قاری ان کی تحریر سے نہ صرف متاثر ہوتا ہے، بلکہ اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ مختلف تاریخ ساز شخصیتوں کی زیارت اور ان سے استفادے میں مشغول ہے، نیز اس زمانہ کے حالات وحوادث کا مشاہدہ وہ اپنی آنکھوں سے کررہا ہے، بحث وتحقیق کی یہ خدمت مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی کا بڑا کارنامہ ہے، ان کی حیات وخدمات کا جائزہ لینے پر یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ وہ فکر وعمل میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے سچے جانشینوں میں سے تھے، سیرت وسوانح کے موضوع پر ان کی کتابوں تاریخ اصلاح وتربیت، سوانح حضرت مولانا ابرار الحق حقی، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جونپوری، تذکرہ حضرت مولانا زبیر الحسن کاندھلوی، تذکرہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حیات عبدالباری، تذکرہ مولانا عبدالباری ندوی بھٹکلی وغیرہ میں حضرت مولانا کی کتاب تاریخ دعوت وعزیمت کا رنگ نظر آتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ یہ کتابیں اسی تاریخ دعوت وعزیمت کے تکمیلی اجزاء ہیں۔

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی علیہ الرحمہ والرضوان اس دنیا کو چھوڑ کر دار بقا کوچ کر گئے، لیکن ان کی یادیں لمبے عرصہ تک لوگوں کے ذہن وقلب پر مرتسم رہیں گی اور ان کی تصنیفات سے استفادہ کیا جاتا رہے گا، دیگر اعمال صالحہ کے ساتھ ان کی یہ علمی کاوشیں بھی یقیناً سفر آخرت میں ان کے لیے زادراہ ثابت ہوں گی اور رب ذوالجلال کی بارگاہ میں باعث تقرب ہوں گی، ان کی وفات سے علمی دنیا میں عموماً اور ندوی برادری میں خصوصاً ایک خلا پیدا ہوگیا ہے، اللہ تعالی ان کی خدمات کو قبولیت سے نوازے، ان کی لغزشوں سے درگزر فرما کر ان کو جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے اور ملت اسلامیہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

بزرگی بعقل است نہ بسال

مولانا شاہ ارشد علی ندوی
(رفیق العافیہ ٹرسٹ، ندوہ روڈ، لکھنؤ)

۱۳ر محرم الحرام ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۲ر اگست ۲۰۲۲ء بروز جمعہ یہ خبر درد اثر کانوں سے ٹکرائی کہ بزم صحافت کے شہسوار، بحر علم و تحقیق کے شناور، خانوادۂ حسنی کی روایات و خصوصیات کے امین و پاسباں اور اس دور قحط الرجال میں زہد و تصوف کے علم بردار، درویش صفت انسان گرامی قدر مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی عالم فانی سے دار بقا کی طرف کوچ کر گئے۔ إنّا لله و إنّا إليه راجعون، تغمّده الله بر دائه الرحمة و المغفرة و أسكنه فسيح جناته النعيمة.

اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا، لیکن ان کی سادگی ان کے سارے کمالات پر حاوی تھی، یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ آپ دنیائے تحریر کے بے تاج بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطابت کے بھی مطلق العنان حکمراں تھے، خطابت کی وہ ساری خصوصیات جو ایک اچھے و کہنہ مشق مقرر میں موجود ہونی چاہئیں وہ آپ کے اندر بدرجۂ کمال پائی جاتی تھیں۔

اس کا مشاہدہ راقم الحروف کو اس وقت ہوا جب آج سے تقریباً چار پانچ سال قبل ملک کے طول وعرض میں اور خاص طور پر شہروں میں مسلم لڑکیوں کے ارتداد کی خبریں زوروں پر تھیں، اس وقت لکھنؤ میں میرے مربی ومحسن حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی ہدایت وارشاد کے موافق ''اسلام کی اہمیت وعظمت اور کفر کی قباحت وشناعت'' کے موضوع پر متعدد اصلاحی پروگرام ہوئے۔ اسی میں ایک اجلاس جامع مسجد لال باغ میں بھی ہوا، اس میں مولانا مولانا سید محمود صاحب بطور مہمانِ خصوصی مدعو تھے، آپ نے جب بیان کرنا شروع کیا تو اس جوش وجذبہ کے ساتھ خطاب کیا کہ سامعین پر سکتہ طاری ہو گیا اور وہ خاموشی کے ساتھ مولانا کی غیرت ایمانی اور حمیت دینی کا مشاہدہ کر رہے تھے اور اپنے دل کو نور اسلام سے منور کر رہے تھے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مولانا مرحوم سامعین کے دلوں سے کسی بھی قسم کے کفر کی طرف جھکاؤ اور مرعوبیت کو کھرچ کھرچ کر پھینک رہے ہیں اور ان کے قلوب کی اسلام کے صاف وشفاف پانی سے دھلائی کر رہے ہیں۔

جہاں تک بات ہے ان کی نوشتاری کی، تو میں اس کی گواہی دے سکتا ہوں کہ عصر حاضر میں ہندوستان میں مولانا محمود صاحب کے پایہ کا کوئی زودنویس شاید نہ ہو۔ ایک مرتبہ میں تکیہ کلاں رائے بریلی میں مولانا مرحوم کے ساتھ تھا اور مولانا کو کسی کتاب کا مقدمہ لکھنا تھا، پس مولانا نے لکھنا شروع کیا اور ایک ایک صفحہ لکھ کر کے مجھے دے رہے تھے کہ لو دیکھو، ابھی میں ایک صفحہ پڑھ نہیں پاتا تھا کہ دوسرا صفحہ لکھ کر مجھے تھما دیتے تھے، اس طرح چند منٹوں میں انھوں نے آٹھ دس صفحات لکھ ڈالے۔ اس وقت میں مولانا مرحوم کی زودنویسی پر دنگ رہ گیا اور بے ساختہ زباں سے ماشاءاللہ ماشاءاللہ جاری ہوا۔

اللہ رب العزت نے مولانا کو صحافت کا خاص ملکہ اور ذوق عطا کیا تھا، لہٰذا مولانا

جب کسی موضوع پر لکھتے تھے تو بس لکھتے چلے جاتے تھے، ویسے مولانا کا اصل موضوع تاریخ اور سیرت نگاری تھی، لیکن مولانا کی یہ زود نویسی صرف سیرت وسوانح کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، بلکہ مولانا کی اس زود نویسی کا عالم تقریباً ہر موضوع کے ساتھ تھا۔ اسی لیے مولانا مرحوم کی تحریریں سلاست وروانی کی ایک بہترین مثال ہوتی تھیں، قاری جب اسے پڑھتا تو بس پڑھتا چلا جاتا، اسے کہیں رکنے اور ٹھہرنے کی حاجت نہیں پیش آتی، اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ کسی ڈھال سے سراسر لڑھکتا ہوا نیچے کی طرف آرہا ہو۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مولانا مرحوم بہت بڑے صاحب قلم اور زود قلم تھے، انہوں نے بہت کم مدت میں اپنی دیگر مصروفیات اور اسفار کے باوجود ہزاروں صفحات سیاہ کیے۔

جب ۲۰۱۲ء میں پڑوسی ملک کے معروف متنازع عالم ڈاکٹر طاہر القادری کا ہندوستان دورہ ہوا اور یہاں کے بعض بڑے شہروں میں ان کے پروگرام ہوئے تو میرے مربی ومحسن حضرت مولانا عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ڈاکٹر طاہر القادری پر ایک کتابچہ لکھ ڈالو اور ان کے انحرافات سے باشندگان ہند کو واقف کراؤ۔

پس میں نے ایک رسالہ بنام ''ڈاکٹر طاہر القادری- حقیقت کے آئینہ میں'' تحریر کیا اور اس پر مقدمہ لکھنے کے لیے حضرت سے درخواست کی تو حضرت نے اپنی بیماری کی وجہ سے کچھ لکھنے سے معذرت کی اور فرمایا کہ محمود سے لکھوا لو، تو میں نے مولانا محمود صاحب سے عرض کیا، مولانا مرحوم نے میری عرض داشت بشاشت کے ساتھ قبول کی اور ایک شاندار مقدمہ سپرد قرطاس کیا، جس میں ضمناً انھوں نے انسان کی کامیابی وترقی کے لیے کسی بڑے کی رہ نمائی اور سرپرستی کو ضروری قرار دیا جو اس خودرائی، کبرونخوت کی دنیا میں ہم سب کے لیے سبق آموز ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''قرآن وحدیث کی تشریح کا حق غیر عالم کو نہیں ہے اور عالم کے لیے بھی

یہ ڈرنے کا مقام ہے کہ کہیں وہ تشریح میں آگے نہ نکل جائے اور اس کے جو حدود ہیں ان کو وہ پار نہ کر جائے، اس کا بڑا خطرہ رہتا ہے۔ اسی لیے دوسروں کے مقابلہ میں عالم کو زیادہ سر پرستی کی ضرورت پڑتی ہے۔
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر کون عالم ہوگا جن کو ”حبر الأمة، ترجمان القرآن“ کا خطاب ملا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی: ”اللّٰھم علمه الحکمة“ اور وہ دعا ان کے حق میں بکمال پوری ہوئی۔ لیکن انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو، ان کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو، ان کے بعد حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کو اور ان کے بعد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اپنا بڑا اور سر پرست سمجھا اور جب ان لوگوں نے ان سے مشورہ مانگا تو مشورہ دیا۔ ورنہ مشورہ لیتے رہے اور ان کی رہنمائی اور سر پرستی میں اپنا سفر حیات جاری رکھا اور یہی نہیں بعد میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ نواسہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاندانی طور پر اپنا بڑا سمجھا۔ حالانکہ عمر میں وہ حضرت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے بڑے تھے اور ان کے بعد یہی معاملہ حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نواسۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رکھا۔ مؤرخ یعقوبی نے یہ واقعہ بھی لکھا ہے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد امیر المومنین حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ اب تو بنو ہاشم کے آپ سردار ہو گئے۔ فرمایا: نہیں! حسین رضی اللہ عنہ موجود ہیں۔
یہی تواضع ہے جو انسان کو رفعت پر پہنچاتی ہے اور پھسلنے سے بچاتی ہے اور

جولوگ ملت کی ناخدائی کے لیے کھڑے ہوئے اوراپنے کودینی پیشوا کے طور پرپیش کر کے امت کی رہبری کرنے لگے اوراپنے کوسرپرستی کا محتاج نہیں سمجھا، ان سے پھرایسی ایسی غلطیاں ہوئیں کہ جن سے ہادی ورہبر ہونے کے بجائے گمراہ کرنے والے ہوئے اورخودبھی گمراہ ہوئے۔‘‘

حب صحابہ واہل بیت کی دولت سے بھی آپ مالامال تھے اورحضرات شیخین رضی اللہ عنہما سے آپ کوغایت درجہ محبت تھی۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کوشبہ ہوکہ چونکہ آپ کا تعلق اہل بیت سے ہے، اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف آپ کا جھکاؤ زیادہ ہو،لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی، راقم اس بات کا گواہ اور مشاہد ہے کہ آپ اس سلسلہ میں مکمل اہل سنت والجماعت کے عقائد پر قائم ودائم تھے۔

تحریک سیداحمد شہید رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کا گہرا تعلق تھا اورتحریک کی ہر بات اور حضرت سید صاحبؒ کے واقعات گویا آپ کے زبان زد تھے۔

آپ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی پرایک جامع، مفصل اور مستند سوانح حیات لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، کاش کہ وہ اس دیرینہ خواہش کو عملی جامہ پہنا پاتے توامت ہندیہ پراُس مردمجاہد کا احسان کسی قدرادا ہو پاتا۔

بہرکیف مولانا محمود صاحب نے بہت کم عرصہ میں وہ کارنامے انجام دیئے جس کے لیے سات آٹھ دہائیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

درویش شیرازنے کیاخوب کہاہے ؎

توںگری بدل است نہ بمال
بزرگی بعقل است نہ بسال

گوہرآب دار

مولانا عبدالہادی ندوی

مولانا محمود حسن حسنی ندوی رائے بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (۲۲/ جولائی ۱۹۷۱ء-۱۲/اگست ۲۰۲۲ء) سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، وہ حسنی خانوادہ کے ان چشم و چراغ میں سے تھے جنہیں اپنے دوش ناتواں پر امت اسلامیہ کی خدمات کا بارگراں لے کر ایک طویل سفر کرنا تھا، علمی و اصلاحی مجلسوں اور خدمات کا تسلسل ابھی باقی تھا، ندوۃ العلماء لکھنؤ میں نسلوں کی تربیت و تزکیہ اور تدریس کا مقدس فریضہ بھی لیے چلنا تھا، امت کی زبوں حالی، بدعات و خرافات کی طرف میلان میں شمع بن کر اجالا کرنا تھا، تحریر و تقریر اور اصلاحی خطابات سے امت مسلمہ کے قلوب کو مزکی و مصفی کرنا تھا، مگر کون جیتا تیرے زلف کے سر ہونے تک۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ مرشد الامۃ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کی رفاقت و معیت حاصل تھی، آپ مختلف دوروں اور پروگراموں میں مرشد الامۃ کے دست و بازو بنے ہوئے تھے، علمی کاموں اور روابط میں ایک کڑی کا کام کر رہے تھے، غالباً ۲۰۱۸ء کی بات ہے، حضرت مولانا کا وفد موسم سرما میں جنوب ہند کی جانب

مدارس کے دورے پر نکلا تھا، آپ کے ہم راہ استاد محترم حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ حضرت مولانا محمود حسنی ندوی بھی تھے، اس وفد کا ایک پڑاؤ جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور کرناٹک بھی تھا، وہاں مولانا سے بہت اچھی ملاقات رہی اور آپ سے مل کر ایسا قطعاً احساس نہ ہوتا تھا کہ آپ کا ایک عظیم خانوادہ سے تعلق رکھنا اور ان کی مصروفیات ملنے والوں کے لیے کوئی رکاوٹ ہیں، مرنجان مرنج طبیعت، سادگی کی مورت، مسکراتا چہرہ، تواضع وانکساری اور خاکساری میں بے مثال، جس کو عبدیت سے تعبیر کرنا چاہیے، مولانا کی عبدیت نکھری ہوئی، نمایاں اور عام تھی، عام طلباء واساتذہ سے یوں ملاقات کرتے کہ وہ ان کے دوست، رفیق اور ہم دم ہوں، جامعہ میں وفد کا پروگرام جاری تھا، مگر یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ پروگرام ہی میں بیٹھیں بلکہ مسلسل سفر کی تکان اور اکابرین کے ساتھ تکلف کا یہ عالم تھا کہ وہ شہ نشین پر نہیں بیٹھتے تھے، کہیں خموش اور گمنام ہوجاتے تھے، ایسا لگتا تھا کہ وہ خود کو چھپا رہے ہیں، عام نظروں سے بچا رہے ہیں، اس دوران وہ جامعہ کے اساتذہ کے درمیان بھی ہو لیتے تھے، اساتذہ کے کاموں کی نوعیت اور ان کے کدوکاوش کے متعلق معلومات لیتے، ان کو خوب حوصلے سے نوازتے اور مزید کام کرنے کی رغبت دلاتے تھے۔

آپ مفکر اسلام سیدی حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ (برادر اکبر مرشد الامۃ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ) کے نواسے تھے، مولانا میں صلاحیت وصالحیت دونوں موجود تھی، حسنی شرافت ولیاقت نے چار چاند لگا دیے تھے، متعدد ذمہ داریوں اور مشغولیتوں کے باوجود ان پر کوئی تنگی وتلخی اور ترشی کا شائبہ نہ ہوتا تھا، وہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں استاد، مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی میں استاد اور دار عرفات کے موقر رکن، کئی رسالے ان کی

نگرانی میں شائع ہوتے، کئی کتابوں کے مصنف ومؤلف تھے، بڑوں کے ساتھ ایک عام طالب علم نظر آتے تھے، چھوٹوں کے درمیان مربی اور دوست ہوتے تھے، وہ جہاں بھی جاتے ان سے محبت وعقیدت رکھنے والے افراد انہیں حصار میں لے لیتے، وہ اپنے ساتھ چلنے والے کا ہاتھ تھام لیتے، بات کرنے والے کی طرف پوری طرح توجہ دیتے اور اپنائیت کا احساس کرواتے تھے، میں نے ان سے ملاقات میں کبھی اجنبیت نہ پائی، بلکہ ایک اپنائیت کا احساس پایا، مولانا کا راقم پر ایک احسان عظیم ہے، جو آج ان کی وفات پر بے ساختہ قلم وزبان پر جاری ہے، واقعہ یہ ہے کہ راقم کی پہلی کتاب (تعمیر انسانیت اور قرآن) کا مسودہ بس یوں بیگ میں پڑا ہوا تھا، مجھے اپنی بے بضاعتی، کم مائیگی اور کم علمی کا پورا احساس تھا، چنانچہ اسے طباعت کے لیے بھیجنا یا کسی علمی شخصیت کے سامنے پیش کرنا مناسب نہ لگتا تھا، مگر دل میں یہ بات آئی کہ دیکھتے ہیں اگر مرشد الامۃ نے اس پر کچھ لکھ دیا تو ضرور طباعت کے مراحل میں بھیج دیں گے، مولانا مرحوم سے بات کی اور انہیں مسودہ دکھایا، مولانا نے اس عام مسودے کی بڑی قدر دانی فرمائی، بڑا حوصلہ دیا اور مزید لکھنے کی دعا دیتے ہوئے عرض کیا کہ اس پر ضرور لکھ کر دیں گے، مولانا کی کوشش شامل حال رہی اور بڑی توجہ وعنایتوں کے بعد مسودے پر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کی رائے حاصل کر لی، یہ نیک فال ثابت ہوا، کتاب کی طباعت ہوئی اور علمی کاموں کا سلسلہ چل پڑا، اس سلسلہ میں جس قدر مولانا کے لیے دعائیں کروں کم ہے، سبھی جانتے ہیں کہ ابتدائی مراحل میں کوئی ساتھ نہیں دیتا، جب درخت ثمر آور ہو جائے تو ہر کوئی اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے، لیکن وہ جب زمین کی کوکھ میں جد وجہد کر رہا ہو تو کوئی اس کی طرف نگاہ نہیں ڈالتا، سوائے اس کے جو باغ باں ہو، بیج کی اہمیت جانتا ہو اور انسانیت

کے لیے ثمر آور درخت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہو، آج مولانا اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے، دل غمگین ہے، مولانا کا چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، ان کی رحمت و شفقت اور مودت یاد آتی ہے۔ اللہ تو سب سے بڑا رحیم ہے، وہ اپنے اس بندے کو ضائع نہ کرے گا، وہ یقیناً انہیں اپنی رحمتوں میں جگہ دے گا اور آخرت کی منزلیں آسان کردے گا۔ آمین ثم آمین یارب العالمین!

خانوادۂ حسنی کے بدر منیر

مولانا منہاج الدین ندوی
(استاد مدرسہ مظہر الاسلام، بلوچپورہ۔لکھنؤ)

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

ایک ایمان والے کا یہ ایمان ہے کہ کائنات کی ساری چیزوں کی طرح موت وزندگی بھی اللہ رب العزت کی پیدا کی ہوئی ہیں اور اللہ نے یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم فرما رکھی ہیں، چنانچہ جہاں زندگی ہے وہیں موت ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو اس اصول سے مستثنیٰ فرما رکھا ہے، ”کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام“ کہنے کو تو سبھی آئے ہیں جانے کے لیے، لیکن کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو جاتے جاتے ایسے داغ مفارقت دے جاتی ہیں، جو عرصہ دراز تک مندمل نہیں ہوتے، رہ رہ کر ٹیس پہنچاتے ہیں، کبھی ان کے اخلاق عالیہ یاد آتے ہیں، کبھی ان کی صاف وستھری شبیہ، کبھی ان کا مسکراتا چہرہ، کبھی ان کے ذکر بالجہر کا انداز، تو کبھی ملاقات کا نرالا طریقہ کار!

اس گلستان رنگ و بو میں قادر مطلق نے جہاں ایک طرف مسرت وشادمانی کے بے شمار اسباب رکھے ہیں، وہیں رنج وغم میں مبتلا کرنے کے ذرائع بھی رکھے ہیں، کچھ اسی طرح کے حالات میں مبتلا نظر آئے جب کہ ۱۲؍اگست بروز جمعہ صبح کے وقت جیسے ہی اپنا موبائل دیکھا تو واٹس ایپ پر ایک جانکاہ میسج دیکھا کہ مولانا محمود حسنی صاحب بھی داغ مفارقت دے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، اللھم اغفرلہ وارحمہ وأسکنہ فی الجنۃ الفردوس!

یہ اطلاع ملنے کے ساتھ ہی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، پیروں تلے کی زمین نکل گئی، سوچنے لگا یا اللہ! یہ کیا ہو گیا کہ خاندان نبوت کے چراغ یکے بعد دیگرے بجھتے چلے جارہے ہیں، امتِ مرحومہ کے لیے یہ کچھ اچھا شگون نہیں کہہ سکتے کہ امت کے اچھے لوگ تیزی کے ساتھ یکے بعد دیگرے روانہ ہو جائیں، اپنی دینی وعلمی تحریکات وعملی مشاغل اپنے ساتھ لے جائیں، ان کے بغیر امت اخلاقی نمونوں سے محروم ہو جائے، یہ حالات امت کے لیے یتیمی ویسیری کے حالات سے کچھ کم نہیں۔

محمود بھائی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، بڑے ہی ملنسار، با اخلاق، سخی، متواضع، مخلص، عبادت گذار، مطالعہ کے شوقین، ایسے کہ ہاتھ میں بس کتاب آجائے تو مالہ وماعلیہ سے جب تک واقف نہ ہو جاتے کتاب رکھتے نہ تھے، ملنساری ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جب تک ملاقاتی خود سے ہاتھ نہ چھڑائے مصافحہ سے خود ہاتھ نہ چھڑاتے تھے اور اس درمیان ساری خیر وعافیت مع متعلقین کے پوچھ ڈالتے تھے۔

اگر مرحوم کے گھر پہنچ جائیے تو ماشاء اللہ اچھی خاصی خاطر داری ہو جائے، تکلف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اصرار کے ساتھ ماحضر تناول کرواتے، مسکراتے ہوئے

استقبال کرتے، مسکراتے ہی ہوئے رخصت کرتے، مرحوم کبھی مدرسہ مظہر الاسلام آتے تو زیادہ وقت کتب بینی ہی میں صرف کرتے تھے، وقت ضائع کرنے کے بالکل قائل نہ تھے، ۲۰۱۳ء اور ۲۰۱۴ء کی بات ہے رمضان المبارک میں رائے بریلی حاضری ہوئی، شب گذاری کا موقع ملا تو مرحوم کو ذکر بالجہر میں مشغول دیکھ کر اسلاف کے واقعات یاد آ گئے، کس طرح بزرگان دین کے یہاں ذکر بالجہر کا اہتمام کرایا جاتا ہوگا، جس سے نفس کی بالکل دھلائی ہو جاتی ہوگی، غیر اللہ کا خیال نکل کر اللہ وحدہ لا شریک لہ کا خیال جاگزیں ہو جاتا ہوگا، یقیناً محمود بھائی اسلاف کی ایک یادگار تھے۔

اسی زمانہ کی بات ہے کہ مولانا مرحوم رمضان المبارک میں تقریباً تین برس تک چھ روزہ تکمیل قرآن کے موقع پر عیدگاہ آتے رہے تھے اور اپنی دل دوز و دل سوز دعا سے سما باندھ دیتے تھے، دعا کیا ہوتی تھی پوری تقریر ہوتی تھی، رمضان و روزوں کے فضائل، قرآن و تراویح کے فضائل اور نہ جانے کن کن چیزوں کے فضائل پر مرحوم کی دعا مشتمل ہوتی تھی۔

گاہے بگاہے مولانا مرحوم کو لکھنؤ کے تبلیغی مرکز کچہری روڈ پر بھی مدعو کیا جاتا تھا، مولانا کا بیان ایسا ہوتا تھا جیسے کوئی تبلیغی کام میں انتہائی منجھا ہوا، سالہا سال لگائے ہوئے اکابرین کا صحبت یافتہ، انتہائی تجربہ کار عالم ہو، جو بیک وقت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا انعام الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگیوں پر اور ان کے اعمال و اقوال پر گہری نظر رکھتا ہو۔

مولانا مرحوم دوران تقریر اپنی بات کی دلیل کے طور پر مذکورہ بزرگوں کے اقوال برجستہ نقل فرماتے تھے، جس سے مولانا کے کثرتِ مطالعہ کا بھی اندازہ ہوتا تھا نیز ان کے تعلق کا بھی۔

مولانا مرحوم کے بھائی مولانا منصور حسنی صاحب أطال اللہ عمرہ جو کہ ایک مدت تک مدرسہ مظہر الاسلام میں تدریس کی خدمت انجام دے چکے ہیں، اپنے بڑے بھائی کے نقش قدم پر ہیں، مولانا مرحوم کی کچھ باتیں انہی سے پتہ چل جاتی تھیں۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے نیز اہل تعلق کو صبر جمیل عطا فرمائے۔آمین!

حادثہ دل دوز ہے مغموم قلب ناتواں

نتیجہ فکر: سید ابوالحسن علی حسنی

حادثہ دل دوز ہے مغموم قلب ناتواں
اب سوائے صبر کے کوئی سہارا ہے کہاں

جن کے تھے اخلاق اعلیٰ ہر بڑے چھوٹے کے ساتھ
ان کی رحلت باعث رنج و ملالِ عاشقاں

دعوت دین خدا تھا عین مقصد آپ کا
دل میں فکر آخرت اور ذکر باری برزباں

داعیان دین احمد سے تعلق خاص تھا
ان کی تصنیفات وتالیفات سے ہے یہ عیاں

اپنے شاگردوں کے حق میں مخلص و مصلح رہے
تھے بڑے محبوب اور مقبول ان کے درمیاں

زہد اور للّٰہیت گویا تھا شیوہ آپ کا
ہر عمل میں ابتغاء وجہ رب دو جہاں

لمحہ لمحہ ان پہ رحمت ہو خدائے پاک کی
مغفرت فرمائے ان کی خالق کون و مکاں

جنتوں کی نعمتوں سے دم بدم سرشار ہوں
ایسی جنت ہو عطا ہے عرش جس کا سائباں

ہمارے بھائی صاحب
اپنی خصوصیات کے آئینے میں

مولانا مسعود حسن حسنی ندوی
(استاد دار العلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ)

مولانا سید محمود حسن حسنی اس دار فانی سے رخصت ہو گئے، اس بات کو لکھتے ہوئے دل کی کیفیت کا جو حال ہے وہ رب ذو الجلال ہی جانتے ہیں، یہ ایک ایسی شخصیت تھی جس کی زندگی میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کی تربیت میں ۹۵ء کے بعد عظیم الشان تبدیلی پیدا ہو چکی تھی، اس سے پہلے بچپن ہی سے وہ چونکہ بڑوں سے وابستہ رہے، نیکی وشرافت کی آبیاری کا کام چل رہا تھا، حضرت مولانا کی بہن عائشہ بی سے وہ وابستہ رہے، چونکہ عائشہ بی کی تربیت میں ہماری والدہ رہیں، جس کی وجہ سے محمود حسنی بھی ان سے وابستہ رہے اور انہوں نے اپنے سارے نخرے عائشہ بی سے پورے کروائے، محمود بھیا کو اللہ رب العزت نے ایسا سلیم الفطرت انسان بنایا تھا کہ وہ بڑوں کی چیزوں کو، ان کے مزاج کو فوراً سمجھ جاتے تھے، غفلت

نام کی چیز ان کے اندر نہیں تھی، غفلت کو وہ گناہ سے تعبیر کرتے تھے، اکثر وہ ہم سے کہتے تھے کہ غفلت سے بچو، غفلت گناہ ہے۔

دوسری اہم بات ان میں یہ تھی کہ وہ فوراً فیصلہ کرتے تھے، فیصلہ کرنے میں اختلاج کا شکار نہیں ہوتے تھے اور اس کو بھی وہ دین کا اہم جز سمجھتے تھے، جو بھی کام کرتے نہایت انہماک کے ساتھ اس میں مشغول ہوجاتے اور جب تک مکمل نہ ہوجاتا کرتے رہتے، مجلس تحقیقات کے جناب کلام بھائی کا کہنا ہے کہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کی کتاب ''یادوں کے چراغ'' کے سلسلہ میں رات کے تین تین بجے تک وہ کام کرتے رہتے تھے، پھر کہتے کہ اب جا کر نماز پڑھ کر آرام کریں گے، ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی تھا، ہر عمل میں رضائے الٰہی کی نیت رہتی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے بارے میں کہنے لگے کہ وہ ایک ایک عمل سے ۱۰/۱۰ عمل کا ثواب حاصل کرتے تھے، تم بھی نیت کرلیا کرو اور اپنے بارے میں کہا کہ ہم بھی نیت کرلیتے ہیں، کسی طالب علم کے ساتھ کوئی سلوک کرتے تو کہتے کہ یہ صدقہ جاریہ آگے چل کر بنے گا اور ہر زمانے میں ایک طالب علم کو خاص کر کے مکمل طور پر اس کی تربیت کرنا چاہیے، تاکہ وہ صدقہ جاریہ بن سکے اور کوئی دیارِ غیر سے آتا تو اس کے ساتھ خوب سلوک کرتے، اچھا معاملہ کرتے، اپنی جیب اس کے لیے خالی کردیتے اور حتی الامکان جو مدد ہوسکتی وہ کرتے، اپنی استعداد سے زیادہ کرتے، اس کے لیے ہلکان تک ہوجاتے اور ہم سے کہنے لگے کہ مکہ کے مہاجرین مدینہ گئے، وہاں انصار نے ان کا کیسا تعاون کیا، ہم لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ دیارِ غیر کے لوگوں کے ساتھ انصار مدینہ والا معاملہ کریں، ورنہ ہم گناہگار ہوں گے۔

صحابہ کرام کے معاملہ میں بڑے ہی حساس تھے، کسی لومۃ لائم کی پرواہ کیے بغیر

شمشیر برہنہ بن جاتے تھے، اس سلسلہ میں ہلکی نرمی کے قائل بھی وہ نہیں تھے۔

ایک زمانہ تھا کہ زہد واستغناء وتقشّف کا ایسا غلبہ رہا کہ سخت سے سخت رویہ بھی اختیار کیا، لیکن آہستہ آہستہ اس میں تبدیلی ہوئی اور کچھ نرمی آئی اور جیسے لوگوں کے حالات انہوں نے دیکھے اور مادی ضرورتوں کو تسلیم کیا اور عین سنت کے مطابق ان کا نظریہ ہوگیا۔

دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی فکر ان پر ایسی طاری رہتی تھی کہ وہ خاندان کے ہر فرد کو صلاح وتقویٰ، اخلاص وللّٰہیت کا پیکر دیکھنا چاہتے تھے، اس کے لیے ہر وقت کچھ نہ کچھ نصیحتیں کرتے رہتے تھے، کہتے تھے کہ دنیا میں بار بار انسان نہیں بھیجا جائے گا، لہٰذا کوئی نہ کوئی ایسا کام کرو جو صدقہ جاریہ بن سکے، یہ زندگی ایک بار کی ہے، بار بار کی نہیں۔

ان کا ایک عمل قربانی کا تھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ایک قربانی ہر سال ضرور کراتے تھے اور یہ عمل وفات تک جاری رہا، اس کے بارے میں انہوں نے ہم سے کہا کہ میاں (مولانا ثانی حسنی ندویؒ) نے ایک بکرا خریدا اور ہم کو اور تم کو چھری پکڑوا کر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے قربانی کروائی، محمود حسنی کا کہنا تھا کہ میاں نے یہ عمل اس لیے کروایا تاکہ یہ عمل بڑے ہوکر ہم لوگ کریں اور محمود حسنیؒ کا آخری عمر تک یہ عمل جاری رہا۔

ان کے ہر عمل میں دوام تھا، ذکر، تہجد، نوافل کی پابندی کرتے رہے اور ہم کو مسلسل ذکر پر ابھارتے، بزرگوں کے پاس جانے کی تلقین کرتے، کوئی بزرگ، بڑا عالم تشریف لاتا تو سب بچوں کو ان سے ملواتے، مولانا حمزہ حسنی کے انتقال کے بعد کہا کہ ماموں جان ذکر (پاس انفاس) کے بڑے ماہر تھے، اب تم بلال ماموں کے

پاس جاکراس کوسیکھو۔

مال دار، منصب دار کی ان کو کوئی پرواہ نہیں تھی، غلط بات دیکھ کر بڑے سے بڑے آدمی کو بری طرح ڈانٹتے اور معمولی سے معمولی کے بلانے پر اس کے یہاں چلے جاتے، ذرا سا بھی اس بات کا احساس ہوجاتا کہ فلاں آدمی مالدار ہے اور اپنے مال کا رعب جمانا چاہتا ہے،تو اس کی پرواہ نہ کرتے اور اس کو سخت نکیر اس کے عمل پر کرتے، ایک واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ عین الحسن کو اپنی بیٹیوں کی بسم اللہ کروانی تھی، اسی وقت کوئی وزیر آئے، ان کا سکریٹری آیا، اتفاق سے محمود صاحب ملے، ان سے کہا :منسٹر آئے ہیں۔انہوں نے اس کو روکے رکھا اور پہلے بسم اللہ کروائی اور پھر اس سے کہا کہ رعب وغیرہ نہ جھاڑا کرو اور سخت ڈانٹا، ان کو نہ منسٹرز کی پرواہ تھی، نہ آفیسران کی، ہاں اگر کوئی اللہ والا آجاتا تو پورے خاندان کو اس سے ملواتے اور اس کے سامنے بچھے رہتے، تعلق ان کا صرف اللہ کے لیے ہوتا تھا، دنیا کی کوئی غرض ان کے سامنے نہیں ہوتی تھی، بلکہ ہر وقت دوسروں کی مدد کی فکر میں رہتے تھے۔

انتقال سے ایک مہینے پہلے انہوں نے ایک کتاب جو مجموعہ استغفار تھی اس کا ترجمہ کروایا، ترجمہ میں ''رضی اللہ عنہ'' پورا نہیں لکھا ہوا تھا، بلکہ ''رض'' بطور علامت تھا، اس پر وہ بہت ناراض ہوئے اور کہا پورا ''رضی اللہ عنہ'' لکھا کرو اور پھر پورا ترجمہ دیکھا اور اس کو درست کیا اور کہا کہ ایک اچھی چیز سے شروعات ہوگئی ہے اور ہر جمعرات کو مرکز جانے کی تاکید کی، ان کے سامنے صرف دین تھا، دینی مزاج ومذاق کے خوگر تھے، بزرگوں سے وابستہ رہنے کی نصیحت کرتے تھے، جس بات کو صحیح سمجھ لیتے اس کی بکثرت دلیلیں ان کے ذہن میں آنا شروع ہوجاتی تھیں اور پھر اس میں کسی کی بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور پوری شدت کے ساتھ اس مسئلہ کو اختیار کرتے تھے اور ادنیٰ

نرمی اس میں برداشت نہ تھی، ان پر دینی جذباتی وہ کیفیت طاری رہتی تھی جو ان کو اضطراری کیفیت میں مبتلا رکھتی تھی، کوئی معمولی چیز اگر ان کو محسوس ہوتا کہ کہیں اس پر خدا کی پکڑ نہ آجائے سخت ناراضگی کا باعث بن جاتی تھی اور خدا تعالیٰ کے غصہ سے بچانے کے لیے سخت غصہ ہوکر اس کی طرف توجہ دلاتے تھے اور توبہ واستغفار پر ابھارتے تھے۔

جو چیز جس وقت ان کے ذہن میں بیٹھ جاتی کہ یہ دین ہے، پوری توجہ اس کی طرف مبذول کر لیتے، کسی کے ساتھ حسن سلوک ہو، مہمان نوازی کا معاملہ ہو، بزرگوں سے ملاقات کا معاملہ ہو، یا کسی طالب علم کی دل بستگی ہو، پوری دل جمعی کے ساتھ رضائے الٰہی کے لیے اس کو دین سمجھ کر ایک فریضہ کی طرح نبھاتے اور دوسروں کو بھی اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے پر ابھارتے۔

کوئی کام، کوئی تصنیف نفس کی خواہش کی بنیاد پر وہ نہیں کرتے تھے، بلکہ جب ان کو اس کے لکھنے کا جذبہ پیدا ہوتا، تب اس پر قلم اٹھاتے۔

ان کی شخصیت متقدمین کی شخصیت کا آئینہ دار تھی، ابھی ایک واقعہ تونس کی پارلیمنٹ میں یہ ہوا کہ وہاں ایک قانون آزادی کے نام پر پاس ہونے جارہا تھا، جس میں ہر فرد کو یہ آزادی دی جارہی تھی کہ جس ذات کو بھی چاہیں نشانہ بنائیں، ایک شخص کھڑے ہوگئے اور انہوں نے اس قانون کی سخت مخالفت کی کہ یہ قانون اللہ رب العزت کی شان میں گستاخی کا باعث بن سکتا ہے اور اس کی مخالفت کی اور اللہ رب العزت کی محبت میں سرشار انہوں نے کہا کہ ہماری گردن کاٹ دی جائے، ہمارے جسم کو چھلنی کر دیا جائے، تب جا کر یہ قانون پاس ہوسکتا ہے، ان کے اس جذبہ کو دیکھ کر اس شخص کی غیرت ایمانی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اگر یہی غیرت ایمانی آج ہر مسلمان

کے اندر پیدا ہوجائے تو دنیا کی کوئی طاقت اسلام اور مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتی، محمود حسنیؒ کے یہاں اسی غیرت ایمانی اور جذبہ ایمانی کا مشاہدہ بار بار کیا، دینی غیرت وحمیت ایمانی اور اللہ رب العزت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اولیاء اللہ رحمہم اللہ کی محبت کے نمونے محمود حسنی کی زندگی میں ایک بار نہیں دسیوں بار بلکہ بار بار نظر آتے رہے، یہ ایسا اللہ کا بندہ تھا جس پر نہ کسی کا علم کا رعب تھا، نہ امیروں کی سیرت وسطوت کا اثر دکھتا تھا، ان پر جذبات کا ایک سیل رواں طاری ہوتا تھا اور حق کی سربلندی کے لیے بڑے سے بڑے سورماؤں کو بہالے جاتا تھا، ہاں اپنے بڑوں اور والد اور والدہ کے بھائی بہنوں اور دوستوں کے معاملہ میں وہ حدیث نبوی ”افضل الاعمال بر الوالدین“ کی بناء پر خاموشی اختیار کر لیتے تھے، لیکن دین پر آنچ آنے کی صورت میں کبھی بھی ان کی پرواہ نہیں کرتے تھے، ہر کام میں ان کے سامنے قرآن وحدیث کا نمونہ رہتا تھا، قرآنی آیات کا استحضار ایسا تھا کہ بارہا اپنی بات کو قرآنی آیات سے مزین کرتے ہوئے پایا، کوئی بھی گفتگو کرتے تو دلیل کی بنیاد پر کرتے، اللہ رب العزت نے ان کے اندر ایسے جوہر پیدا کر دیئے تھے جو مقبول بندوں میں اللہ کی جانب سے ودیعت کیے جاتے ہیں، کبھی انہوں نے اپنی پرواہ نہیں کی، ڈاکٹر نے ان کی نبض دیکھی تو ان سے کہا آپ اپنے لیے نہیں جیے ہیں، آپ تو دوسروں کے لیے جیے ہیں، اپنی فکر کیجیے، آپ کے جسم کا آپ پر حق ہے، ایک وید نے نبض دیکھ کر کہا کہ یہ شخص اللہ کے عشق میں مبتلا ہے، اس کو آپ لوگ پہچان نہیں پا رہے ہیں اور حقیقت یہی تھی کہ مراقبہ موت ومراقبہ قبر نے ان کی صحت کو متاثر کر دیا تھا کہ ان کے ذہن ودماغ میں دنیا کی بے ثباتی ایسی بیٹھی کہ وہ اس سے نکل نہیں پائے اور دنیا کو اپنے دل ودماغ سے ایسا نکالا کہ ہر وقت آخرت کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ دین ان پر

ایسا غالب تھا کہ دینی احوال کی فکر نے ان کو بے چین کر رکھا تھا، ہر معاملہ دین کی بنیاد پر وہ کرتے تھے، ایک نہیں سیکڑوں اس کی مثالیں دماغ میں گھوم جاتی ہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی تربیت کی وجہ سے سرکاری تعلیم ونوکری سے حد درجہ دوری تھی، سب کا ان پر پی ایچ ڈی کرنے کا دباؤ رہا، لیکن کسی طرح بھی انہوں نے پی ایچ ڈی میں داخلہ نہیں لیا، ایک مسجد کے بنانے کے لیے ایک صاحب سے کہا تو انہوں نے یہ کہا کہ فلاں فلاں ہمارے بڑے ہیں، ان سے مشورہ کرلیں تو ناراض ہوگئے کہ مسجد بنانا خیر کا باعث ہے، اس میں کسی سے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔

گھر کی ایک بچی نے پانی کی بوتل کو پیر سے کنارے کر دیا، سخت ناراض ہوئے کہ پانی رزق ہے، اس کا احترام ضروری ہے، پیر لگانا گناہ ہے، ایک مرتبہ ہم نے اپنے کسی بچہ کے چہرہ پر چانٹا رسید کیا تو سخت ناراض ہوئے کہ چہرہ پر مارنے سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع کیا ہے، یہ گناہ کبیرہ ہے، توبہ واستغفار کرو۔

کسی کے ساتھ سلوک کرتے تو اس کا ذکر بھی نہیں کرتے، اس کا کیسا بھی معاملہ ہوتا، احسان نہ جتلاتے اور احسان اگر کوئی جتلاتا تو قرآن کریم کی آیت کا حوالہ دے کر احسان جتلانے کو منع کرتے اور کہتے کہ احسان کر کے بھول جانا چاہیے، تا کہ اللہ رب العزت راضی ہوں، اس لیے کہ کسی کے ساتھ بھی اچھا معاملہ اللہ رب العزت کی رضا اور خوشنودی کے لیے ہونا چاہیے۔

۱۲/ ربیع الاول کے جلوس کے بارے میں کہنے لگے کہ لکھنؤ میں چونکہ صحابہ کرام کو بانگ دہل تبرا بکا جاتا ہے تو بانگ دہل ہی ان کی مدح کرنا واجب ہے اور اس سلسلہ میں حضرت عبد اللہ بن مبارک کے قول کو پیش کرتے تھے کہ ان کا یہی کہنا ہے۔

کہتے تھے اس وقت حضرت مولانا رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کو اللہ تعالیٰ نے مقبولیت ومحبوبیت عطا کی ہے، وہ کسی کو نہیں ملی اور اللہ رب العزت کے یہاں ان کو بڑا مقام حاصل ہے، ان کو اللہ تعالیٰ نے بڑا بنایا جو ان سے برائی رکھے گا، وہ اللہ تعالیٰ سے گویا لڑنے والا ہے، ان کو جو کچھ حاصل ہوا وہ خالص اللہ رب العزت کی عطا ہے، جس کو اس پر اعتراض ہے، گویا اس کو اللہ رب العزت کی تقسیم پر اعتراض ہے، عجیب بات ہے کہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی جن کو اللہ تعالیٰ نے ایسی محبوبیت سے نوازا کہ لوگوں میں یہ مثل مشہور ہو چکی ہے کہ ان سے محبت مومن ہی کر سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان سے وابستہ ہونے میں بھلائی رکھ دی ہے، مولانا محمود حسنی ان سے وابستہ کیا ہوئے، ان کے قلم میں سیلاب جیسی جولانی آ گئی، مولانا محمود حسنی کی جتنی تحریریں آئیں اور ان میں جو قوت پیدا ہوئی اور لوگوں کے دلوں میں ان کے قلم کی روانی نے جو اثر ڈالا وہ سب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کے مکمل طور پر اپنے آپ کو حوالہ کرنے کے بعد ہوا، یہ برکت تھی ایک اللہ والے کی صحبت کی، جس کے بارے میں اپنے وقت کے والی حضرت مولانا ثانی حسنیؒ نے کہا تھا کہ ہمارا یہ بھائی اللہ کا ولی ہے اور ہماری نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ اللہ رب العزت نے اس کو ہر فتنہ کے لیے سد سکندری بنا کے رکھا ہوا ہے، یہ وہ شخص ہیں جن کی زبان ہر گناہ سے محفوظ ہے او رجن کا دل سخت سے سخت دشمن کے کینہ سے پاک ہے، ان صفات کے حامل فرد کے لیے جنت کی بشارت ہے، اسلام پر کسی چیز سے آنچ آئے یہ اس کے لیے سد سکندری بن جاتے ہیں، اسی لیے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اکیسویں صدی کی تاریخ لکھنے والے یہ ضرور لکھیں گے کہ اکیسویں صدی کے مجدد آپ ہیں، حضرت مولانا پر جوش مقرر نہیں ہیں، لیکن ان کا صاف وشفاف آئینہ جیسا دل لوگوں کے دلوں کی انگیٹھیوں کو گرم

کرنے کا کام کرتا ہے، حضرت مولانا کی شخصیت کا اثر دلوں پر ایسا پڑتا ہے کہ زندگیاں بدل جاتی ہیں، حضرت رائے پوری کا نقش گویا وہ لیے ہوئے ہیں، حضرت رائے پوری مقرر نہیں تھے، لیکن ان کا صرف یہ کہنا کہ کیا اللہ کا نام کافی نہیں، دلوں کو تڑپا دیتا تھا، یہی چیز اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو عطا کی ہے، ان کا صرف دیکھنا اور مختصر نصیحت کرنا دلوں کو بدل کر رکھ دیتا ہے، ہاں بعض لوگ جو ان کو اس نظر سے نہیں دیکھتے ان کے لیے نقصان کا باعث بن جاتا ہے، کیوں کہ اللہ کے نیک بندے سے محبت رکھنا ہی فائدہ کا باعث اور ان سے بغض نقصان کا باعث بنتا ہے۔

مولانا بلال حسنی ندوی کے ساتھ رہنے پر یہ جواب دیا کہ حضرت مولانا نے ابتداء میں یہ کہا تھا کہ بلال کے ساتھ رہو، اس کی وجہ سے صرف دو سال بڑے ہونے کے باوجود ان کا بڑا پاس ولحاظ رکھتے تھے اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے، ہماری بہن شامہ حسنی نے جب حفظ کیا تو اس کا اس نسبت سے بڑا خیال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم لوگ حفظ نہیں کر سکے، یہ ہم سب کی طرف سے کفارہ ہے والدین کے لیے۔

گھر والوں کے حقوق کو حتی الامکان کامل طور پر ادا کرنا چاہتے تھے، اس سلسلہ میں جو واجبی امور تھے ان میں کبھی کوتاہی نہیں برتی، ہاں استحبابی امور میں الاول فالاول کے اصول پر کاربند تھے، نفقہ کی ادائیگی میں کوتاہی کے روادار نہیں تھے، اسی طرح مہر کی ادائیگی کے سلسلہ میں انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں برتی۔

اپنی اہلیہ کو حج پر لے جانے کی نہ صرف یہ کہ فکر کی بلکہ گھر کی وہ عورتیں جنہوں نے حج نہیں کیا تھا، ان کے شوہروں کو اس پر آمادہ کیا کہ اس سفر میں وہ بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ ہوں اور پھر ایک قافلہ حضرت مولانا عبد اللہ حسنی ندویؒ کی قیادت میں حج کے لیے روانہ ہوا۔

وہ کہتے تھے کہ ہمارے بھی بیوی بچے ہیں، کیا ہمیں خواہش نہیں ہوتی کہ میں زیادہ وقت ان کے ساتھ گزاروں، لیکن میں دینی جذبہ کی بنا پر ان کو وقت نہیں دے پاتا، اس کا اجر آخرت میں انشاء اللہ ملے گا۔

اپنی بیٹی (سیدہ حمیرہ حسنی) جو برادرم یونس حسینی کو منسوب ہیں، اس کی تعلیم پر خاص توجہ دی اور قرآن کریم خود پڑھایا، ان سے بے پناہ محبت تھی، کبھی بھی ان کو نہیں ڈانٹا، وہ بچیوں کو نہ ڈانٹنے کے قائل تھے، نہ مارنے کے، ان کو تاکید کی تھی کہ دنیا کی محبت اپنے دل میں پیدا نہ ہونے دینا، جب ان کے برادر نسبتی جناب سید معاذ حسینی ان کو عمرہ پر لے کر گئے تو بہت خوش ہوئے، اپنے نواسوں کی بڑی فکر تھی، گذشتہ سال ان کے نواسے نے کٹولی کی مسجد میں ضد کر کے نماز پڑھائی تو بہت خوش ہوئے اور اس کا تذکرہ متعدد مجلسوں میں کیا، دین ان پر غالب تھا، دین کی چھاپ جس میں نظر آتی، اس سے خوش ہوتے اور اس کا تذکرہ مجلسوں میں کرتے، تاکہ یہ چھاپ دوسروں میں منتقل ہوجائے اور پورا معاشرہ دین سے وابستہ ہوجائے، جب بھی گھر آتے گھر کے بچوں کے لیے خاص کر اپنے نواسوں کے لیے چاکلیٹ وغیرہ ضرور لاتے، ان کے نواسے عمر سلمہ، زید سلمہ اور نواسی سہلہ سلمہا ان سے بہت مانوس تھے، ابا ابا کرتے ہوئے ان کے پاس آتے اور ان سے لپٹ جاتے، محمود بھائی کو ان سے غذا افراہم ہوتی تھی اور دل خوش ہوتا تھا، ہم سے کہنے لگے کہ تمہارے بھی نواسے ہیں، عجیب بات ہے کہ انتقال سے چند دن پہلے انہوں نے یہ بات فون پر ہم سے کہی، ہم کو بھی تعجب ہوا کہ یہ بات پہلے کبھی نہیں کہی، اچانک کیوں کہہ رہے ہیں، یہ خاندانی محبت کو ابھارنے کے مقصد سے تھا۔

چھوٹوں کے ساتھ نہایت شفقت و محبت کا معاملہ کرتے تھے اور اگر وہ بیمار ہوں تو

ان کے علاج ومعالجہ کی برابر فکر میں لگے رہتے تھے، ذراسی بھی تکلیف کسی کی دیکھتے تو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی فکر کرتے، اس میں غفلت کو برداشت نہیں کرتے تھے۔

منصور حسنی ندوی ان کے ساتھ وجے واڑہ گئے تو ڈاکٹر نے ان کے بارے میں کچھ باتیں کہیں تو بار بار ان کو علاج کی تاکید کرتے اور کوتاہی نہ کرنے کو کہتے۔

ان کی نواسی کے پیر کا آپریشن کا مسئلہ تھا تو چنڈی گڑھ میں جناب انوار بھائی سے ڈاکٹر سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اصرار کیا، وہیں ہمارے کمر میں تکلیف دیکھی تو انوار بھائی سے کہا ان کو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھایئے۔

ہماری بہن عائشہ کے داماد بیمار ہوئے تو علی کو باغپت بھجوانے کی فکر کی اور یہ مشورہ دیا کہ چنڈی گڑھ میں بڑا اچھا علاج ہوتا ہے، ان کو یہیں لے آؤ، ماموں جان (مولانا حمزہ حسنی) جب بیمار ہوئے تو بار بار یہ بات کہتے کہ ان کا کسی اچھی جگہ علاج کراؤ اور اس کے لیے جو بھی خرچ ہو اس کا انتظام کیا جائے گا، ہماری والدہ جب بیمار ہوئی تھیں اور مرض کی تشخیص صحیح سے نہیں ہو پا رہی تھی تو مسلسل الگ الگ ڈاکٹروں سے رابطہ کرتے رہے۔ والد صاحب کے علاج میں بھی جلد سے جلد دہلی جانے کو کہتے اور جب دہلی علاج کے لیے والد صاحب گئے تو مسلسل ساتھ رہے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کی طبیعت جب بھی خراب ہوتی تو وہ پورے انہماک کے ساتھ علاج کی فکر میں لگ جاتے، اس کے علاوہ دسیوں ایسی مثالیں ہیں جس میں ان کا ذہن فوری طور پر صحیح امور کی طرف مائل ہو جاتا تھا۔ کسی کے انتقال کے موقع پر وہ فوراً گھر کے لڑکوں کو اس کے پاس بھیج کر قرآن کریم پڑھنے اور ذکر واذکار میں مشغول کر دیا کرتے تھے، اس کے علاوہ ان کا علم میں جو انہماک تھا وہ متقدمین کے ہاں تو ملتا ہے، لیکن اب یہ چیز نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے، جب کسی بھی مضمون کے لیے بیٹھتے

تو جب تک وہ مکمل نہ ہو جاتا اس کی ترتیب وتنسیق وتعلیق میں لگے رہتے، یہاں تک کہ اس کی تکمیل ہو جاتی۔ اسی طرح کسی کی سوانح کا معاملہ ہوتا تو اس کے متعلقین سے فون کے ذریعہ معلومات حاصل کرتے اور اس کے سلسلہ کے جو مراجع ملتے ان سے استفادہ کرتے اور بہت ہی منظم شکل میں اس کو ترتیب دیتے، اس معاملہ میں اللہ رب العزت نے ان کو جو ملکہ عطا کیا تھا وہ شاید ہی کسی کو ملا ہو۔

اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی تاریخ اصلاح وتربیت ہے، جو آنے والی نسلوں کو اسلام سے جوڑنے کا کام کرنے کے ساتھ گذشتہ ماضی سے ہمیں جوڑ کر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا کردار ادا کرے گی، یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کو ہر شخص کے لیے پڑھنا ضروری ہے۔

ایک طالب علم نے ابھی ایک سال پہلے ان سے کہا کہ ندوہ کے نظام کو آپ درست کرنے کی فکر کریں تو انہوں نے کہا کہ میری عمر ۴۰ سال سے اوپر ہوگئی ہے، اب ہم آخرت کی فکر کریں کہ ندوہ کا نظام وغیرہ دیکھیں، جہاں تک محمود حسنی کے خاندان کا تعلق ہے تو وہ نجیب الطرفین سادات کے خاندان سے تھے، خیر کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے، لیکن دوسروں کو اس میں شریک کرتے، تاکہ اس کے لیے بھی ذخیرہ آخرت بن سکے، ”الدال علی الخیر کفاعلہ“ کا مصداق تھے، نام ونمود کا بالکل شوق نہیں تھا، کتنے ایسے واقعات ہیں جس میں وہ اپنے فعل کی نسبت دوسرے کی طرف کر دیتے تھے، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہمارے پاس آئے، ہم کو پچاس ہزار روپئے دیئے اور کہا سکری صاحب نے ہم کو دیئے ہیں تم اپنی اور اپنے بہن بھائیوں کی طرف سے تکیہ کی مسجد کے قرض کی ادائیگی میں دے دو، کچھ ہم لوگوں کی بھی ذمہ داری ہے۔

زکوۃ کی ادائیگی کی بڑی فکر رہتی تھی، چاہتے تھے کہ زکوۃ کا ایک ایک پیسہ حساب کر کے نکالا جائے اور لوگوں کو بھی اسی پر آمادہ کرتے تھے۔

وراثت کے معاملہ میں بہت سخت تھے، کہتے تھے کہ وراثت کی آیات صریح طور پر قرآن کریم میں موجود ہیں، سب کے حصے بتادیئے گئے ہیں، اب اگر کوئی اس پر عمل نہیں کرے گا تو قرآن کریم کی ان آیات کا منکر ہوگا اور قرآن کریم کی آیات کا انکار کفر کی طرف انسان کو لے جاتا ہے۔

دین کو نقصان پہنچانے کا تصور تک ذہن میں نہیں تھا، جس کے بارے میں معلوم ہوجاتا کہ یہ دین کو نقصان پہنچانے کا مرتکب ہے، اس کے سلسلہ میں نرم رویہ بھی برداشت نہیں تھا، سخت سے سخت اس کے بارے میں کلمات کہتے، اگر وہ مل جاتا تو اسکو سختی کے ساتھ نصیحت کرتے اور دین کے خلاف عمل سے باز رہنے کی تلقین کرتے۔

رب العالمین نے ان کا مزاج ہی ایسا بنادیا تھا جو برائی کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا، غلطی ہوجاتی تو فوراً رجوع الی اللہ ہوتے، اگر کسی کو ان کے کسی عمل سے تکلیف پہنچتی تو اس سے معافی کے طلب گار ہوتے اور اپنے فعل پر ندامت ہوتی، گناہ سے بچتے، حتی کہ صغیرہ گناہ کے قریب بھی نہ جاتے تھے، کہتے تھے صغیرہ گناہ کے اصرار سے آدمی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

جماعت اور تہجد کی پابندی پر اصرار تھا، خود بھی کرتے اور دوسروں کو بھی آمادہ کرتے، دین میں عزیمت کو اختیار کرتے، لیکن عام لوگوں کے لیے رخصت کو پسند کرتے۔

کہنے لگے کہ ہم لوگوں نے حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کو دیکھا کہ وہ عزیمت پر عمل کرتے تھے، لیکن عزیمت پر عمل کرنا آسان نہیں ہے، آج کل کے دور میں رخصت ہی قرین قیاس ہے، اس لیے کہ اب قویٰ کمزور ہیں، عزیمت کی صورت

میں دین سے آدمی دور ہوسکتا ہے۔

اپنے اساتذہ کے بارے میں کہتے کہ ان کی عزت کرنے سے ہی انسان بلند ہوتا ہے اور اساتذہ کو بھولنا نہیں چاہیے، چاہے استاذ مکتب کا ہو یا بخاری شریف کا، ایک موقع پر فرمایا: مجھے مولانا برہان صاحب کی یہ دعا بہت پسند آئی ''اللھم کن لنا و لمن علینا'' میں بھی اس کا اہتمام کرتا ہوں اور اپنے والدین اور اساتذہ کی نیت کرلیتا ہوں اور عمومی طور پر ان تمام کی نیت کرلیتا ہوں جن کا مجھ پر احسان ہے۔

درس وتدریس کے اصول کے بارے میں کہتے کہ جب کوئی کتاب ملے تو جس استاذ نے پڑھائی ہے اس کے پاس جاؤ اور اس سے دعا کے لیے کہو اور اپنا واقعہ بیان کیا کہ جب مجھ کو ترمذی شریف پڑھانے کے لیے ملی تو میں نے جناب مولانا زکریا صاحب سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے مجھے یہ نصیحت کی تھی اور اس کا بہت فائدہ ہوا۔

فرماتے تھے کہ مطالعہ خوب کیا کرو، اس سے ذہن کے دریچے کھلتے ہیں، اپنے بارے میں ایک شخص سے کہا کہ ہم نے سیر اعلام النبلاء ۱۷؍ بار پڑھی ہے۔

ان کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ جب کہیں سفر کرتے تو اس علاقہ میں اگر کوئی ان کا تعلق والا یا خاندان کے کسی بھی فرد کا تعلق والا ہوتا تو اس سے ملاقات کرتے اور اگر خاندان کے افراد میں سے کوئی ہوتا تو اس کے گھر تشریف لے جاتے اور یہ چیز ان کے اندر حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی مصاحبت کی وجہ سے آئی تھی، کیوں کہ حضرت مولانا کا یہ معمول تھا، یہ خوبی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی اور مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ کے ہاں بھی نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔

اپنے پرانے ساتھیوں اور دوستوں کا بہت خیال کرتے تھے اور ان کی تعمیر وترقی کے لیے جو ان سے بن سکتا وہ کرتے تھے، کیوں کہ وہ کہتے تھے کہ ساتھی کا بھی حق

ہوتا ہے، ان کے ساتھی بچپن ہی سے ان کے صلاح وتقویٰ کے قائل تھے، ان کے ساتھی جناب شاہد جمال صاحب جو اس وقت سکریٹری کے عہدہ پر فائز ہیں اور (آئی اے ایس) ہیں، ان کا کہنا ہے کہ محمود بچپن ہی سے نیک تھے، ہمارا ان کا ساتھ پنجم مکتب سے تھا، محمود بھائی بھی شاہد بھائی سے بڑی محبت کرتے تھے، ان کا ذکر بڑے اچھے انداز میں کرتے رہتے تھے، اس کے علاوہ جناب مولانا جمشید بھائی سے بھی بہت تعلق تھا، بیماری کے آخری ایام میں جناب مولانا جمشید بھائی کا فون آیا، بہت لمبی گفتگو رہی، انہوں نے بہت سی باتیں کیں جو بیماری سے متعلق تھیں، ان کی باتوں سے وہ مطمئن ہوئے، جمشید بھائی اس وقت بمبئی یونیورسٹی میں (HOD) ہیں۔

ان کو انگریزی علاج سے بالکل مناسبت نہیں تھی، بیماری جب شروع ہوئی تو انہوں نے ہومیوپیتھک ڈاکٹر سے رجوع کرنا مناسب سمجھا، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کے خلیفہ جناب وسیم صاحب نے وجے واڑہ جانے کا مشورہ دیا اور حضرت مولانا مدظلہ العالی سے اس کی اجازت لی، وہاں جناب سکری صاحب جن کو حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی سے عشق کی حد تک تعلق ہے اور ان کے فرزند شکیب بھائی اور بلال بھائی کا اسی مناسبت سے بے پناہ تعلق ہے، ان کے یہاں قیام رہا، ان حضرات نے گھر سے زیادہ نہ صرف یہ کے آرام پہنچایا، بلکہ ہر وقت ساتھ رہتے اور آرام پہنچانے کی فکر میں لگے رہے، ان کے پرہیزی کھانے کے لیے الگ سے باورچی رکھا اور اپنے خاص مہمان خانے میں ان کے لیے انتظام کیا اور نہایت ہی محبت اور خندہ پیشانی کے ساتھ ہر طرح سے آرام پہنچانے کی فکر کی، وہاں مرض میں افاقہ ہوا، پندرہ دن کے قیام کے بعد واپس لکھنؤ آئے، لیکن درمیان میں ایک دو دن کے لیے بھٹکل تشریف لے گئے، وہاں ایک پروگرام میں خطاب کیا، بھٹکل

والوں کا کہنا ہے کہ یہ خطاب الہامی تھا، پھر براہ بمبئ واپس آئے، بمبئ ایر پورٹ پر بہت چلنا ہوا جس کی وجہ سے طبیعت میں بوجھل پن آ گیا تھا۔

لکھنؤ آ کر حکیم فروخ شہاب کا علاج ہومیوپیتھی علاج کے ساتھ چلتا رہا، لیکن کریٹنائن میں کمی واقع نہیں ہوئی، پھر دوبارہ وجے واڑہ جانے کی رائے ہوئی، وہاں پہنچ کر علاج شروع ہوا، ایک ہفتہ کے علاج سے کریٹنائن ۷ سے ۵ پر آ گیا، طبیعت میں بہتری آ گئی، پھر اچانک حیدر آباد جانے کا ارادہ ہوا، وہاں کچھ بے احتیاطی کی وجہ سے مرض پھر پلٹ آیا، وہاں جناب مولانا نثار صاحب ندوی، جناب مولانا فصیح الدین صاحب ندوی اور جناب مولانا قطب الدین صاحب ندوی نے بڑا خیال رکھا اور جناب انجینئر عبدالرشید صاحب مسلسل اپنے گھر رات کے کھانے پر بلاتے رہے او ربڑی محبت سے پیش آتے، اللہ تعالیٰ تمام حضرات کی محبتوں کو قبول فرمائے اور بہترین اجر سارے متعلقین کو عطا فرمائے، پھر وجے واڑہ واپسی ہوئی، وہاں کچھ دن علاج چلا، پھر طبیعت میں اچانک لکھنؤ آنے کا خیال پیدا ہوا، برادرم احسان اللہ ساتھ تھے، ان کے ساتھ لکھنؤ آئے، یہاں انگریزی کے ماہر امراض گردہ ڈاکٹر روی الہنس جوڈی ایم ہیں کے علاج کی تجویز ہوئی، انہوں نے نسخہ تجویز کیا، اس سے کچھ افاقہ ہوا پھر آیورویدعلاج کے لیے چنڈی گڑھ میں hims ہاسپٹل کی تجویز آئی، وہاں سے رابطہ میں جناب شاہد جمال صاحب کا زبردست تعاون رہا اور آسانی کے ساتھ وہاں ایڈمٹ ہو گئے اور اسپتال کے عملہ نے جناب شاہد جمال صاحب کی وجہ سے خاص معاملہ کیا، ایک ہفتہ کے علاج سے افاقہ ہوا، اس دوران جناب انوار الحق صاحب نے جو معاملہ کیا وہ بھلایا نہیں جاسکتا، انہوں نے اور ان کی اہلیہ (جنت جہاں صاحبہ) نے کھانے، رہنے کی جو انتظامات کیے وہ ناقابل بیان، محمود بھائی کی رائے وہاں سے

واپسی اور ایک ڈیڑھ مہینے تکیہ شاہ علم اللہ میں قیام کرنے کی ہوئی، کیوں کہ عید میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا، اس لیے دو چار دن لکھنؤ رک کر پھر تکیہ آ گئے، آیورویدعلاج چلتا رہا اور ورم غائب ہو گیا، لیکن پھر اچانک ورم آنے لگا۔

بقرہ عید میں دوبارہ چنڈی گڑھ جانے کا ارادہ ہوا، ایک وید جو انوار الحق صاحب کے جاننے والے ہیں اور چنڈی گڑھ کے مشہور وید تھے، ان کو دکھایا، مرض چونکہ اب بہت بڑھ چکا تھا، ان کی دواؤں سے کریٹنائن بڑھنا رک گیا، لیکن تمام ڈاکٹروں کے مشورہ سے ڈایلسس کی تجویز ہوئی اور رائے یہ ہوئی کہ لکھنؤ ہی میں ڈایلسس ہو، جس کی وجہ سے سنیچر کی صبح چنڈی گڑھ سے لکھنؤ آئے، میٹرو سٹی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوئے، ڈایلسس شروع ہوا، ڈاکٹر جو پہلے بہت گھبرائے ہوئے تھے، مطمئن ہو گئے، ایک ہفتہ تک طبیعت میں بہتری کے آثار رہے، پھر جمعہ کا دن گزار کر رات میں طبیعت میں گراوٹ آئی، وینٹی لیٹر لگایا گیا، جس سے طبیعت میں بہتری آئی، پھر وینٹی لیٹر نکال دیا گیا، لیکن جمعہ کی صبح اچانک دل کا دورہ پڑا اور اس طرح لقاء رب کا متمنی اور ہر وقت ”کن لنا و اجعلنا لک“ کی صدا لگانے والا اور اس صدا کی لوگوں کو تلقین کرنے والا اور آخرت کی تیاری میں کمر کسنے والا یہ اللہ کا بندہ اپنے مالک حقیقی سے ملنے کے لیے فرشتہ اجل کے ذریعہ آخرت کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا، اللہ رب العزت ان کی بال بال مغفرت فرمائے، ان کے حسنات کو قبول فرمائے اور ان کے سیئات کو حسنات سے مبدل فرمائے۔ آمین!

محمود بھائی - چند یادیں، چند باتیں

سید محمد مکی حسنی ندوی
(رفیق دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی)

مولانا محمود حسن حسنی ندوی جنہیں ہم خاندانی رشتہ کی وجہ سے ''محمود بھائی'' کہتے تھے، ایک طویل بیماری کے دور سے گذر کر انتقال کر گئے، محمود بھائی ہمارے خاندان میں اپنے اسلاف کی روایات کے پاس دار تھے، اپنے خانوادہ کی تاریخ کے حافظ تھے اور سیرت وسوانح سے دلچسپی رکھنے میں ایک درِّ نایاب تھے، ان کی وفات پوری علمی دنیا کے لیے عظیم حادثہ ہے، بالخصوص ہمارے خاندان کے لیے ان کا سانحہ ارتحال ایک بہت بڑا خلا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

محمود بھائی بہت باغ وبہار اور مرنجا مرنج طبیعت کے مالک تھے، ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ وہ بیک وقت کئی کردار کے حامل تھے، فرائض کی پابندی، اوراد ووظائف کا اہتمام، ذکر سری وجہری سے اشتغال، مطالعہ میں مصروف، تصنیف وتالیف میں منہمک، بزرگان دین سے روابط، بڑوں کی خدمت، چھوٹوں کی نگہ داشت، مہمانوں کا اکرام اور رشتہ داروں سے صلہ رحمی ان کی زندگی کے وہ جلی

عناوین ہیں جن کا اعتراف ہر خاص و عام کو ہے۔

محمود بھائی کی تربیت ایک خالص دینی و علمی ماحول میں ہوئی تھی، ابا جان (مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ) کی توجہات اور شفقتیں انہیں ہمہ وقت حاصل تھیں، دنیا بھر کی جو علمی و روحانی شخصیات ابا جان سے ملنے آتیں، محمود بھائی اپنی خاندانی نسبتوں کے ذریعہ ان سب کے منظورِ نظر بن جاتے اور ہر ایک کو ان سے بڑا گہرا تعلق ہو جاتا، محمود بھائی بھی اس تعلق اور ان عظیم شخصیات کے الطاف و عنایات کو اپنے لیے شرف کی بات سمجھتے تھے۔

چچا میاں (حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی) کی نیک صحبت محمود بھائی کے لیے ایک بیش بہا نعمت تھی، جس کی انہیں آخری وقت تک قدر رہی اور انہوں نے اس نعمت سے خوب فائدہ اٹھایا، چچا میاں کے تمام ہند و بیرون ہند کے اسفار میں محمود بھائی ہمیشہ ساتھ رہتے، اگر آپ ندوہ میں قیام فرما ہوتے تو محمود بھائی بھی ساتھ ہی رہتے، یہاں تک کہ لکھنؤ میں اپنے گھر خاتون منزل بھی نہ جاتے اور اگر چلے جاتے تو فوراً ہی واپس آ جاتے، محمود بھائی تکیہ میں بھی اتنے ہی دن رہتے جتنے دن چچا میاں تشریف فرما ہوتے، اگر خدانخواستہ کسی تقاضے کی بنا پر محمود بھائی تنہا تکیہ آ جاتے تو تقاضا پورا ہوتے ہی یہاں کا قیام ان کے لیے دشوار ہو جاتا۔ چچا میاں کے تصنیفی و تالیفی کاموں سے بھی محمود بھائی کو بڑا شغف تھا، ان کی صحبت کا محمود بھائی پر ایسا غیر معمولی اثر ہوا تھا کہ وہ ان کی زبان و بیان سے بخوبی واقف ہو گئے تھے، یہی وجہ ہے کہ محمود بھائی ان کے دستِ راست اور سب سے اہم علمی معاون تھے۔

محمود بھائی کے دادا سید مسلم حسنیؒ بڑے متدین اور ذی علم آدمی تھے اور میری دادی کے سگے خالہ زاد بھائی تھے، گرچہ یہ رشتہ دور کا تھا، مگر محمود بھائی کو اس رشتہ کا بڑا

لحاظ تھا، وہ مجھ سے جب بھی ملتے تو بڑی خندہ جبینی کے ساتھ پیش آتے، اگر کبھی گھر کے اندر ملاقات کا اتفاق ہوتا یا تکیہ کی مسجد میں ایک ساتھ بیٹھنے کا موقع ملتا یا وہ دار عرفات آجاتے، تو بڑی محبت سے خاندان کی آپسی قرابتوں کا ذکر فرماتے، جس کے ضمن میں بہت سی تاریخی معلومات بھی نکل کر سامنے آجاتی تھیں اور حیرت ہوتی تھی کہ محمود بھائی کو ہمارے خاندان کی تاریخ کس قدر ازبر ہے، خاندانی شجرہ، خاندانی افراد کی آپسی رشتہ داریاں، خاندانی بزرگوں کی قبریں، خاندانی بزرگوں کی سن پیدائش اور سن وفات' یہ سب تاریخی معلومات ان کو ایسی حفظ تھیں کہ اگر بولتے تو اپنے حافظہ کی بنا پر گھنٹوں بولتے چلے جاتے اور اگر لکھتے تو صفحات کے صفحات سیاہ کرتے چلے جاتے، مگر اس سلسلہ میں کسی دستاویز یا کتاب سے مراجعت کی ضرورت پیش نہ آتی۔

لکھنا پڑھنا ہی محمود بھائی کا اوڑھنا بچھونا تھا، ان کا یہ ذوق ان پر ایسا حاوی تھا کہ وہ ہر چیز سے لاتعلق تھے، عام طور پر جب آدمی ملتا ہے اور بالخصوص گھر کے کسی فرد سے ملتا ہے تو اپنی خیر خیریت بتاتا ہے اور دوسرے کی پوچھتا ہے، پھر اپنے گھر کے مسائل بھی آپس میں تذکرہ کرتا ہے، مگر محمود بھائی اس مزاج سے مستثنیٰ تھے، مجھے یاد نہیں کہ محمود بھائی سے کبھی ملاقات ہوئی ہو اور ان کی گفتگو میں ذاتی زندگی کے مسائل کا موضوع آیا ہو، بلکہ وہ جب بھی ملتے تو ہمیشہ اپنے موضوع ہی کی بات کرتے، سید احمد شہید اکیڈمی کی کتابوں کے سرورق کی تزئین راقم کے ذمہ ہے اور محمود بھائی کی اکثر تصنیفات اکیڈمی ہی سے شائع ہوتی تھیں، اسی لیے وہ جب بھی مجھ سے ملتے تو سب سے پہلے اپنی کتاب کے سرورق بنانے کا شکریہ ادا کرتے اور بڑے ہمت افزائی کے کلمات کہتے، پھر اپنے مزاج کے مطابق اپنی تصنیف کے مالہ وماعلیہ سے متعلق بتانے

لگتے، کون سی قیمتی معلومات انہوں نے کہاں سے حاصل کیں اور کون سی تاریخی چیز انہیں اپنی تصنیف کے دوران کہاں سے ملی، ان سب باتوں کا تذکرہ وہ بڑے فرحت بخش لہجہ میں بیان کرتے۔

ہمارے خاندان میں اگر کوئی پڑھنے لکھنے سے شغف رکھتا، تو محمود بھائی اس پر خصوصی نظر رکھتے، مضامین کے خاکے دیتے، نئے نئے موضوعات کی طرف ان کی رہنمائی کرتے اور خوب ہمت افزائی کرتے۔ راقم سطور کو بھی عموماً اس کی طرف توجہ دلاتے، اگر کبھی ماہنامہ پیامِ عرفات میں میرا کوئی مضمون چھپ جاتا اور ان کی نظر سے گذرتا تو بڑے خوش ہوتے اور دوسروں سے بھی اس کا تذکرہ کرتے۔ میرے جدامجد حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ سے متعلق ایک مختصر تذکرہ قلم بند کرنے کے لیے وہ مجھے ہمیشہ کہتے رہے۔ حج کے موضوع پر ایک مختصر رہنما کتاب میرے نانا سید محمد عاقل قادریؒ خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تصنیف کردہ ہے جو عرصہ سے شائع نہیں ہوئی ہے، وفات سے چندروز قبل جب محمود بھائی کی عیادت کے لیے جانا ہوا، تو انہوں نے مجھے اس کتاب پر ازسرنو کام کرنے، ضروری حواشی لکھنے اور اس کی اشاعت کا مشورہ دیا۔

محمود بھائی کی وفات سے ایک ہفتہ قبل مع اہل خانہ ان کی عیادت کے لیے راقم کی لکھنؤ حاضری ہوئی، اس وقت وہ (I.C.U.) میں ایڈمٹ تھے اور سخت علیل تھے، تقریباً ان کی دو (Dialysis) ہو چکی تھی، برادرم منصور حسنی جوان کی تیمارداری کے لیے وہاں موجود تھے، انہوں نے بتایا کہ بھائی صاحب کو اجابت (loose motion) کا تسلسل ہے، جس کے سبب کمزوری مزید بڑھ گئی ہے، پھیپڑے پر پانی بھی آ گیا ہے اور نمونیہ (pneumonia) کا زور ہے، ہم نے آئی سی یو میں اندر

جا کر محمود بھائی کی عیادت کی تو ان کی غیر معمولی متاثر صحت دیکھ کر بہت رنج ہوا، مجھے دیکھتے ہی ہاتھ کے اشارہ سے سلام کرنے لگے، ہاتھ میں ڈرپ (drip) چڑھی ہوئی تھی، سانسیں تیز تھیں اور کھانسی کا بھی زور تھا، اس کے باوجود مصافحہ کے لیے کوشش کر رہے تھے، یہ دیکھتے ہی طبیعت پر بڑا اثر پڑا اور آنکھیں نم ہوگئیں، مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس حالت میں بھی محمود بھائی کو وہی دھن سوار تھی جس کی لے وہ زندگی بھر گاتے رہے، ان کی آخری مرتب کردہ کتاب ''ہدیہ درود وسلام'' کا سرورق راقم ہی نے بنایا تھا، جو انہوں نے اپنے بستر علالت پر موبائل ہی میں دیکھا تھا اور بہت پسند کیا تھا، چنانچہ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے اپنی پوری ہمت جٹا کر چند الفاظ کہے جب کہ بولنا انتہائی مشکل اور تکلیف کا باعث تھا، فرمایا کہ

''ماشاء اللہ تم نے سرورق بہت زیادہ عمدہ بنایا ہے، بہت اچھا ہے، ہمیں بہت پسند آیا۔''

میرے ساتھ عیادت کے لیے مولوی محمد ارمغان بدایونی ندوی بھی گئے تھے، ان کی طرف مخاطب ہوکر کہا:

''میری کتاب پر مولانا (بلال صاحب) سے مقدمہ لکھوالینا۔''

یہ بھی پوچھا کہ ''تمہیں کتاب کیسی لگی؟''

ارمغان نے جواب دیا کہ انشاء اللہ آپ کی یہ بہت عمدہ تصنیف ہوگی، یہ سن کر محمود بھائی کے لبوں پر ہلکی سی بشاشت کے آثار نظر آئے۔ دراصل انہوں نے اپنی بیماری کے ایام میں ''میرے بے زبان اساتذہ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں انہوں نے زمانہ طالب علمی سے لے کر اخیر دور تک کا مطالعاتی سفر مختصراً قلم بند کیا ہے، اس کتاب کی تصنیف کے بعد ہی محمود بھائی کی طبیعت مزید بگڑتی چلی گئی۔

۵/اگست بروز جمعہ محمود بھائی کی عیادت کے لیے راقم کی حاضری ہوئی تھی، اگلے ہی روز مغرب کے وقت خبر ملی کہ اب ان کی طبیعت سیریس ہے اور وہ وینٹی لیٹر (ventilator) پر ہیں، تقریباً چھ روز تک وینٹی لیٹر پر ہی رہے، اس کے بعد کچھ افاقہ محسوس ہوا اور خیر کی امیدیں بڑھ گئیں، مگر مقدرات کو ٹالنا ممکن نہیں، بالآخر ۱۲/اگست بروز جمعہ صبح کے وقت ان کی وفات کی خبر صاعقہ اثر چاروں طرف پھیل گئی اور عصر کی نماز کے بعد جم غفیر نے نم آنکھوں کے ساتھ ایک زود نویس مصنف، ذاکر وشاغل بندہ اور قلم وقرطاس کے سپاہی کو سپردِ خاک کر دیا۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

بھائی صاحب کی شخصیت کے امتیازی پہلو

مولانا سید منصور حسن حسنی ندوی
(استاد دارالمبلغین۔لکھنؤ)

بھائی صاحب ۲۲؍جولائی ۱۹۷۱ء میں اپنے دادا سید محمد مسلم حسنیؒ کے گوئن روڈ والے مکان پر جو کرایے کا تھا پیدا ہوئے، اس وقت اپنے دادا کے پہلے بڑے پوتے اور نانا کے بھی بڑے نواسے تھے، بلکہ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کے احفاد واسباط کی اولاد میں بھی سب سے بڑے تھے اور علمی لحاظ سے بھی سب سے فائق تھے، دادیہال نانیہال کی پہلی اولاد ہونے کی وجہ سے سب کے نورنظر تھے اور سب کی محبتوں کا محور تھے، حضرت مفکر اسلام علیہ الرحمہ بھی آپ کو بہت عزیز رکھتے، کیونکہ ایک طرف آپ حضرت کی بڑی ہمشیرہ امۃ العزیز صاحبہ کی پوتی کے فرزند تھے تو دوسری طرف حضرت کے برادر اکبر مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنی علیہ الرحمہ کے نواسے اور نواسی کے بیٹے تھے، ان دونسبتوں سے آپ حضرت سے بے انتہاء قریب اور عزیز تھے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اتنے قریب تھے کہ ندوہ کے ۸۵ سالہ جشن تعلیمی کے موقع پر وہ حضرت کو تلاش کرتے ہوئے اسٹیج پر حضرت کے پاس پہنچ گئے، امام حرم

ڈاکٹر التوتونجی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو اپنی گود میں بیٹھالیا، اس وقت بھائی صاحب کی عمر چار سال کی رہی ہوگی۔

چار سال کی عمر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ نے بسم اللہ کرائی، انہوں نے ابتدائی تعلیم ندوہ کے مکتب جو مرکز کی مسجد میں قائم تھا حاصل کی، دادا مرحوم سید محمد مسلم حسنی ہر وقت آپ کو اپنے سے قریب رکھتے، آفس سے آتے ہی دادا مرحوم ان کو لیے رہتے، ریٹائرمنٹ کے بعد جب ہمارے دادا تکیہ رائے بریلی منتقل ہوئے تو بھائی صاحب بھی ان کے ساتھ رائے بریلی آگئے، ثانوی درجات کی تعلیم مدرسہ ضیاء العلوم میں حاصل کی، لکھنؤ کی طرح یہاں بھی دادیہال نانیہال بالکل قریب تھے، بس بیچ میں ایک پختہ وسیع میدان ہے جو ان کے لیے دادیہالی اور نانیہالی صحن کے مثل تھا جو انہیں دادا اور نانا کے قریب رکھتا۔

نانیہال میں ان کا زیادہ تر وقت اپنے نانا کے علاوہ حضرت علیہ الرحمہ کی دونوں بڑی ہمشیراؤں والدہ حضرت مولانا رابع صاحب دامت برکاتہم اور سیدہ امۃ اللہ تسنیم (عائشہ بی) کے پاس ہی گذرتا تھا، ان دونوں بہنوں کی حسن تربیت اور حسن عمل کا وافر حصہ بھائی صاحب کو حاصل ہوا۔

سیدہ امۃ العزیز صاحبہ والدہ حضرت مولانا رابع صاحب بھائی صاحب کا اپنی پوتی کے بیٹے ہونے کی وجہ سے بے حد خیال رکھتیں، حسن اتفاق سے بھائی صاحب کی شادی بوا کی زندگی ہی میں ہوگئی تھی، بھائی صاحب کے یہاں جب بیٹی کی ولادت ہوئی تو ماموں جان نے بوا سے جا کر کہا: بوا! آپ کی پوتی دادی بن گئیں، دادی کی زندگی میں پوتی کا دادی بننا بڑی نرالی بات تھی جس پر ہر سننے والا محظوظ ہوا۔

سیدہ امۃ اللہ تسنیم (عائشہ بی) مرحومہ ان کو نبیوں کے قصے سناتیں اور اسلاف

کے کارنامے بتاتیں، دعائیں مناجات سکھاتیں ۱۹۷۶ء میں عائشہ بی کے انتقال کے وقت بھائی صاحب کی عمر چار پانچ سال کی رہی ہوگی۔

اس عمر میں عائشہ بی کے انتقال کا ان پر کافی اثر پڑا، جس کا اندازہ ان کے اس مضمون سے ہوتا ہے جو انہوں اپنی سات آٹھ سال کی عمر میں عائشہ بی پر لکھا تھا، بعد میں انہوں نے عائشہ بی پر سوانح لکھ کر اس مضمون کی تکمیل کی۔

بھائی صاحب مرحوم کا ان کے پاس بہت دل لگتا تھا، ہماری والدہ مرحومہ بھی ان کی زیر تربیت رہیں، ان کی ساری صفات والدہ مرحومہ کے اندر منتقل ہوگئیں تھیں اور والدہ سے بھائی صاحب کے اندر وہی ایمانی غیرت وحمیت، اخلاص وللّٰہیت، احیائے دین اور لوگوں کے لیے خیر خواہی کا جذبہ منتقل ہوا، حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی صحبت نے ان کو مزید نکھار دیا۔

بھائی صاحب کہتے تھے بوا والدہ حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب دامت برکاتہم نے ایک مرتبہ ہم سے کہا: محمود! تم علی میاں کے ساتھ کھانا کھایا کرو، بھائی صاحب کہتے ہیں کہ اس دن سے حضرت علیہ الرحمہ کی تاحیات ساتھ ہی کھانا کھایا، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ کھانا کھانے کے بہانے حضرت کی صحبت کا وافر حصہ میسر آتا، اس طرح دھیرے دھیرے دیگر سرگرمیاں ختم ہوگئیں اور حضرت کی صحبت ہی اصل ہوگئی، روحانیت کے ساتھ ساتھ علمی فائدہ بھی خوب ملا، جس سے مطالعہ کا شوق اور علم سے شغف پروان چڑھا، رائے بریلی کے قیام کے دوران انہوں نے ''سیر من أعلام النبلاء'' کو بڑی دقت نظر سے کئی کئی مرتبہ پڑھا اور ''نزھۃ الخواطر'' کو بھی مطالعہ میں رکھا، جس سے ان کے اندر تاریخ اور سیرت نگاری کا ذوق پیدا ہوا، جس نے ان کو سیرت وتاریخ کے ممتاز لوگوں کی صف میں شامل کر دیا۔

حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنے کو حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ کردیا تھا، بھائی صاحب کہتے تھے کہ ہماری والدہ ماجدہ نے ہم کو حکم دیا تھا کہ ان دونوں بھائیوں سے ہی منسلک رہنا، بیس بائیس سال کا طویل عرصہ انہوں نے ان کے ساتھ سفر وحضر میں مسلسل گذارا، پورے ملک کے دورے کیے، کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت کی، مشہور ومعروف علمی شخصیات سے ملاقاتیں کیں، ہر موقع پر ان سے مشورے کیے، ہم لوگوں سے کہتے ہر کام میں اچھے ابا سے مشورہ کیا کرو، اس سے بڑی برکت حاصل ہوتی ہے، ہم نے اس کا بڑا مشاہدہ کیا ہے، علمی کاموں میں معاونت کی، ہمیشہ اپنے کو ان کے تابع رکھا، اندرون اور بیرون ملک سے کئی دعوت نامے آئے، لیکن انہوں نے سب سے معذرت کردی کہ حضرت کے بغیر نہیں آسکتے۔ بھائی صاحب کہتے تھے بعض مرتبہ کہیں ہم اکیلے ہی ہیں تو لوگ ہمیں دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ حضرت مولانا بھی تشریف لائے ہیں، حضرت کا اس طرح ساتھ رہا، جب گھر بھی آتے ساتھ ہی آتے اور ساتھ ہی جاتے، اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتے کہ اللہ نے ان فرشتہ صفت شیخین کی صحبت میسر کی۔

۱۴۳۰ھ میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم نے اجازت بیعت سے سرفراز فرمایا، لیکن بھائی صاحب کی یہ خوبی تھی وہ اپنے کو ذرا بھی اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے، اسی لیے انہوں نے اس کا کبھی نہ اظہار کیا، ایسا رہے جیسے ان کو اجازت ملی ہی نہ ہو، یہی اللہ والوں کا معاملہ ہوتا ہے، وہ اپنے کو ہمیشہ معمولی سمجھتے ہیں، تکبر کا شائبہ تک ان میں نہیں ہوتا، اس میں مبالغہ نہیں، ان حضرات کی صحبت وتربیت کا اثر بھائی صاحب کی زندگی پر ویسا ہی پڑا جیسا حضرت گنگوہی نے اپنے پیر ومرشد

حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کی صحبت کے اثرات اپنی زندگی میں بیان کیے تھے کہ نفس کی نفسانیت انا کی انانیت کا وجود مٹ کے رہ گیا، مادح وذام یکساں ہو گئے، شریعت طبیعت بن گئی، امور شریعہ امور طبیعہ بن گئے، جس طرح امور طبیعہ پر عمل کیے بغیر چین نہیں، اسی طرح ان کا یہ معاملہ ہو گیا، شرعی امور پر عمل کیے بغیر چین نہیں ملتا تھا، یہ تو میں نے خود ان کو کہتے ہوئے سنا تھا کہ الحمد للہ ہمیں کسی مسئلہ شرعی میں کبھی اشکال واقع ہوا اور نہ ہوتا ہے۔ "رضیت باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد نبیا ورسولا" کا عملی مصداق تھے۔

بھائی صاحب نے بڑی پاکیزہ زندگی گذاری، اگر ان کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو وہ تعلیم و تعلم، تصنیف تالیف، تدریس وتبلیغ، توجیہ وارشاد میں منقسم نظر آئے گی، انہوں نے ان ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی نبھایا، کبھی بھی ان امور سے پہلو تہی نہیں برتی، وہ ایک باپ کی طرح شفیق، ایک مصلح کی طرح مخلص اور ایک مربی کی طرح فکر مند، ایک اللہ والے کی سادگی اور قناعت اور دنیا سے بے رغبتی اور زندگی کے ہر لمحہ کو اللہ کی امانت سمجھ کر کچھ کر کے گزارنے کی دھن میں مگن رہے، ان کو نہ رات کے آرام کی پرواہ رہی اور نہ دن کے تکان کا ملال رہا۔

ہر وقت مطالعہ میں غرق علمی و تصنیفی کام میں منہمک رہتے، انہوں نے تصنیف وتالیف کے میدان میں گراں قدر خدمات پیش کیں، بے شمار کتابیں تصنیف کیں، جس سے لوگوں نے خوب استفادہ کیا، لیکن ان کی معرکۃ الآرا کتاب تاریخ اصلاح وتربیت سے ان کا علمی تفوق ظاہر ہوا، اس سے ان کا اونچا علمی مقام ہوا، ان کی عملی شخصیت سے لوگ متاثر ہوئے، ملک کے بیشتر رسائل اور جرائد میں ان کے مضامین چھپتے اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے، ڈائری لکھنے کا بڑا اہتمام رہا، جب بھی کوئی کام کی بات دیکھتے

یا سنتے فوراً اس کو نوٹ کرتے، حافظہ بڑا قوی تھا، علم تاریخ پر بڑا عبور تھا، علم تاریخ حضرات محدثین کے یہاں نہایت اہم اور قابل قدر چیز ہے۔

انہوں نے شیخ یونس جونپوری رحمۃ اللہ علیہ پر محدثانہ شان کے ساتھ کتاب لکھی، جو ایک محدث جلیل کی سوانح کے ساتھ ساتھ حدیث اور علوم حدیث کا ایک خزانہ ہے، جو ان کے حدیث اور علوم حدیث سے تعلق کا بین ثبوت ہے، وفیات وسنین ان کو ازبر تھے، علم انساب پر ان کو بڑی دسترس تھی، جس کو انہوں نے اپنا موضوع خاص بنایا اور اخلاص کے ساتھ تن من دھن سے اس میں لگ گئے اور ایسا لگے کہ نہ صحت کی پرواہ کی اور نہ بیماری کا شکوہ کیا، مطالعہ کیا تو خوب کیا، لکھا تو خوب لکھا، قلم چلا تو ایسا چلا چلتا ہی رہا، روکا تو بس ہمیشہ کے لیے رک گیا۔

جب بھی کوئی کتاب چھپ کر آتی تو اسے والد ماجد علیہ الرحمہ کو ضرور پیش کرتے، والد صاحب جس سے بے حد خوش ہوتے، ہم لوگوں سے کہتے محمود کی جب کوئی نئی کتاب آتی ہے محمود وہ فوراً ہمیں لا کر دیتے ہیں، وہ اس کو پڑھتے اور ہر نئی علمی کاوش کے متمنی رہتے، والد صاحب کی حیات میں بھائی صاحب کی کئی کتابیں سوانح ابرار الحق حقی، تذکرہ مولانا عبد الباری ندوی، سلاسل اربعہ، عائشہ بی وغیرہ منظر عام پر آگئیں تھیں، تاریخ اصلاح وتربیت کتاب کا والد صاحب کو بڑا انتظار تھا جو ان کے انتقال کے بعد چھپی، والد صاحب کی یہ بڑی خصوصیت تھی کہ وہ اپنی اولاد کی طرح خاندان کے ہر فرد کا بہت خیال کرنے والے تھے، ان کی خوشی سے بے حد خوش ہوتے تھے، ہر ایک کی ترقی چاہتے تھے، جب بھی کسی کے تعلق سے کوئی خوشی کی بات سنتے تو خوشی سے آنسو نکل پڑتے، بڑے ہی ہمدرد وغمخوار تھے، اسی لیے ان کا خاتون منزل کا گھر رونقوں اور پرتکلف محفلوں کا مرکز رہا کرتا تھا، یہی صفات بھائی صاحب کے

اندر طبعاً منتقل ہوئیں جس نے لوگوں کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

خوشی میں بھائی صاحب بھی آبدیدہ ہوجاتے تھے، جب حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کی آپ بیتی چھپی اور مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی صاحب نے بھائی صاحب کو دی تو وہ خوشی سے آبدیدہ ہو گئے اور کہنے لگے الحمدللہ یہ کام ہو گیا، اس کام کا ہونا بہت ضروری تھا، کیونکہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کی شخصیت معمولی شخصیت نہیں ہے، وہ عالم اسلام کی چنیدہ شخصیات میں سے ہیں، جن کی فکر سلیم، جن کا علم عمیق ہے، ان کی زندگی کے دینی علمی دعوتی اصلاحی پہلوؤں کا واضح ہونا ضروری تھا، یہ کام بحسن وخوبی ہو گیا، جناب مولانا اسماعیل بھولا ندوی صاحب مجاز بیعت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی دامت برکاتہم کے بڑے شکر گزار تھے کہ ان کا اس میں بڑا حصہ رہا۔

بھائی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اہل اللہ کی شفقتیں شروع ہی سے حاصل رہیں، سلسلہ تھانوی کے عظیم المرتبت بزرگ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بارہا حاضری دیتے تھے، اکثر و بیشتر اپنے خال معظم حضرت مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ کے ساتھ اور کبھی اکیلے بھی حاضر خدمت ہوتے، حضرت کے انتقال کے بعد حضرت کے جانشین حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب دامت برکاتہم اور ان کے رفیق خاص حضرت مولانا قاری امیر حسن رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، یہ دونوں حضرات بھائی صاحب پر بے حد شفقت فرماتے، ۲۰۰۹ء میں میرے مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران جب یہ دونوں حضرات حج کے لیے تشریف لائے تو عصر کے بعد مدرسہ صولتیہ میں ان دونوں حضرات کی مجلس میں حاضری کی بھائی صاحب نے فون کر کے تاکید کی، جب ہم حاضر ہوتے تو حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب دامت

برکاتہم قریب بیٹھاتے اور ہمیں دو عدد جوس دیتے اور فرماتے ایک تم اپنی طرف سے پیو اور ایک محمود کی طرف سے پیو، وہیں مدرسہ صولتیہ کی مسجد میں مغرب بعد حضرت مولانا طلحہ صاحب کی مجلس تھی، اس مجلس میں راقم بھی موجود تھا، مرکز مسجد لکھنؤ شوریٰ کے رکن جناب سلمان ظہیر صاحب زید لطفہ نے میرا تعارف کرایا کہ یہ مولانا محمود حسن حسنی ندوی صاحب کے بھائی ہیں تو انہوں نے یہ کہہ کر گلے لگالیا اپنا ہوکر دور بیٹھتا ہے، یہ ان کا خاص شفقت کا انداز تھا۔

اسی طرح بھائی صاحب ہم سب بھائیوں کو لے کر سہارنپور شیخ الحدیث حضرت مولانا یونس صاحب جونپوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت شیخ کھانا تناول کرنے جارہے تھے، بھائی صاحب نے اجازت چاہی، حضرت نے اجازت دے دی، بھائی صاحب نے مصافحہ کرتے ہی اپنا سر حضرت شیخ کی گود میں دے دیا، حضرت ازراہ شفقت بھائی صاحب کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے رہے، واقعی کیسا شفقت بھرا پیارا انداز تھا، جس کا منظر آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

آپ کی خاص صفت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت وشیفتگی اور اتباع سنت تھی، اسی کے ساتھ صحابہ کرام واہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم سے محبت وعقیدت میں خاص امتیاز رکھتے، اس بارے میں ذراسی کوتاہی برداشت نہیں کرتے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مرتبہ میں ذراسی کمی ایمان کی کمزوری جانتے، چنانچہ آپ اپنی کتاب تاریخ اصلاح وتربیت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعلق سے لکھتے ہیں:

”رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم خیر القرون کی نمائندہ شخصیات ہیں، جو آفتاب رسالت کے صحبت یافتہ اور فیض یافتہ درخشاں ستارے اور صدق ویقین، ایمان وعزیمت اور اصلاح وتربیت کے مرد میدان تھے،

جنہوں نے اپنے نور باطن اور تعلیم وتزکیہ سے خلق کثیر کو مستفید کر کے ائمہ حق کی ایک جماعت تیار کردی، جن کے فیضان علم ومعرفت سے سیرابی آج بھی جاری وساری ہے۔''

بھائی صاحب بڑے دیندار متقی پرہیز گار انسان تھے، مہمان نوازی، قرابت داری میں ممتاز تھے، گھر والوں کے حقوق کو مقدم رکھتے، اس میں ذرا بھی غفلت نہ کرتے، اپنی بیٹی حمیرا اسلمہا کی تعلیم وتربیت کا پورا نظم کیا، تعلیمی سرگرمیوں پر پوری نگاہ رکھی، قرآن مجید خود مکمل کرایا، لیکن ڈانٹے اور مارے بغیر، مارنا تو درکنار وہ ڈانٹنے کے بھی روادار نہ تھے، محبت آمیز لہجہ میں بات کرتے، اپنے نواسوں کی بڑی فکر کرتے، بچے بھی ان سے بہت مانوس تھے، ایک کام میں کئی کئی نیتیں کرتے تھے، ہم لوگوں کو اس کی تلقین کرتے اور کہتے اس سے بہت ثواب کمایا جاسکتا ہے اور کہتے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا یہی معمول تھا، ہمارے دادا سید محمد مسلم حسنیؒ ان سے مشورہ کرتے تھے، ایک مرتبہ ابا سے کہنے لگے آپ کو اپنے والدین کی طرف سے حج کروانا چاہیے، اس مشورہ سے ابا بہت خوش ہوئے، اپنے والدین کے حج بدل کے لیے بھائی صاحب کا ہی انتخاب کیا، ابا بارہا اس کا تذکرہ کرتے کہ محمود کی وجہ سے اتنا بڑا کام ہوگیا۔

ایک موقع پر مجوب پوتیوں کے حق میں وصیت لکھوا کر ایک نیک کام کا ذریعہ بنے، اس طرح بھائی صاحب کی بے شمار مخفی نیکیاں ہیں جو ان کے اندرونی تقویٰ کی شاہد ہیں۔

قرآن مجید سے گہرا شغف رہا، تلاوت کا مسلسل معمول رہا، فجر اور عصر بعد تو پابندی سے تلاوت کرتے تھے اور اس کے علاوہ جب بھی موقع ملتا قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگتے، قرآن مجید کی تلاوت اس طرح کرتے جیسے قرآن آپ سے مخاطب ہو، مرض کے زمانہ میں قرآن مجید گھنٹوں سنتے اور اس کے معانی ومفاہیم پر غور کرتے، ماہر مفسر قرآن

کی طرح نکات بیان کرتے، ایک موقع پر فرمانے لگے: "ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار" اس قرآنی دعا میں جو لفظ "حسنہ" ہے یہ بہت جامع ہے، یہ عام بھلائی اور نیکی اچھائی سے بڑھ کر ہے، یہ کامل سے بڑھ کر ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعلق سے آتا ہے:

"لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة" (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی اسوہ ہو ہی نہیں سکتا۔)

ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف فرمائی ہے:

"انك لعلى خلق عظيم"

تو اللہ تعالیٰ نے اس دعا میں کیسی بلیغ تعبیر عطا فرمائی، اس لیے اس دعا کا خاص اہتمام کرنا چاہیے، اس سے نعمتوں اور برکتوں کے دہانے کھلیں گے۔

ذکر واذکار کی بڑی پابندی کرتے اور پابندی کی تاکید کرتے، ذکر جہری کے ساتھ ذکر خفی کا بھی معمول تھا اور کہتے ذکر واذکار کو اپنے معمول کا حصہ بنالو، یہ دلوں کے اطمینان کا ذریعہ ہے، سکرات الموت میں کام آنے والا عمل ہے۔

نمازوں کا ہمیشہ سے اہتمام رہا، باجماعت نماز کے بہت پابند تھے، مرض کی ابتداء میں پیروں کی سوجن کی وجہ سے مسجد جانے میں دقت ہونے لگی تھی، آہستہ آہستہ قدموں سے مسجد جاتے، لیکن اس کا احساس بہت رہنے لگا تھا کہ اگر مسجد قریب ہوتی کیا ہی اچھا ہوتا، بارہا ہم سے کہا: گھر کے قریب میں جگہ دیکھتے رہو، اگر کوئی جگہ بک رہی ہو تو بتاؤ تاکہ مسجد کا نظم کیا جاسکے، عیادت کرنے والے مسلسل آتے رہتے، انتہائی بشاشت سے ملتے، ملنے والا ان کی بیماری کی شدت محسوس نہ کرپاتا۔

بلال ماموں کے آنے سے فرحت وانبساط بڑھ جاتا، ان کے آنے سے بے

پناہ خوش ہوتے، ان سے مشورے کرتے اور کہتے وہ جو کہیں گے ہم وہی کریں گے، بلال ماموں کا مسلسل ساتھ رہا، بیماری کے زمانہ میں تعلق مزید بڑھ گیا تھا۔

دعاؤں کا بڑا اہتمام تھا، دعا مانگنے کا طریقہ بتاتے، کس جذبہ سے دعا مانگنا چاہیے اس کا اثر ہوتا ہے۔ کہتے تھے کوئی بھی کام کرو نیت کو ملحوظ رکھو، حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نیت ہی سے ایسا مقام بلند ملا۔

جو کام کرتے مداومت کے ساتھ کرتے، حضور پاک ﷺ کی طرف سے جب قربانی شروع کی کبھی ناغہ نہیں کیا، ہمیں ان کا قربانی کا پہلا بکرا لانا یاد ہے، شاید وہ بکرا چار سو روپئے کا لائے تھے، اس کو حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کی والدہ کو دکھا کر بہت خوش ہو رہے تھے، شروع سے اخیر عمر تک قربانی کا بڑا اہتمام رہا، بڑے اہتمام سے بکرا خریدتے، اس کے لیے پہلے سے پیسے الگ رکھ لیتے تھے۔ آخری عید الاضحیٰ میں قربانی خوب دلچسپی سے کی، کئی بکرے اور حصے لیے، لیکن تقویٰ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ریا و نمود سے بچتے ہوئے۔

مرض کی شدت کے باوجود معمولات میں کوئی کمی واقع نہیں ہونے دی۔ لیکن علاج معالجہ میں بھی ہر ممکن تدبیر کی، علاج کے لیے مختلف شہروں کے ماہر اطباء سے رجوع کیا، کبھی جناب وسیم صاحب بھٹکلی مجاز بیعت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے کہنے سے ایک ہومیو پیتھک ماہر ڈاکٹر سے علاج کی غرض سے وجے واڑہ گئے، جناب سکری صاحب زید لطفہ کی میزبانی میں رہے، انہوں نے اور ان کے دونوں بیٹے جناب شکیب سکری صاحب، جناب بلال سکری صاحب نے بڑا خیال کیا، اس کے بعد طبیعت جب دوبارہ متاثر ہوئی، آیورویدک علاج کے لیے چنڈی گڑھ جانے میں ان کے ندوہ کے ساتھی جناب شاہد ندوی صاحب IAS آفیسر کا

بڑا تعاون رہا اور چندی گڈھ کے قیام کے دوران حافظ انوار الحق صدیقی صاحب نے علاج کی ہر ممکن کوشش کی، ماہر سے ماہر آیوروید ڈاکٹر سے رجوع کیا، ان سب حضرات نے انتہائی مصروفیت کے باوجود میزبانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ فجزاهم الله خيرا!

سنت الٰہی یہی ہے کہ موت برحق ہے، اس کا ایک دن متعین ہے، بظاہر معلوم یہی ہوتا ہے چندی گڑھ کا آخری سفران کے سفرآخرت کی کڑی تھا، وہاں جب طبیعت میں افاقہ نہیں ہوا تو پندرہ دن کے بعد ڈائلیسس کے لیے لکھنؤ واپسی ہوئی، چندی گڑھ میں ہی لکھنؤ کے ایسے اسپتال کا انتخاب ہوا بظاہر جس سے کوئی واقف نہیں تھا، لیکن انسان وہیں پہنچتا ہے جہاں اس کا جانا لکھا ہوتا ہے، بھائی صاحب نے بھی اسی اسپتال کو مقدم رکھا۔

بھائی صاحب ایئرپورٹ سے گھر تک گاڑی میں مسلسل یہ کہتے رہے ”ما قدر الله يكون“ موت کے بہانے بھی مقدرات میں سے ہیں جو مقدر ہے، اسے بہرحال ہو کر رہنا ہے، نہ اسے روکا جا سکتا ہے، نہ کسی صورت ٹالا جا سکتا ہے۔

بھائی صاحب کے مرض کی شدت کے باوجود اس حادثہ جانکاہ کا وہم تک نہ تھا، کیونکہ طبیعت اب بہتری کی طرف تھی، ڈاکٹر حضرات بھی مطمئن تھے، دو تین ڈائلیسس بھی اطمینان بخش رہے، لیکن اچانک ۱۳ رمحرام الحرام جمعہ کی صبح دل کا دورہ پڑا۔

اللہ تعالیٰ سے لقاء کی چاہت رکھنے والا وہ عالم باعمل بندہ اس آیت ”فمن كان يرجو لقاء ربه فليعمل عملا صالحا ولا يشرك بعبادة ربه أحدا“ پر ایمان رکھتے ہوئے اپنے رب کے حضور حاضر ہو گیا، بھائی صاحب کی اچانک رحلت نے دلوں کو جھنجھوڑ دیا، ان کی جدائی کے غم کا مندمل ہونا محال ہے، اللہ تعالیٰ ان کی بھرپور مغفرت فرمائے، اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے، ہم سب کو جنت میں ملا دے۔ آمین!

بھائی صاحب مشاہدات کے آئینہ میں

سید خلیل احمد حسنی ندوی
(استاد مدرسہ ضیاء العلوم - رائے بریلی)

حدیث شریف میں دنیا کو اہل ایمان کے لیے جیل قرار دیا گیا ہے: ''الدنیا سجن المؤمن و جنۃ الکافر'' جہاں ابتلاء اور آزمائشیں ہیں، پابندیاں اور رکاوٹیں ہیں اور اہل ایمان کے لیے اس جیل سے خلاصی اور نجات موت کی شکل میں ہے، موت کیا ہے؟ منتقلی، ایک جہاں سے دوسرے جہاں میں منتقل ہونا، ایک کیفیت سے دوسری کیفیت میں منتقل ہونا، ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونا، اہل ایمان کی منتقلی جیل خانہ سے جنت میں ہوتی ہے، جنت کیا ہے؟ جنت کا نقشہ خود خدا نے کھینچا ہے، قرآن کھولیے اور جنت کی سیر کرتے جایئے، کہیں قرآن کہتا ہے:

وَبَشِّرِ الَّذِيْن آمَنُواْ وَعَمِلُواْ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِيْ مِن تَحْتِهَا الأَنْهَارُ

(اور آپ ان لوگوں کو خوشخبری دے دیجیے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے کہ یقیناً ان ہی کے لیے ایسی جنتیں ہین جن کے نیچے نہریں جاری ہیں)

آگے جنت کی نعمتوں کا ذکر کرتا ہے:

(كُلَّمَا رُزِقُواْ مِنۡهَا مِن ثَمَرَةٍ رِّزۡقاً قَالُواْ هَـٰذَا الَّذِیۡ رُزِقۡنَا مِن قَبۡلُ وَأُتُواْ بِهِ مُتَشَابِهاً وَلَهُمۡ فِيۡهَا أَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَهُمۡ فِيۡهَا خَالِدُونَ)

(جب رزق کے طور پر ان کو وہاں سے کوئی پھل ملے گا تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے (بھی) دیا جا چکا اور ان کو اس سے ملتے جلتے پھل دیئے جائیں گے اور ان کے لیے وہاں پاک جوڑے ہوں گے اور وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے)

کہیں قرآن کریم جنت میں ساری رکاوٹوں اور بندشوں سے آزادی کا اعلان یوں کرتا ہے:

(جَنَّاتُ عَدۡنٍ يَدۡخُلُونَهَا تَجۡرِیۡ مِن تَحۡتِهَا الأَنۡهَارُ لَهُمۡ فِيۡهَا مَا يَشَآؤُونَ كَذَلِكَ يَجۡزِیۡ اللّهُ الۡمُتَّقِيۡنَ)

(ہمیشہ رہنے والے ایسے باغات جن میں وہ داخل ہو جائیں گے، ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان کے لیے وہاں وہ سب کچھ ہے جو وہ چاہیں گے، اللہ ایسے ہی پرہیزگاروں بدلہ دیا کرتا ہے)

کہیں جنت کے عیش کی ہلکی سی جھلک یوں پیش کرتا ہے:

(أُوۡلَئِكَ لَهُمۡ جَنَّاتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِن تَحۡتِهِمُ الۡأَنۡهَارُ يُحَلَّوۡنَ فِيۡهَا مِنۡ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَيَلۡبَسُونَ ثِيَاباً خُضۡراً مِّن سُندُسٍ وَإِسۡتَبۡرَقٍ مُّتَّكِئِيۡنَ فِيۡهَا عَلَى الۡأَرَائِكِ نِعۡمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتۡ مُرۡتَفَقا)

(ایسوں ہی کے لیے ہمیشہ کی جنتیں ہیں، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی،

وہاں ان کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور وہ سبز باریک اور دبیز ریشم کے کپڑے پہنے، مسہریوں پر ٹیک لگائے وہاں بیٹھے ہوں گے، کیا خوب بدلہ ہے اور کیسی حسین آرام گاہ ہے)

کہیں جنت کی رونقوں کو یوں بیان کرتا ہے:

(وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيْمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِءٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ)

(اور جو ایمان لائے اور ایمان میں ان کی اولاد نے ان ہی کا راستہ اختیار کیا تو ہم ان کی اولاد کو بھی ان ہی میں شامل کر دیں گے اور ان کے کاموں میں ہم کچھ بھی کمی نہیں کریں گے، ہر شخص کی جان اس کے کاموں کے بدلہ گروی رکھی ہوئی ہے اور ہم ان کو ان کی خواہش کے مطابق میوے اور گوشت بہم پہنچائیں گے، وہاں وہ جام کے لیے چھینا جھپٹی کریں گے، اس میں نہ کوئی بیہودگی ہوگی نہ کوئی گناہ)

غرض پورے قرآن کریم میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے جنت اور اہل جنت کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے، اہل ایمان کے لیے موت اسی جنت میں داخل ہونے کا ایک ذریعہ ہے، اہل ایمان موت کا استقبال کرتے ہیں، کیونکہ ان کو یقین ہوتا ہے اللہ کی رحمت پر، امید ہوتی ہے رؤیت باری تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی، حضرت انسؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انتقال کے وقت ان کی زبان پر یہ کلمات تھے: غدا نلقى الأحبة محمدا وحزبه .

بھائی صاحب محمود اللہ کے دربار میں حاضر ہو چکے، طویل عرصہ بیماری اور تکلیف میں گزار کر اس کے نتیجہ میں اپنی سیئات اور لغزشوں کو معاف کروانے کے لیے اور اپنی نیکیوں کا صلہ لینے کے لیے، آپ پر لکھنے والے بہت کچھ لکھیں گے، مشاہدات،

تاثرات اور احساسات، کیونکہ آپ کی زندگی کے تین ادوار ہیں:

طالب علمانہ زندگی: جس میں دوستانہ تعلقات ہوتے ہیں، حلقہ احباب کی وسعت، شب وروزان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور گفت وشنید میں شمولیت ہوتی ہے۔

دوسرا دور ہے تدریسی: اس کے جلی عناوین میں آپ کا انداز تدریس، طلباء کے تئیں خلوص، ان کو قریب کر کے دینی تعلیم سے ان کو مانوس کرنا ہے۔

تیسرا دور ہے تربیتی: کیونکہ آپ ایک صاحب دل، صاحب نسبت حضرت مولانا شاہ نفیس الحسینی صاحب کے مجاز بیعت تھے، آپ کی پوری زندگی پر یہ تربیتی پہلو غالب تھا۔

آپ پر لکھنے والے آپ کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کریں گے، میں یہاں اپنے مشاہدات بیان کرنے پر اکتفا کروں گا، جو میں نے بحیثیت ایک انسان آپ میں پائے۔

بھائی صاحب میرے خالہ زاد بھائی تھے، آپ کی والدہ حضرت مولانا ثانی حسنی کی لخت جگر تھیں، فطرۃً وہ نیک تھیں، اپنے والد کی نیم شبی میں مانگی گئی دعاوں کا نتیجہ تھیں اور ان کی پاکیزہ زندگی کا عکس تھیں، آپ اپنے والد کی انتہائی چہیتی بیٹی اور دونوں چچاؤں کو انتہائی محبوب بھانجی تھیں، آپ کی تربیت میں آپ کی نانی عائشہ بی کا ہاتھ ہے اور عائشہ بی کو آپ سے غیر معمولی تعلق اور محبت تھی اور کیوں نہ ہو وہ ان کے عزیز از جان بھانجے کی لخت جگر تھیں، ان کے بڑے بیٹے محمود حسن حسنی ندویؒ ہیں۔

بھائی صاحب کی تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا، ثانویہ کی تعلیم کے لیے اپنے گاؤں کے قریب ایک مدرسہ "مدرسہ ضیاء العلوم" میں داخلہ لیا، وہاں کی تعلیم مکمل کر کے دار العلوم ندوۃ العلماء کا رخ کیا اور عالمیت اور فضیلت کی تکمیل کی، تدریسی زندگی کا آغاز

ضیاء العلوم سے کیا، کچھ عرصہ تدریسی خدمت انجام دی، پھر اپنے کو اپنے نانا حضرت مولانا رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور تاحیات آپ کے ساتھ سایہ کی طرح لگے رہے، نہ صرف ان کے علم اور تجربات سے فائدہ اٹھایا، بلکہ دینی طور پر بھی ترقی کے زینے طے کرتے گئے، یہاں تک کہ شاہ نفیس الحسینی صاحب کی نظر کیمیا نے اس ہیرے کو بھانپ لیا اور ان کو اپنے سلسلہ میں بیعت کی اجازت دے کر دوسروں کی تربیت کی ذمہ داری دے دی۔

بھائی صاحب کی وہ خوبیاں جو ان کو دوسروں سے نمایاں کرتی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

دینی حمیت وغیرت:

بھائی صاحب دینی غیرت وحمیت میں بہت فائق تھے، دینی معاملات میں ادنیٰ مداہنت اور تساہلی ان کے نزدیک ناقابل برداشت تھی، وہ اس میں کسی کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے، چاہے سامنے والا اپنا ہو یا پرایا، اس وقت ان کے سامنے بس یہ حدیث(ان اللہ یغار وان المومن یغار وغیرۃ اللہ أن یأتی المومن ما حرم علیہ) ہوتی تھی، بارہا میں نے مشاہدہ کیا ہے، دو واقعات اس سلسلہ میں بیان کرتا چلوں۔

تکیہ سے متصل ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس کا نام ''پوروا'' ہے، جہاں کی آبادی کا بیشتر حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے، وہاں اس وقت کوئی مسجد نہیں تھی، وہاں کے لوگ جمعہ کے لیے تکیہ کی مسجد آتے تھے اور بقیہ نمازوں میں تساہلی برتتے تھے، بھائی صاحب کی دینی حمیت نے اس کو گوارا نہیں کیا، انہوں نے وہاں رمضان میں تراویح کا

نظم کیا، امام کا بندوبست کیا، تراویح کی نماز پڑھنے خود وہاں جاتے تھے اور ایک ایک گھر سے مرد حضرات کو بلواتے تھے، ان کو لالچ دیتے تھے، ان کو نماز پر آمادہ کرنے کے لیے خرچ کرتے تھے اور جہاں ضرورت زجر وتوبیخ کی پڑتی تو وہ بھی اختیار کرتے تھے، ایک بار ایک صاحب نے کہا: میں ناپاک ہوں۔ تو ان کو اسی وقت غسل کرنے کے لیے بھیجا اور پھر نماز میں شریک کیا، آج الحمدللہ اس علاقہ میں مسجد تعمیر ہوگئی ہے اور اس علاقہ والوں میں نماز کا اہتمام بھی پیدا ہوگیا ہے، جس کا ثواب انشاء اللہ بھائی صاحب کو مل رہا ہوگا۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: ”من دل علی خیر فله مثل أجر فاعله“ (جس نے کسی خیر کی طرف رہنمائی کی تو کرنے والے کے بقدر رہنمائی کرنے والے کو بھی ثواب ملے گا۔)

ان کے ایک شاگرد نے ان کی دینی غیرت وحمیت کا ایک واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ بھائی صاحب نے صحابہ کرام کے ایثار کا ایک واقعہ سنایا کہ ایک صحابی نے دوسرے صحابی کو ہدیہ بھجوایا، انہوں نے دوسرے کو بھجوایا، دوسرے نے تیسرے کو بھجوایا، ہوتے ہوتے وہ ہدیہ اس صحابی کے پاس آگیا جس نے آغاز کیا تھا، ایک طالب علم بول اٹھا ”کیا اسی لیے ہدیہ بھیجا تھا؟“ اتنا سننا تھا کہ بھائی صاحب درجہ سے باہر نکل گئے اور چھڑی لے کر دوبارہ آئے اور اس طالب علم کی بہت پٹائی کی۔

ان کے ساتھ رہنے والا اس بات کی گواہی دے گا کہ وہ اپنے معاملہ میں بڑی سے بڑی بات برداشت کر جاتے تھے، کوئی انتقامی کاروائی نہیں کرتے تھے، دوبارہ اس طرح ملتے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، مگر دینی معاملات میں تعلق قطع کر لیتے تھے، جب تک سامنے والا توبہ نہ کر لے اور اپنے عمل پر نادم نہ ہو۔

قرآن کریم سے تعلق اور ذکر کی اہمیت:

قرآن کریم کی تلاوت کا بڑا اہتمام تھا، میں نے مہمان خانہ میں بارہا دیکھا کہ

فرض نماز اور سنتوں سے فارغ ہوتے ہی قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول ہوجاتے تھے، ظہر کی نماز کے معاً بعد مہمان خانہ میں کھانا ہوتا ہے، مگر بھائی صاحب اس وقت کو بھی غنیمت جانتے ہوئے تلاوت میں مشغول ہوجاتے تھے اور کھانے میں تھوڑی تاخیر سے شریک ہوتے تھے، کھانے سے زیادہ مناسبت نہیں تھی، اس لیے دسترخوان سے سب سے پہلے بھائی صاحب ہی اٹھتے تھے۔

ذکر کا بہت اہتمام تھا، ذکر میں ''اللہ'' کو ترجیح دیتے تھے، فرماتے تھے: ''اس نام میں ایسی تاثیر ہے کہ ایک بار لینے سے دل کی دنیا بدل جاتی ہے اور دنیا کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔'' آپ اس نام میں ڈوب کر ذکر کرتے تھے، دوران ذکر آپ کو دیکھنے والا سمجھ جاتا تھا کہ اردگرد سے بے خبر یہ بندہ اپنے رب سے مناجات میں مشغول ہے: ''لیس بینہ و بین اللہ حجاب'' کی تصویر اس کے سامنے آجاتی تھی۔

صلہ رحمی:

یہ حدیث برابر آپ کی نگاہوں میں رہتی تھی: ''ان من أبر البر أن یصل الرجل أھل ود أبیه بعد أن یولی'' ایک مرتبہ بعد نماز فجر میرے گھر تشریف لائے، آپ کا معمول تھا کہ بعد نماز فجر لکھنے میں مشغول ہوجاتے تھے، اس عمل میں آپ کو کوئی تھکاوٹ نہیں ہوتی تھی، کئی کئی گھنٹے لکھتے رہتے تھے، مجھ سے کہا: ''صحیح مسلم لاؤ'' میں لے کر آیا، ''باب صلة الرحم'' کھولا اور یہ حدیث مجھ کو دکھائی اور کہا دیکھو کتنی بڑی نیکی ہے، جب کہ اس کو اختیار کرنا کتنا آسان ہے، اس پر مضمون لکھو، عام طور پر لوگوں کی نگاہ اس پر نہیں جاتی۔

آپ اپنے چچاؤں اور خالاؤں کے ساتھ حسن سلوک اسی حدیث کو سامنے رکھ کر کرتے تھے، مجھ سے بارہا فرمایا:

”میرے والد کے بعد میرے سر پرست میرے چچا ڈاکٹر احمد حسنی مرحوم ہیں، میں ہر کام ان کے مشورہ سے کرنا پسند کرتا ہوں۔“

آپ کا معمول تھا کہ حسن سلوک کی خاطر تحفے بھی دیتے تھے، خاص کر رمضان کے شروع میں اپنے والدین کی نسبت سے اپنے چچاؤں اور خالاؤں کے لیے پھل فروٹ اور مختلف چیزیں چیزیں خریدتے اور کئی پیکٹ بنواتے اور علیحدہ علیحدہ سب کو دیتے تھے، کئی بار میرا خود آپ کے ساتھ سامان خریدنے کے لیے شہر جانا ہوا ہے۔

آپ حضرت مولانا رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے ساتھ ان کے ہر سفر میں معاون کی حیثیت سے شریک ہوتے تھے اور حضرت مولانا کو آپ سے بڑی تقویت ملتی تھی، سفر اگر کسی ایسی جگہ کا ہو جہاں آپ کے اعزہ واقارب موجود ہوں تو آپ صلہ رحمی کی نیت سے وقت نکال کر ان سے ملاقات کرتے، ان کی خیریت دریافت کرتے اور ان کے ساتھ کچھ وقت گزارتے۔

آپ اپنے چھوٹوں کو یہی نصیحت کرتے تھے کہ اپنے والدین کے تعلق والوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا برتاؤ کرو، یہ بہت بڑی نیکی اور بڑا کار ثواب ہے۔

مہمان نوازی:

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

”من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه“(جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔)

ایک حدیث شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جو مہمان نوازی نہ کرے اس میں کوئی خیر نہیں۔“

بھائی صاحب مہمان نوازی میں غیر معمولی فوقیت رکھتے تھے، چاہے مہمان سے

واقف ہوں یا ناواقف، مگر اس طرح ملتے کہ مہمان کو مل کر اپنائیت کا احساس ہوتا تھا، ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی تھی، زبان پر مانوس کرنے والے الفاظ ہوتے تھے، آپ مہمان نوازی میں بہت ممتاز تھے، جو بھی کر سکتے تھے کرتے تھے، اپنی مرغوب ترین چیز مہمان کو پیش کر دیتے تھے، آپ (ویؤثرون علی أنفسهم ولو کان بهم خصاصة) کا عملی نمونہ تھے، بار ہا میں نے مشاہدہ کیا کہ گھر میں کوئی خاص چیز پکی اور آپ کے لیے رکھ دی گئی، آپ خاموشی سے چھپا کر اس کو بنگلہ لے جاتے اور مہمان کی خدمت میں پیش کر دیتے، سب سے مشکل کام ہوتا ہے مصروف آدمی کا اپنے مصروف شیڈول سے وقت نکال کر کسی کو وقت دینا، خاص مہمانوں کو تو ہر ایک وقت دینا چاہتا ہے، مگر مہمان کوئی بھی ہو کسی بھی حیثیت کا ہو، اس کو پورا وقت دینا، اس کو کسی اجنبیت کا احساس نہ ہونے دینا صرف بھائی صاحب کی ہی خوبی تھی، اسی مہمان نوازی اور حسن سلوک کا نتیجہ تھا کہ تدفین میں اتنی بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی اور جو شرکت نہیں کر سکے انہوں نے اپنی جگہ رہ کر ایصال ثواب کا اہتمام کیا۔

سادگی اور تواضع:

جس نے چند لمحے بھی آپ کے ساتھ گزارے ہوں، وہ آپ کی سادگی کی گواہی دے گا، زندگی کا بڑا حصہ مہمان خانے میں حضرت مولانا کی معیت میں گزار دیا، مہمان خانے میں آپ کے آرام کے لیے مخصوص جگہ تھی، مگر بار ہا ایسا ہوا کہ وہاں کوئی اور آکر آرام کرنے لگا تو ایسی حالت میں بھائی صاحب کو جہاں جگہ مل جاتی تھی آرام کر لیتے تھے، کبھی کسی چیز پر اعتراض نہیں کیا، کبھی اپنی پوزیشن کا ناجائز استعمال نہیں کیا۔ آپ کا پہناوا انتہائی سادہ ہوتا تھا، اسی سادہ حلیہ اور سادہ پہناوے میں آپ نے بڑے بڑے جلسوں میں شرکت کی اور خطاب کیا، آپ کی زندگی میں شان وشوکت

اور ظاہری اہتمام کی کوئی جگہ نہیں تھی، ہر حال میں زبان پر احساس شکر رہتا جس کا نتیجہ نعمتوں کی فراوانی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ”لئن شکرتم لأزیدنکم“ (اگر تم شکر کرو گے تو ہم مزید نوازیں گے۔)

انفاق فی سبیل اللہ:

انفاق فی سبیل اللہ میں بھی آپ بہت ممتاز تھے، بڑی سے بڑی رقم آپ غرباء میں تقسیم کر دیتے تھے، بعض وقت باوجود ضرورت کے آپ نے غرباء کو ترجیح دی، ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگے:

”میرے پاس رقم نہیں رہ پاتی جو بھی ضرورت مند سامنے آتا ہے الحمد للہ اس کی مدد کی کوشش کرتا ہوں، اپنی طرف سے کر سکتا ہوں تو خود کرتا ہوں ورنہ ذریعہ بننے کی کوشش کرتا ہوں۔“

یہی وجہ تھی کہ آپ کے پاس پیسے نہیں رہ پاتے تھے، آپ صدقات وخیرات کو اس طرح چھپاتے تھے کہ آپ کے قریب ترین لوگوں کو علم نہیں ہو پاتا تھا کہ کن کن کی ضرورتیں آپ سے پوری ہو رہی ہیں، آپ اس حدیث کا مصداق تھے جس میں سات قسم کے لوگوں کو اللہ کے عرش کا سایہ ملنے کی بشارت ہے، ان میں سے ایک وہ ہے جو صدقہ اس طرح دے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو معلوم نہ ہو سکے کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا۔

دنیا سے عدم مناسبت اور کن فی الدنیا کانک غریب کا عکس جمیل

آپ دنیا سے لاتعلق تھے، مگر احوال دنیا سے پوری واقفیت رکھتے تھے، کیا ہو رہا ہے؟ کیا چل رہا ہے؟ دنیا کا منظر نامہ کیا ہے؟ مگر اس طرح کہ دنیا سے لاتعلق تھے، اس کی چکا چوند سے لاتعلق تھے، پوری زندگی ”کأنک غریب“ کے احساس کے

ساتھ گزاردی۔

اللہ والوں سے محبت اوران سے تعلق:

ایک تعزیتی جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے میرے والد محترم مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی نے مولانا محمود صاحب کے بعض امتیازات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ میرے والد محترم حضرت مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ اور مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ میں ایک مشترکہ خوبی تھی کہ دونوں دنیاداروں سے بیزار اور اللہ والوں سے غیر معمولی تعلق رکھنے والے تھے، کوئی دنیادار یا عہدے دار اگر حضرت مولانا رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم سے ملنے آجاتا تو یہ دونوں حضرات اس کی آمد سے قبل ہی گھر کا رخ کر لیتے تھے اور اس کے واپس چلے جانے کے بعد ہی ندوہ واپس آتے تھے اور اللہ والوں سے ملاقات کے لیے خود تشریف لے جاتے تھے، چاہے محی السنۃ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب سے ملنے ہردوئی جانا ہو یا حضرت مولانا قمر الزماں صاحب سے ملنے الہ آباد جانا ہو، ان حضرات کے یہاں محبت کا معیار دین تھا۔

بھائی صاحب محمود ہر صاحب نسبت بزرگ کے منظور نظر تھے، ایک مرتبہ ہم سب بھائیوں کا بھائی صاحب کی معیت میں شیخ الحدیث مولانا یونس جونپوریؒ کی زیارت کے لیے سہارنپور جانا ہوا، اس سفر کے محرک بھائی صاحب تھے، حضرت شیخ الحدیث کی مجلس میں دیکھا کہ حضرت شیخ کی توجہ سب سے زیادہ بھائی صاحب محمود پر ہے، جب کہ حضرت شیخ کے دوسرے متعلقین بھی وہاں موجود تھے، یہ ”رجلان تحابا فی اللہ“ کا ایک انتہائی خوبصورت منظر تھا جو میں نے وہاں دیکھا، بھائی صاحب کے حوالہ سے حضرت شیخ نے ہم لوگوں کو بھی بہت وقت دیا اور گفتگو فرمائی، اسی طرح اثناء حج بھائی صاحب کے اصرار پر ہم تین لوگ (میں، مسعود حسن حسنی

ندوی، امین حسنی) حضرت مولانا حکیم کلیم اللہ صاحب دامت برکاتہم خلیفہ حضرت شاہ ابرار الحق ہردوئی کی مجلس میں حاضر ہوئے اور ان کو بھائی صاحب کا سلام پہنچایا تو انہوں نے بھی غیر معمولی محبت اور شفقت کا معاملہ کیا اور برابر ملتے رہنے کی تاکید کی اور از راہ کرم ہدیہ بھی پیش کیا۔

تربیت:

بچوں کی تربیت پر بھائی صاحب کا بڑا زور تھا، وہ تربیت کے لیے متعدد طریقے اختیار کرتے تھے، کبھی مال کی محبت دل سے نکالنے کے لیے ان سے دینی جگہوں پر خرچ کرواتے، اپنی ذات سے ہٹ کر خرچ کرواتے، نماز کے تعلق سے غیر معمولی حساسیت رکھتے تھے اور اس میں تساہلی ناقابل برداشت تھی، بڑے پن کا احساس ان کے ہاں سنگین جرم سمجھا جاتا تھا جس کی معافی آسانی سے نہیں ملتی تھی، ادنیٰ بھی بڑائی کا جملہ اگر کسی کے منہ سے نکل گیا تو بھائی صاحب شمشیر برہنہ ہو جاتے تھے اور جب تک اس کے اندر سے اس بڑائی کے احساس کو کھرچ کر نکال نہ دیتے، تب تک اس کی کلاس چلتی تھی۔

صبر:

بھائی صاحب کی ایک اور نمایاں خصوصیت ان کا صبر تھا، صبر کی تلقین بہت آسان کام ہے، مگر عملی طور پر صبر کرنا انتہائی مشکل کام ہے، اسی لیے اس کا اجر بھی بے حساب ہے: ”انما یوفی الصابرون أجرهم بغیر حساب“ (یقیناً صبر کرنے والوں کو ان کا بدلہ پورا پورا بے حساب دیا جائے گا)

علاج کے لیے جب آپ چنڈی گڑھ میں مقیم تھے تو بطور تیمارداری میں او

رعبدالعلی بھی یہاں سے گئے، وہاں ہفتہ دس دن چوبیس گھنٹے آپ کا ساتھ تھا، آپ انوار بھائی کے گھر میں مقیم تھے، بلاشبہ ان لوگوں نے غیر معمولی خیال رکھا، بیماری اپنی انتہاء پر پہنچ چکی تھی، ڈاکٹر مایوسی کا اظہار کر رہے تھے، آپ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مرض آخری اسٹیج پر ہے، نقاہت اور کمزوری اپنی انتہاء پر پہنچ چکی تھی، چلنا پھرنا تو دور بغیر سہارے کے بستر سے اٹھنا ناممکن ہو گیا تھا، اس حالت میں بھی لبوں پر مسکراہٹ رقصاں رہتی، گفتگو میں باقاعدہ حصہ لیتے، اپنی رائے دیتے، مایوس چہروں کو دلاسہ دیتے، اللہ کی ذات سے امید کا آسرا دیتے، بعض وقت تکلیف جب ناقابل برداشت ہو جاتی تو کرب چہرے پر نظر آجاتا، مگر لب تب بھی خاموش رہتے، آنکھیں اس تکلیف کی گواہی دیتی تھیں اور بندے کے آنسو رب کو بہت محبوب ہیں اگر صبر کرتے ہوئے نکلیں۔

آپ اللہ کے دربار میں اپنے نیک اعمال کا بدلہ لینے کے لیے حاضر ہو گئے، اللہ تعالیٰ آپ کو بلند مقام عطا فرمائے او رجنت میں آپ کے اپنوں سے آپ کو ملا دے۔ آمین!

بھائی صاحب امتیازات وخصوصیات کے آئینہ میں

مولوی سید رشید احمد حسنی ندوی
(مدیر ماہنامہ رضوان-لکھنؤ)

ابھی تو ہماری آنکھوں میں حضرت والد ماجدؒ کی جدائی کی نمی تھی اوراسی کے ایک سال کے بعد ہمارے سسر وچچا مولانا ڈاکٹر احمد حسنی ندویؒ کا انتقال ہوا اور ابھی ہمارے سینوں میں حضرت والدؒ اور مولانا ڈاکٹر احمد حسنی ندویؒ کی جدائی کی کسک باقی ہی تھی کہ چچا جان کی وفات کے ایک مہینہ کے بعد ۲/اگست ۲۰۲۲ء کو ایک طویل علالت کے بعد ہمارے محبوب و مشفق ومربی، ہر دل عزیز، پھوپھی زاد بھائی مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ بھی ہم سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! کل تک وہ ہم کو ہدایات ومشورے دیا کرتے تھے، ماہنامہ ''رضوان'' اور ''مکتبہ اسلام'' کی ترقی کی باتیں کیا کرتے تھے اور کئی کتابوں کو ملاحظہ فرمار ہے تھے۔

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی ندویؒ (خلیفہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ) کے نواسہ تھے اور سید محمد مسلم حسنیؒ کے پوتے تھے، الحاج سید محمد مسلم حسنیؒ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی خالہ زاد

بہن کے بیٹے ہیں اور حضرت مولانا ڈاکٹر عبد العلی حسنی ندویؒ کے بڑے داماد تھے، ان کے صاحب زادے سید حسن حسنی تھے، جو حضرت مولانا محمد ثانی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے داماد تھے۔

ولادت ونشوونما:

الحاج سید حسن حسنیؒ کی پانچ اولادیں ہوئیں، ان میں سب سے بڑے صاحب زادے مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ تھے، ان کے علاوہ دو صاحب زادیاں اور دو صاحب زادے تھے۔ مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ لکھنؤ میں مولانا ڈاکٹر عبد العلی حسنیؒ کے مکان میں ۲۸/ جمادیٰ الاولیٰ ۱۳۹۱ھ - ۲۲/ جولائی ۱۹۷۱ء کو پیدا ہوئے، ساتویں دن عقیقہ کی سنت ہوئی اور حضرت شیخ الہندؒ کے نام کی مناسبت سے محمود حسن نام رکھا گیا، چار سال کی عمر میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ نے بسم اللہ کرائی اور سات سال کی عمر میں مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ نے ناظرۂ قرآن مجید مکمل کرلیا اور تکمیل ناظرۂ قرآن مجید ہونے پر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ نے دعا کرائی، پھر ابتدائی عربی درجات کی تعلیم مدرسہ ضیاء العلوم میدانپور میں حاصل کرنے کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا، وہاں ثانوی درجات کی تعلیم حاصل کی، پھر اس کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء سے ۱۴۱۰ھ میں عالمیت کی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۹۹۲ء میں حدیث شریف میں فضیلت واختصاص حاصل کیا۔

تعلیم وتدریس:

مدرسہ ضیاء العلوم میدانپور تکیہ کلاں رائے بریلی سے تدریس کا آغاز کیا اور شروع درجات سے آخر درجات تک پڑھایا اور حدیث کی کتاب بھی پڑھائی، آپ

کے سینکڑوں شاگرد ہوئے اورادب وانشاء،علوم شرعیہ کی تعلیم دیتے رہے،ساتھ ساتھ دارعرفات میں تصنیف وتحقیق سے وابستگی اختیار کی اور تحقیقی وعلمی کام انجام دیتے رہے،اپنی وفات سے چندسال پہلے تک۔

تصنیفی خدمات وعلمی ذوق:

مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ کو تاریخی وعلمی ذوق ورثہ میں اپنے محبوب نانا حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی ندوی مظاہریؒ سے ملا تھا،انہیں لکھنے میں وقت نہیں لگتا تھااور نہ انہیں لکھنے کے لیے پرسکون ماحول کی ضرورت ہوتی تھی۔مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کے اسلوب میں سلاست وروانی کے ساتھ ساتھ تذکرہ نگاری وسوانحی خاکہ جیسے خشک موضوع کے لیے تحریر کی چاشنی ناگزیر ہوتی ہے اوران کی سوانحی کتب کا پڑھنے والا کہیں بوریت محسوس نہیں کرتا، یہ دراصل ان کے اسلوب کی چاشنی کا کمال ہے، تذکرہ نگاری اور بزرگوں کی سوانح سے ان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ لوگ سوانحی وتاریخی معلومات کے لیے مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کی طرف رجوع کرتے تھے اور آپ سے مستفید ہوتے تھے،مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کی سوانحی کتب میں علمی ودینی وادبی ذوق نمایاں رہتا تھا،مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ نے بزرگان دین اور خانوادۂ حسنی کے نامور افراد کی سیرت وسوانح مرتب کی، وہ اپنے نانا کی طرح حسنی خاندان کے انساب اوراس خاندان کے رجال سے واقفیت میں ممتاز تھے،اپنی اس صلاحیت سے انہوں نے خوب خوب فائدہ اٹھایااور سیرت وسوانح پر ضخیم جلدیں تیار کردیں۔

مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ کا مطالعہ وسیع تھااور تصنیف وتالیف ان کا خاص وبہترین مشغلہ تھا، لکھنے پران کو ایسی قدرت تھی خاص طور پر شخصیات پر کہ وہ کئی کئی صفحات یعنی کم ازکم ۱۲؍صفحات آدھے گھنٹے میں بڑی آسانی سے لکھ دیا کرتے تھے،

جیسے میرے والد رحمۃ اللہ علیہ بعد نماز مغرب اتنے صفحات لکھا کرتے تھے۔مطالعہ کے ساتھ تاریخی ذوق ایسا غیر معمولی تھا کہ اگر کوئی پوچھتا تو وہ اس طرح بتاتے جیسے وہ ابھی یاد کر کے آئے ہوں، مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کو لکھنے کا ذوق روزنامہ لکھنے سے پیدا ہوا، پھر وہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا روزنامچہ لکھنے لگے، دسیوں ڈائریاں لکھ ڈالیں۔''

(ماہنامہ پیام عرفات، اگست ۲۰۲۲ء)

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ نے سوانح نگاری کی ایسی مشق بہم پہنچائی تھی کہ اس صنف کے صاحب طرز ادیب مصنفین وسوانح نگاروں میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا شمار ہونے لگا تھا اور ان کی درج ذیل سوانحی وتاریخی کتب شائع ہو کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں:

(۱) فرشتہ صفت انسان (۲) سوانح حضرت شاہ ابرار الحق حقیؒ (۳) سلاسل اربعہ (۴) تجدید معاشرت (۵) عائشہ بی (۶) سیرت داعی اسلام حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ (۷) سوانح حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی ندویؒ (۸) چند دن دیار نکہت ونور میں (۹) سوانح شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ (۱۰) تاریخ اصلاح وتربیت وغیرہ۔

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کی علمی زندگی کا آخری شاہ کار ''ہدیہ درود وسلام'' ہے، جو وفات سے ایک یا دو دن پہلے جب آپ لکھنؤ میٹرو سٹی ہاسپٹل میں تھے، جہاں آخری سانس لی، اس وقت شائع ہو کر آئی اور شہدائے اسلام کے اجلاس میں اس کی رسم اجرا ہوئی۔

صحافتی خدمات:

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کا ۲۰۰۱ء میں ''تعمیر حیات'' میں معاون مدیر کے طور پر انتخاب ہوا، پھر کچھ عرصہ کے بعد نائب مدیر بنادیے گئے، ''تعمیر حیات'' سے ان کی وابستگی عملی تھی، اس میں ان کے مضامین اور سفرنامے شائع ہوتے تھے، ''تعمیر حیات'' کے علاوہ لکھنؤ سے شائع ہونے والے خواتین کے ترجمان ماہنامہ ''رضوان'' کے نگراں بھی تھے اور دار عرفات کا ترجمان ''پیام عرفات'' کی مجلس ادارت کے تادم آخر رکن ادارت رہے، جب حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو ماہنامہ ''رضوان'' میں شریک ادارت کرلیا، اس وقت سے حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کی معاونت کرنے لگے، ماہنامہ ''رضوان'' کے لیے علمی و دینی مضامین لکھنے لگے، ''رضوان'' کی اشاعت میں اضافہ ہوا، یہاں تک کہ حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد آپ کو نگراں بنایا گیا، تو ''رضوان'' کو پڑھنے والوں میں اضافہ ہوا، ان کی نگرانی میں حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ پر نمبر کمپوز ہو کر پریس میں جانے کو تیار ہو گیا، لیکن ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا، ایسے ہی پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' میں سفرنامے اور نانا جان مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت فیوضہم العالیہ کے بیانات دیتے رہے اور ''پیام عرفات'' میں علمی مضامین لکھ کر دیتے رہے۔

حج وعمرے کے اسفار:

۲۰۱۲ء میں خاندان کے آٹھ افراد پر مشتمل ایک قافلہ حج کو روانہ ہوا، اس میں مولانا سید عبداللہ حسنیؒ، مولانا جعفر مسعود حسن حسنی ندوی مدظلہ، مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ، ان کے ساتھ مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ اور ان کے ساتھ گھر والے

تھے، ان ایام میں خوب دعائیں کیں اور اپنے بڑوں کی خوب خدمت کی، اس کے بعد حضرت مرشد الامت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم العالیہ کے ساتھ عمرہ بھی کیا اور اس کے بعد کئی عمرے کیے۔

کئی سال پہلے جب حضرت والدؒ نے حج بدل کیا تو آپ کے ساتھ والدہ محترمہ مدظلہا اور مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ اور ان کی پھوپھی رحمۃ اللہ علیہا تھیں، مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ کا یہ حج بدل تھا، اس میں انہوں نے حضرت والدؒ کی بڑی خدمت کی اور خوب دعائیں لیں اور سب سے آخری عمرہ دو تین سال پہلے کا عمرہ ہے، اس سفر عمرہ میں مولانا بلال عبد الحی حسنی ندوی مدظلہ اور آپ کے ساتھ مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ اور ان کے رفقاء مع مولوی عبد العلی حسنی وراقم بھی تھے، اس عمرہ کے سفر میں بہت دعائیں کیں اور مولاناؒ نے دل سوز دعاؤں ومناجات وتلاوت قرآن وطواف کا اہتمام کیا، ہم کو زیادہ سے زیادہ اس میں ذکر ودعا وتلاوت قرآن میں گذارنے کا حکم دیا، یہی عمرہ مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کا آخری عمرہ تھا۔

دعوتی اسفار:

مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ نے ہندوستان کے بہت سے شہروں کے اسفار ودعوتی دورے کیے، زیادہ تر نانا جان مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت فیوضہم اور حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنیؒ کے ساتھ اسفار کیے، ان دو اکابر کے ساتھ کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کیا کرتے تھے اور بعض جلسوں میں حضرت نانا أطال اللہ بقاءہ کی جگہ ان کو تقریر کرنی پڑ جاتی تھی، کیونکہ حضرت ہر جگہ نہیں جا سکتے تھے۔ مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ حضرت دامت برکاتہم العالیہ کے ساتھ گجرات اور کیرلا، ممبئی، پونہ اور اتر پردیش کے مختلف شہروں الہ آباد، پرتاب گڑھ، کانپور

اور صوبہ آندھرا پردیش وتلنگانہ کے شہروں حیدرآباد اور ایسے ہی شہر کلکتہ اور بہار کے شہر پٹنہ کے دعوتی اسفار کیے، اس کی تفصیل بیان کرنے کی جگہ ان صفحات میں نہیں ہے۔

اوصاف وامتیازات:

مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ کے اندر اللہ پاک نے ایک ایسا دل رکھا تھا جو محبت الٰہی سے معمور اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عشق اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محبوب صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سچی محبت سے معمور تھا، یہی چیز تھی جس نے ان کو با ادب بنایا، اسی سے نرمی، رقت، تواضع، چھوٹوں پر شفقت اور معاملات میں دوسروں کا اپنے سے زیادہ خیال رکھنے اور امانت ودیانت کی صورت میں ظاہر ہوئی اور بڑے مہمان نواز تھے، کسی کا بھی مہمان آجائے اس کی خاطر داری ایسی کرتے تھے جیسے مہمان ان کا ہو، جو کام بھی کرتے تھے اللہ کے لیے کرتے تھے۔

افرادخاندان کی تربیت وصلہ رحمی:

مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ اپنے دو چھوٹے محبوب بھائی مولانا سید مسعود حسن حسنی ومولانا سید منصور حسن حسنی اور ہم دو بھائیوں راقم اور مولوی سعید حسنی کو نصیحت کیا کرتے تھے، ہم لوگ دین کے کاموں میں زیادہ وقت لگائیں، دنیا کے چکروں میں نہ پڑیں، وقت بہت قیمتی ہے، اس کو دینی کام اور ذکر وعبادت وتلاوت قرآن میں لگاؤ جو آخرت میں کام آئے، بیماری کے ایام میں حضرت نانا دامت برکاتہم جب بھی ان سے ملنے جاتے تو اس طرح ملتے جیسے آپ ٹھیک ہوں، اتنا ادب کرتے تھے حضرت دامت فیوضہم کا اور مولانا سید بلال عبد الحی حسنی اور مولانا عمار حسنی ملنے جاتے تو ان سے باتیں کرتے اور خوش ہوتے، ماموں جی مولانا جعفر مسعود حسنی مدظلہ ملنے جاتے تو ان سے مل کر خوش ہوتے اور باتیں کرتے تھے، اس طرح تمام خاندان کے افراد ملتے

توسب سے مل کرخوشی کا اظہار کیا کرتے تھے اور بچوں سے بہت خوش ہوتے تھے، وہ لوگوں کے درمیان کی بدگمانیوں کو دور کرتے، غلط فہمیوں کا ازالہ کیا کرتے اور خاندان کے چھوٹے اور بڑے سب کے ساتھ حسن سلوک وصلہ رحمی کیا کرتے تھے اور ایک دوسرے کے کام آتے تھے، ایک دوسرے کے گھر جایا کرتے تھے اور اپنے گھر سب کو بلاتے تھے اور مہمان نوازی کرتے تھے۔

مشائخ عصر و مصلح شخصیات سے ملاقات وزیارت:

مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ نے حضرت مولانا شاہ ابرارالحق رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی اور عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد احمد پرتاب گڑھیؒ سے فیض یاب ہوئے اور حضرت مولانا قاری امیر حسن ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی، حضرت مولانا حکیم کلیم اللہ ہردوئی سے ملاقات کی اور خاص طور سے عارف باللہ حضرت شاہ نفیس الحسینی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی اور زیارت کی اور دیگر مشائخ عصر سے ملاقات ہوئی، اس کی تفصیل ان محدود صفحات میں مشکل ہے۔

اصلاح وتربیت، اجازت وخلافت:

۱۴۱۲ھ میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے رمضان المبارک میں مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کو اپنے چاروں سلسلوں (چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ) میں اور خاص طور پر حضرت سید احمد شہیدؒ کے طریقۂ محمدیہ میں داخل سلسلہ فرمایا اور تسبیحات تلقین فرمائیں، پھر تدریجاً ذکر نفی واثبات اور ذکر اسم ذات تلقین فرمایا، از راہِ شفقت اپنی موجودگی وسرپرستی میں ذکر کی ایک مجلس بھی کروائی، مولانا محمود حسنی ندویؒ اوراد ووظائف، اذکار واشغال کے پابند، ذکر قلبی وذکر جہری کا بڑا اہتمام کرتے تھے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات

کے بعد سلسلہ رائے پور کے عظیم المرتبت شیخ حضرت شاہ سید نفیس الحسینی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۴۲۱ھ میں آپ کو اجازت بیعت سے چاروں سلسلوں خصوصاً امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ میں سرفراز فرمایا، پھر ان کی وفات کے نو سال کے بعد ۱۴۳۰ھ میں جانشین مفکر اسلام مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم العالیہ وعمت فیوضہم العالیہ نے چاروں سلسلوں (چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ) اور امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ محمدیہ میں تحریری طور پر اجازت بیعت دی، اس کے بعد ۱۴۳۳ھ میں حضرت مرشد الامت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اطال اللہ بقاءہ کے عمرہ کے سفر میں مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ کو رفاقت کا شرف حاصل ہوا اور مطاف میں ملتزم کی سمت میں حضرت مرشد الامت أطال اللہ بقاءہ سے تجدید بیعت کا شرف حاصل کیا اور ۱۴۴۰ھ میں حرم مکی میں مقیم سلسلہ تھانوی کے بزرگ حضرت الحاج انجینئر عبد المنان صاحب دامت فیوضہم العالیہ نے مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کو تحریری اجازت نامہ ارسال کیا اور مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ نے ایک عالم دین کو اپنے تمام سلسلوں سے اجازت بیعت عطا فرمائی، اس خوش نصیب کا نام مولانا انتساب عالم صاحب ہے، جو چمبل گھاٹی کے دیہاتوں میں سینکڑوں مکاتب چلا رہے ہیں، اللہ قبول فرمائے۔ آمین!

چند اساتذۂ حدیث ومشائخ حدیث:

شیخ الحدیث حضرت مولانا ناصر علی ندویؒ، حضرت مولانا شہباز احمد اصلاحیؒ، موجودہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا سنبھلی دامت برکاتہم، حضرت مولانا برهان الدین سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا عبد اللہ محمد الحسنی ندویؒ، حضرت مولانا عبد القادر ندوی گجراتی دامت برکاتہم۔

چند مشائخ حدیث جن سے اجازت حدیث واجازت مسلسلات ملی، ان کے نام یہ ہیں:

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، جانشین مفکر اسلام مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم العالیہ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ، حضرت مولانا تقی الدین ندوی دامت برکاتہم، حضرت مولانا محمد عاقل صاحب سہارنپوری دامت برکاتہم، حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم، حضرت مولانا عبدالحلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا احمد شفیع بنگلہ دیشی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا برھان الدین سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ۔

وفات:

مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ بغرض علاج چنڈی گڑھ گئے، ایک ہفتہ یا زیادہ رہے، تو طبیعت زیادہ بگڑ چکی تھی، لکھنؤ لائے گئے تو لکھنؤ کے میٹروسٹی ہاسپٹل میں ڈائلائسس کے لیے بھرتی کیے گئے اور آئی سی یو میں بھرتی کیا گیا، روزانہ ڈائلائسس کے باوجود بروز جمعہ ۱۳/محرم ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۲/اگست ۲۰۲۲ء تقریباً صبح نو بجے لکھنؤ میٹروسٹی ہاسپٹل میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، پھر جمعہ کی نماز کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ میں پہلی نماز جنازہ حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی مدظلہ العالی نے پڑھائی، پھر اس کے بعد دوسری نماز جنازہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں بروز جمعہ بعد نماز عصر جانشین مفکر اسلام مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم نے پڑھائی اور مسجد شاہ علم اللہ کے شمالی جانب اپنے ماموں حضرت مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندویؒ کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ!

بھائی صاحب-مشاہدات وتاثرات

محمد امین حسنی ندوی
(رفیق دارعرفات،تکیہ کلاں،رائے بریلی)

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ جن کو ہم سب ''بھائی صاحب'' کہتے تھے، وہ ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ (برادر اکبر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ) کے پرنواسوں میں سب سے بڑے تھے، وہ ایک نسل کو دوسری نسل سے جوڑنے کا کام کررہے تھے، بھائی صاحب مرحوم کی شخصیت ہمہ جہت تھی، وہ خاندانی اقدار وروایات کے امین تھے، ان کی زندگی کا واحد مقصد احیائے دین تھا، انہوں نے اپنے مقصد اصلی کو کبھی فراموش نہیں کیا، انہوں نے جس زمانہ میں آنکھیں کھولیں وہ زمانہ بڑا ہی علم وفضل کا تھا، ایک طرف خواتین میں محترمہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ (جن کو لوگ ''عائشہ بی'' کے نام سے جانتے تھے) کے علم کا چرچا تھا اور لوگ ان سے فیض حاصل کرتے تھے، دوسری طرف مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی شہرت عالمی ہوچکی تھی اور ان کی علمی خدمات کا اعتراف پورا عالم کررہا تھا، خاندان میں تعلیم وتربیت پر بڑا زور تھا، اخلاقی قدریں تھیں، ایمانی غیرت وحمیت کو پروان چڑھایا جاتا تھا، اخلاص

وللّٰہیت کا سبق دیا جاتا تھا، فکر کی بلندی پیدا کی جاتی تھی۔

اس وقت کا زمانہ علماء ومشائخ کا تھا، بزرگان دین سے ان کا تعلق بڑا گہرا تھا، ان کی زندگی کو جن لوگوں نے بڑے قریب سے دیکھا ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ دنیا میں ایک مسافر کی طرح رہے، انہوں نے اپنی زندگی کا نصف حصہ اس طرح گذارا جیسے وہ کسی سفر میں ہوں، جب ان کا دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تقرر ہونے لگا تو وہاں سے تکیہ کلاں آگئے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا تقرر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہو، کیونکہ ان کے ایک بھائی مفتی مسعود حسن حسنی ندوی کا تقرر ہو چکا تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے انتقال کے بعد اپنی والدہ ماجدہ کے کہنے پر اپنے دونوں نانا حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم ومولانا محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کے ساتھ اپنے کو وابستہ کر لیا، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی رہائش ہو یا سفر ہو، ہر جگہ وہ ساتھ رہتے، مذاق میں کبھی ہم لوگوں سے کہتے کہ ہم اس لیے اکیلے کہیں نہیں جاتے کیونکہ لوگ سمجھتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی بھی آئے ہیں۔

بھائی صاحب کا اصل موضوع تاریخ وسیرت تھا، اس میں ان کو کمال حاصل تھا، برصغیر میں چند ہی لوگوں میں ان کا شمار تھا، سنین ووفیات ان کو ایسے از بر یاد تھیں جیسے بچوں کو پہاڑا یاد ہوتا ہے، بھائی صاحب نے تاریخ اصلاح وتربیت لکھی جو ایک بڑا کارنامہ ہے، تاریخ اسلام پر ان کا یہ کام بڑا متوازن اور اعتدال کے ساتھ کیا گیا ہے جس کو خوب پسند کیا گیا، اس کے علاوہ انہوں نے مختلف بزرگوں کی سوانح لکھی، مثلاً: تذکرہ مولانا ابرارالحق حقی، تذکرہ مولانا عبد الباری ندویؒ، تذکرہ محمد زبیر الحسن کاندھلویؒ، عائشہ بی، شیخ الحدیث مولانا یونس جونپوریؒ، سوانح حضرت مولانا محمد ثانی حسنیؒ، تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، سیرت داعی اسلام مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ۔

بھائی صاحب مرحوم میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں وہیں ایک بڑی خوبی صلہ

رحمی کا جذبہ تھا، وہ ہر کسی کے ساتھ صلہ رحمی چاہتے تھے اور اس میں ان کے ہاں کسی طرح کی کوئی تفریق نہیں تھی، غریب ہو یا پریشان حال سب کی مدد کرتے اور اس طرح مدد کرتے کہ بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلتا، وہ اس حدیث پر عمل کرتے ''ورجل تصدق بصدقة فأخفاها حتى لا تعلم شماله ما تنفق يمينه'' ان کو مانگنا پسند نہیں تھا، وہ کسی کی مدد کرنا چاہتے تو خاموشی سے کرتے اور ظاہر بھی نہ ہونے دیتے کہ اس کی کوئی مدد کی ہے، اس کے سامنے بھی اس طرح رہتے جیسے خود اس نے ان پر احسان کیا ہو، اگر خود مدد نہیں کر پاتے تو اپنے کسی قریبی سے کہتے اور کوشش کرتے کہ کسی تیسرے کے علم میں نہ آئے، کتنے لوگوں کی ان کے ذریعہ مدد ہو رہی تھی، ان کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ دوسروں کے لیے جی رہے ہیں، سچی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے لیے کچھ نہیں کیا، جب ان کا لکھنؤ میں گھر بنا تو وہ وہاں بھی نہیں رہے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کی خدمت میں اپنے کو وقف کر دیا تھا، گھر آنا ہوتا تو ان کے ساتھ ہی آتے یا جد محترم مولانا محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کے ساتھ آتے اور کوشش کرتے کہ دونوں کا بڑا اکرام ہو، ان کے احترام میں کوشش کرتے۔

شرعی و دینی امور کا بڑا پاس ولحاظ تھا اور اس میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے تھے، سب کی بات سنتے لیکن جب بات دین کے خلاف ہوتی یا شریعت سے ٹکراتی تو صاف اچھے انداز سے ٹوکتے اور متنبہ کرتے، ہر بات میں دین کو ترجیح دیتے، کوشش کرتے کہ دین کی خدمت کی جائے اور دنیاوی مفادات کو اپنی زندگی کا محور نہ بنایا جائے، گھر میں بھی اسی کی باتیں کرتے اور خاموشی سے نصیحتیں کرتے کہ دنیاوی زندگی چند لمحوں کی ہے جو کام کرنا ہے آخرت کے لیے کرنا ہے، کوئی بھی کام کرتے تو نیت ہوتی، ان کی نصیحت سے محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ڈانٹ رہے ہیں، بلکہ ایک محسن کی طرح بڑی محبت سے سمجھاتے اور یہ ظاہر کرتے کہ وہ خیر خواہی کے جذبہ سے

کہہ رہے ہیں، وہ دوسروں کے لیے اپنی راحت وآرام کو تج دیتے اور اس کی راحت کی فکر کرتے، کوئی بزرگ شخصیت آتی تو چاہتے کہ گھر کا ہر بچہ ان سے مل لے اور دعائیں لے لے، لیکن جب دنیاوی کوئی شخصیت آتی تو کہیں نظر نہ آتے اور سب سے دور اپنے علمی کام میں مشغول رہتے، ان کی زندگی کا مقصد آخرت کی فکر اور اس کی تیاری تھا۔

ایک چیز ہم نے جوان کے اندر بہت محسوس کی، وہ ان کے والدین کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک ہے، حدیث میں آتا ہے کہ کہ سب سے اعلیٰ نیکیوں میں سے ہے کہ کوئی شخص اپنے باپ کے مرنے کے بعد یا اس کی غیر موجودگی میں اس کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کرے، بھائی صاحب اپنے والد کے دوستوں سے بڑا تعلق رکھتے تھے، لیکن ان کے انتقال کے بعد ان کا تعلق اور بڑھ گیا تھا، باقاعدہ ملنے جاتے اور ان کا بہت خیال رکھتے، اس کا اہتمام کرتے کہ والد کے انتقال کے بعد اب وہی ان کا خیال رکھ سکتے ہیں، وہ خاندانی نسبتوں کا بھی بڑا خیال رکھتے۔

بھائی صاحب مرحوم کبھی دینی مزاج کو نہ بھولتے اور ہر وقت دین کو فوقیت دیتے، وہ وقت چاہے خوشی کا ہو یا غمی کا، وہ کوشش کرتے کہ سنت نبوی سے ہٹ کر کام نہ ہو، ابا کا جب انتقال ہوا اور جنازہ مہمان خانہ میں رکھا تھا تو انہوں نے راقم سے کہا کہ جا کر سرہانے بیٹھو اور قرآن مجید پڑھ کر بخشتے رہو، اسی طرح غسل کے موقع پر بھی باقاعدہ بلا کر لے گئے اور تدفین میں بھی قبر میں اترنے کو کہا کہ تم حافظ ہو، ان کے ہاں اس بات کا بہت اہتمام تھا، غفران بھائی مرحوم کا جب اندوہ ناک واقعہ ہوا جس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا، جب ان کی لاش باندہ لے جائی جارہی تھی تو بھائی صاحب نے راقم کو لاش گاڑی پر اصرار کر کے بیٹھایا کہ ان کا حق ہے، بھائی صاحب ایسے موقع پر مرہم رکھتے اور اس کی کوشش کرتے کہ دین وشریعت کا لحاظ رکھا جائے۔

بھائی صاحب اس حدیث کا مصداق تھے ”رجلان تحابا فی اللہ اجتمعا

علیه وتفرقا علیه" وہ خالص اللہ کے لیے تعلق رکھتے تھے، ان کے نزدیک تعلق کا معیار امیری یا غریبی نہیں بلکہ دینی ہوتا، وہ دین کی نسبت سے جوڑتے تھے "من أحب لله وأعطی لله ومنع لله فقد استکمل الایمان"" وہ خلق خدا کو فائدہ پہنچانا جانتے تھے فائدہ اٹھانا نہیں، انہوں نے اپنی زندگی اسی مقصد کو سامنے رکھ کر گذاری، وہ بہت کچھ کر سکتے تھے، فائدہ اٹھا سکتے تھے، لیکن زندگی انہوں نے زاہدانہ گذاری اور اپنے بڑوں کے نقش قدم کو اختیار کرتے ہوئے دنیا سے چلے گئے۔

بھائی صاحب مرحوم لایعنی باتوں سے بہت اجتناب کرتے تھے، کہیں بھی بیٹھتے بزرگوں کے واقعات سناتے، علمی باتیں کرتے، تاریخی حوالوں سے بات کو سمجھاتے، ان کا ایک کمال یہ بھی تھا کہ کسی بھی مزاج کی شخصیت ہوتی، کسی بھی موضوع سے اس کا تعلق ہوتا، وہ بھائی صاحب کے پاس بیٹھ کر بور نہ ہوتا، اسی کے مطابق بات کرتے اور اس کی خاندانی نسبتوں کا حوالہ دیتے اور پوری بات اس سے کرتے، اس کو یہ احساس نہ ہونے دیتے کہ اکتاہٹ ہو رہی ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی شخصیت کو انہوں نے پورے طریقہ سے سمجھا اور جانا تھا، ان کے اندر اپنے نانا حضرت مولانا محمد ثانی حسنیؒ کا مزاج آیا تھا، شخصیات سے واقفیت اور ان کے مزاج کو سمجھنا یہ بڑا اہم کام ہوتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ بھائی صاحب جہاں جاتے پہلے سے متعارف ہوتے۔

بھائی صاحب مرحوم کی زندگی نہایت روشن اور تابناک رہی، انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد اشاعت دین کو بنایا، ان کے اندر حب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجزن تھا، جو ان کے مضامین میں اور ان کی باتوں سے صاف جھلکتا تھا، آخری کتاب ان کی "ہدیہ درودوسلام" پر مشتمل تھی، کتنی ہی پاکیزہ زندگی رہی کہ حب نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اس دنیا سے رختِ سفر باندھا اور حدیث کے مصداق بنے کہ "المرء مع من أحب."

ہمارے بھائی صاحب!

سید عبد العلی حسنی ندوی
(دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں، رائے بریلی)

بھائی صاحب (مولانا سید محمود حسنی ندویؒ) کی شخصیت گونا گوں اوصاف حمیدہ کی حامل تھی، جن میں سرفہرست آپ کی خوش مزاجی، زندہ دلی اور کسر نفسی تھی، بارہا آپ کی پرلطف و پرنور مجالس میں شریک ہوا، ہر دفعہ علم وعرفاں کے کچھ چھینٹے نصیب ہوئے، خوش مزاجی ایسی تھی کہ جب بھی ہم چھوٹوں سے ملتے مسکرا کر بے تکلفی سے پیش آتے، زندہ دلی ایسی کہ پژمردہ ماحول میں اپنی امید افزا باتوں سے زندگی کی رمق پیدا کردیتے، کسر نفسی کا عالم یہ کہ اکثر دوران گفتگو جذبہ بندگی وسرافندگی سے بے قرار ہوکر اپنی تحقیر پر آمادہ ہوجاتے، جذبہ عشق خداوندی سے دل ہمیشہ لبریز ہوتا اور گاہے بگاہے عالم جذب وشوق میں عرفان ومحبت کے موتی بھی لڑھکاتے، موت وآخرت کا تذکرہ ہمیشہ زبان زد ہوتا، خشیت ورجا اور ایمان ویقین کی کیفیت دل میں ہوتی، رسول کی محبت اور اتباع سنت، صحابہ کی عظمت اور پیروی اور اسلاف کا ذکر خیر مجالس کی زینت ہوتا۔

وہ خود سوانح نگار تھے اور خوب سوانح نگار تھے، متعدد بزرگوں کے تذکرے ان

کی نوک قلم سے نکل کر مقبول عام وخاص ہوئے، سوانح نگاری کا یہ سلیقہ انہیں اپنے نانا مولانا محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل ہوا تھا، البتہ یہ ان کی جہد مسلسل اور عمل پیہم تھا کہ وہ پوشیدہ صلاحیتیں اجاگر ہوئیں جو آج متعدد قیمتی تصنیفات اور تذکروں کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

بھائی صاحب کو لکھنے کا شوق بچپن یا کہہ لیں کہ لڑکپن سے تھا، ابتدا میں ڈائری لکھا کرتے تھے، پھر مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور اس قدر بڑھ گیا کہ اخیر دور میں خود فرماتے کہ میری طبیعت اسی لیے خراب ہوئی کہ میں نے اپنے جسم کو آرام نہیں دیا، بھائی صاحب نے اپنی محنت اور لگن، بڑوں کی رہنمائی اور سب سے بڑھ کر اللہ کے فضل وانعام سے اپنی زندگی کے ایک کورے کاغذ پر تابندہ ودرخشندہ نقوش ثبت کیے، ایک پتھر کو تراش کر جوہر میں تبدیل کیا، جس کی روشنی سے بہتیروں نے فائدہ اٹھایا اور ہنوز اٹھا رہے ہیں۔

بھائی صاحب کے ساتھ بیتے لمحے تو اب یاد ماضی کا ایک حسین دیباچہ ہو گئے ہیں، لیکن کچھ چشم دید باتیں ان کے ذوق مطالعہ، قوت استحضار اور افادہ علم کی ہیں جو نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں، بھائی صاحب کا قیام زندگی کے آخری ایام میں بغرض علاج چنڈی گڑھ میں بھی رہا اور بفضل خداوندی راقم الحروف کو بھی چند دنوں کی رفاقت نصیب ہوئی، صورت حال یہ تھی کہ طبیعت میں شدید گرانی تھی، ہلنا ڈلنا محال تھا، خود سے اٹھنے بیٹھنے کی سکت نہیں تھی، ڈاکٹروں کی سخت ہدایت تھی کہ گفتگو کم کریں اور ایسی گفتگو بالکل نا ہو جس سے دل ودماغ پر بوجھ ہونے کا خدشہ ہو، ہم سب بھی محتاط رہتے اور صرف دل بستگی کی باتیں کرتے، لیکن بھائی صاحب کی شخصیت اس قدر گنجینہ معلومات تھی کہ ضمنی طور پر نادانستگی میں بھی اگر کوئی بات نکل آتی تو بس مولانا شروع ہو جاتے۔

ایک دفعہ ذکر ہو گیا کہ مراکش کے ایک صاحب سادات حسنیات پر کچھ کام کر رہے ہیں، بس سننا تھا کہ گویا ہوئے کہ نوٹ کرو، اب میں تذبذب میں کہ طبیعت کی اس خستگی میں

سنین ولادت ووفات اور تعلیم وتربیت کی مختصر روداد لکھوانا تو بھائی صاحب کے لیے ذہنی تناؤ کا باعث ہوگا، لیکن مجال ہے کہ میری ایک چلے، میں روکتا رہا اور بھائی صاحب نے عربی ہی میں املا کرانا شروع کر دیا اور استحضار کا یہ عالم تھا کہ بغیر کسی پس وپیش کے آٹھ دس خواتین کا تذکرہ مع قمری وشمسی سنین ولادت ووفات چند منٹوں میں قلم بند کرا دیا، پھر بمشکل تمام ہزار جتن کر کے بھائی صاحب کو روکا۔ ایک مرتبہ بستر ہی پر محو استراحت تھے کہ میں نے یوں ہی ہندوستان کے حکمراں سادات کا ذکر کیا تو ان کی تاریخ بیک ساعت گوش گذار کر دی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جب انسان اپنا اوڑھنا بچھونا ہی کتابوں کو بنا لے تو کتابیں ہی سامان دل بستگی بن جاتی ہیں اور علمی وفکری نکتہ آفرینی ہی تفنن وتفریح معلوم ہونے لگتی ہے، قلم وقرطاس ہی نیرنگی فطرت ہو جاتے ہیں اور اس ہی کی بوقلمونی طبیعت کو فرحت وسرور بخشتی ہے، پھر دولت کے انبار بھی حقیر معلوم ہوتے ہیں اور جاہ ومنصب کی چاہ بھی جاتی رہتی ہے، بقول شاعر:

علم کی شمع سے روشن ہو گیا جب ذہن ودل
مجھ کو اس غربت میں بھی یہ زندگی اچھی لگی

بھائی صاحب اس شعر کے مصداق تھے کہ ہر چیز سے بے پرواہ ہو کر تصنیف وتالیف ان کا پسندیدہ مشغلہ رہا، زندگی کے کسی پڑاؤ میں جنبش قلم رکی نہیں، تا آنکہ ایام علالت میں بھی انہوں نے ایک کتاب مرتب کر دی اور کیا خوب انتخاب فرمایا کہ ہدیہ درود وسلام کے ساتھ ایک محب رسول بارگاہ ایزدی حاضر ہوا:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

ماموں صاحبؒ- کچھ مشاہدات، کچھ یادیں

ابوالحسن علی فاروقی
(متعلم دارالعلوم ندوۃ العلماء-لکھنؤ)

جو بھی اس دنیا میں آیا ہے اس کو بقا نہیں ہے، بلکہ ہر ایک کے لیے واپسی کا ایک وقت مقرر ہے، جس میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے، موت وزیست نظام خداوندی کا ایک حصہ ہے اور جو لوگ اس مرحلہ سے بحسن وخوبی گذر جائیں ان کے لیے رب ذوالجلال کی جانب سے خصوصی عنایات وبرکات ہیں، قرآن مجید کے اندر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿الذی خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم أیکم أحسن عملا﴾
(اللہ) جس نے موت وزندگی اس لیے پیدا کی تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے عمل میں کون زیادہ بہتر ہے)

اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ مومن کی زندگی بے مقصد ہے نہ موت، بلکہ زندگی اگر اللہ کی بندگی میں گزرے اور حسن انجام ہو تو یہاں کی وقتی پریشانیوں کے

بعد آخرت میں نعمتوں کا لازوال سلسلہ ہے اور وہ نعمتیں بھی بے مثال ہیں۔

ماموں صاحب یعنی مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ کی شخصیت ایسی تھی کہ جن کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی زندگی کے شب و روز فکر آخرت اور ذکر و اذکار میں گزرے، راقم السطور نے جب سے ہوش سنبھالا ہے کبھی ان کو کوئی خلاف شرع کام کرتے نہیں دیکھا، بلکہ جو کام بھی کرتے دین وشریعت ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی تھی، اس کی گواہی خود ان کے معاصر مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ دیتے ہیں ،مولانا لکھتے ہیں:

''وہ عمر میں مجھ سے تقریباً دوسال چھوٹے تھے، بچپن سے ہم دونوں کا ساتھ تھا جو آخر تک رہا، ان کو دین کا ذوق بچپن سے حاصل تھا جو عمر کے ساتھ بڑھتا گیا، وہ اپنے زہد اور دنیا سے بے رغبتی میں بہت آگے گئے، ہر کام میں ان کے سامنے دینی فائدہ ہوتا، دنیا کے کسی ادنیٰ فائدے سے ان کو کوئی رغبت نہ تھی، ان کو شروع سے بزرگوں سے استفادے کا شوق تھا، مشائخ عصر کی خاص توجہ وشفقت ان کو حاصل رہی، متعدد مشائخ سے ان کو اجازت وخلافت بھی ملی، مگر انھوں نے کہیں اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔''

ماموں صاحب کو ہر وقت یہ فکر لاحق رہتی تھی کہ لوگوں کے اندر دینی ذوق کیسے پیدا ہو؟ یہ فکر کبھی کبھی اس درجہ غالب ہوجاتی کہ وہ لوگوں کو دینی کاموں کی ترغیب دیتے اور بالفور اپنی نگرانی میں ان کی انجام دہی کے لیے کوشاں ہوجاتے تھے، مجھے یاد ہے کہ بچپن میں ہر سال رمضان کے کچھ ایام تکیہ کلاں رائے بریلی میں گزرتے تھے، آج بھی یہ سلسلہ قائم ہے، اس وقت جب ماموں صاحب نماز تراویح کے لیے کھڑے ہوتے تو ہم سب بچوں کو اپنے آس پاس کھڑا کرتے اور مسلسل نگرانی رکھتے تھے۔

عام طور پر گھر کا کوئی فرد کسی غیر ملکی سفر سے واپس آتا ہے تو بچوں کے لیے کھلونے وغیرہ لاتا ہے اور ان کو بھی انہی چیزوں سے خوشی ہوتی ہے، لیکن ماموں صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ ہمارے بچپن میں ایک لمبے سفر سے واپس آئے تو ہمارے لیے انبیاء ورسولوں کے سبق آموز واقعات پر مشتمل بائیس کتابوں کا سیٹ لائے اور ان کو بالاستیعاب پڑھنے کی تلقین کی، اسی طرح وہ موقع موقع سے پڑھنے لکھنے اور عملی زندگی میں برتنے کی ہدایات فرماتے رہتے تھے۔

گذشتہ برس یعنی ۲۰۲۱ء کی ابتدا میں ماموں صاحب کے ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ترجمان رسالہ پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' کی کچھ پرانی فائلیں دیکھ رہا تھا تو اس میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی بعض اہم تقریریں نظر آئیں جو انھوں نے شہدائے اسلام کے پندرہ روزہ جلسوں میں کی تھیں، اس موقع پر انھوں نے توجہ دلائی کہ ان خطبات کو مرتب کر دیا جائے تو عام مسلمانوں کے لیے انتہائی اہم اور مفید کام ہوگا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عظمت اور حضرات اہل بیت رضی اللہ عنہم کی محبت وعقیدت کے سلسلہ میں حضرت مفکر اسلام کا موقف اور مسلک سامنے آجائے گا، چنانچہ ہم نے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اس کام کو شروع کیا اور چند دنوں میں یہ کتاب منظر عام پر آگئی، یہ خال مکرم کی غیر معمولی توجہات کا نتیجہ تھا۔

ماموں صاحب گذشتہ کئی سالوں سے مختلف امراض میں مبتلا تھے، تکلیف اس درجہ تھی کہ زمین پر پیر رکھنا دشوار تھا، علاج کے سلسلہ میں متعدد اسفار ہوئے، لیکن کہیں خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا، اس سلسلہ میں آخری سفر چندی گڑھ کا ہوا، جس میں راقم کو رفاقت کی سعادت حاصل رہی، وہاں جناب حافظ انوار الحق صاحب کے گھر پر قیام رہا اور وہیں معالجین کی آمد رہتی تھی، ابتدا میں کچھ وقتی فائدہ محسوس ہوا لیکن طبیعت مستقل بحال نہ ہوسکی۔

اس سفر کو ماموں صاحب کے علاج کے تعلق سے تو کامیاب نہیں کہا جا سکتا، لیکن ہاں کئی جہتوں سے بہت یادگار رہا، ماموں صاحب کو انتہائی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، بیماری کی وجہ سے ان کے لیے کروٹ لینا بھی مشکل تھا، لیکن ان کی زندگی با مقصد تھی، لہٰذا چندی گڑھ پہنچتے ہی ایک مضمون املا کروایا اور اس کے بعد مطالعہ میں مشغول ہو گئے، رات میں تقریباً تین بجے ہم کو جگا دیا اور فرمانے لگے کہ تیمم کراؤ اور تہجد کی نماز پڑھاؤ، پھر نماز فجر کے بعد بجائے اس کے کہ آرام کرتے تسبیح میں مشغول ہو گئے، روزانہ کا یہی معمول تھا، ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ یہ فتنوں کا دور ہے، اگر قرآن مجید کی آیات اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث میرے سامنے نہ ہوتیں تو آج جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خاص طور پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں جو غلط نظریات پیش کیے جا رہے ہیں ان سے بچنا مشکل ہوتا اور فرمایا کہ ایک صاحب نے ہم سے کہا تھا کہ تمہاری کتاب ''تاریخ اصلاح وتربیت'' کی دوسری جلد ہم شائع کریں گے، لیکن جب انہوں نے کتاب میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ دیکھا تو کہنے لگے کہ اس کو حذف کر دو، ہم نے ان کو کتاب دینے سے انکار کر دیا۔

راقم کے یہ وہ مشاہدات تھے جن کا تصور بھی محال تھا، ان کی زندگی کے یہ آخری ایام تھے، جب مرض اپنے عروج پر تھا، کمزوری کی وجہ سے اعضاء وجوارح جواب دے چکے تھے، خود سے اٹھنے کی بھی سکت نہ تھی، لیکن کبھی ان کی زبان سے ناشکری کی کوئی بات نہیں سنی، بلکہ ہر وقت وہ شکر خدا میں رطب اللسان تھے، عبادت وریاضت، تسبیح وتہجد اور خوف خدا میں گذرے یہ لمحات یقیناً ان کی زندگی کے با مقصد ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔

اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے، درجات بلند فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے۔ آمین!

پاؤ گے نغمہ ریز چمن در چمن مجھے

محمد نجم الدین ندوی
(رفیق دارعرفات تکیہ کلاں، رائے بریلی)

اترپردیش کے اضلاع میں رائے بریلی جو ملک اودھ کا ایک اہم خطہ ہے تاریخی پس منظر اور بلند مقام رکھتا ہے، اس خطہ سے علماء، مشائخ، صوفیہ، اہل سخن اور ارباب سیاست پیدا ہوئے، جن کی بدولت یہاں کی تاریخ روشن ہے، انہی علماء وصوفیہ میں مولانا محمود حسنی ندوی بھی تھے، جن کا ابھی گذشتہ ماہ ۱۲ / اگست ۲۰۲۲ء کو بروز جمعہ انتقال ہوا۔

مولانا کے سانحہ ارتحال کو ہر کسی نے محسوس کیا، ان کے مادر علمی دارالعلوم ندوہ نے بھی اپنے ہونہار فرزند کے داغ جدائی کو محسوس کیا، ادارۂ دارعرفات رائے بریلی نے جس کے وہ نائب مدیر تھے اس جدائی کو بہت محسوس کیا، اور اس کے ترجمان ''پیام عرفات'' میں خصوصی اشاعت کا اعلان کیا گیا، اس کے لئے آنے والے مضامین میں عناوین گوکہ مختلف نہیں مگر امید ہے کہ مضامین میں تنوع ضرور ہوگا، اور مولانا کی زندگی کے مختلف پہلو اور ان کی دینی اور علمی خدمات کا اچھا مرقع ہوگا، محرر سطور نے اس بزم

میں شرکت کو نیکی سمجھ کر کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے، اللہ تعالیٰ مفید بنائے۔

مولانا محمود حسنی جس گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے وہ سادات کا وہ خاندان ہے جس نے برصغیر میں دینی وایمانی اور احسانی دنیا میں عظیم مقام پایا ہے، اور یہ سادات حسنی کا ہندوستان میں واحد مرکز ہے جہاں سے بڑے بڑے اہل اللہ، علماء اور اہل فکر ونظر نے امت مسلمہ اور قوم وملت کی رہبری اور رہنمائی فرمائی، اور خاص طور پر ہند کی دینی اور ملی قیادت کے افراد جہاں سے میسر ہوئے اور عالم اسلام خاص طور پر عالم عربی میں یہاں کے بعض اشخاص وافراد کا بلند مقام ہے، امام وقت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر سید عبدالعلی، مولانا سید محمد حسنی، مولانا سید واضح رشید ندوی اور مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی بیسویں صدی میں اٹھنے والی عظیم ہستیاں ہیں اور یہ ایسے روشن آفتاب ومنور ماہتاب ہیں جن کی روشنیوں سے سب نے روشنی حاصل کی ہے، اس وقت محبوب ملت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کی ذات اقدس برکۃ العصر اور ناظم اجزائے ملت ہے، اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں صحت وعافیت کے ساتھ برکت عطا عطا فرمائے، اور مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی حفظہ اللہ کی ذات گرامی ہمارے لئے سہارا ہے، وہ ندوہ اور پیام انسانیت کے ذریعہ قوم وملت کی رہنمائی فرماتے ہیں اور ملی وقومی کاموں پر گہری نظر رکھتے ہیں اور تحریر وتقریر سے قوم وملت کو فکر وعمل کی صحیح سمت عطا کرتے ہیں۔ انہی میں سے مولانا سید محمد ثانی حسنی ان کے نانا اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے خلیفہ تھے، وہ ندوہ ومظاہر کے فاضل گرامی ومتعدد کتابوں کے مصنف تھے جن کا سیرت ورجال اور تاریخ کی تحریر میں نمایاں اور لائق اتباع انداز ہے، اور اردو دنیا میں تذکروں کی کتابیں اور ماہنامہ 'رضوان' لکھنؤ کے حوالے سے بعد از مرگ زندہ ہیں، مولانا محمود حسنی ندوی انہی کے

نواسے اور ایک عالم دین، نثر نگار، مورخ، تذکرہ نگار اور صوفی انسان تھے۔

مولانا محمود صاحب کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی، انہوں نے تعلیم وتربیت خالص دینی وعلمی ماحول میں پائی، ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں پاکر رائے بریلی کے مدرسہ ضیاء العلوم میں ثانوی تعلیم پائی، دار العلوم میں امام العصر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سرپرستی ونگرانی میں تعلیم وتربیت حاصل کی، سنہ ۱۹۹۲ء میں فضیلت کا امتحان دے کر کامیاب ہوئے، اور اختصاص فی الحدیث کی سند پاکر فارغ التحصیل ہوئے، پھر شعبہ دعوت وفکر اسلامی میں ایک سالہ کورس مکمل کر کے مدرس کی حیثیت سے ضیاء العلوم میں مامور ہوئے، دس سال خالص تدریس میں گزارے، اس کے بعد جزوی طور پر اخیر تک مدرسہ میں پڑھایا، اور اس مدت میں نہ جانے کتنوں کو تعلیم کے ہنر سے آراستہ کیا اور حصول علم میں شاگردوں کی مدد کی۔ آج ان کے شاگرد کتنے ہیں اور کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں اور کیا کرتے ہیں' مجھ کم سواد کے لئے اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے، تاہم لکھنؤ اور رائے بریلی میں جنازہ میں شریک علماء وطلبہ سے سرسری سا اندازہ ضرور ہوجاتا ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد مولانا رحمۃ اللہ علیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے نکلنے والے رسالہ ''تعمیر حیات'' میں معاون مدیر کی حیثیت سے وابستہ بلکہ مامور ہوئے، کچھ عرصہ بعد ان کو نائب مدیر بنایا گیا، تادم اخیر اس ادارہ میں بخوبی ذمہ داری انجام دیتے رہے، انھوں نے تعمیر حیات کے متعدد خصوصی اشاعتوں میں مضامین ومقالات کے حصول اور ان کو ترتیب دینے میں اہم رول ادا کیا، مفکر اسلام نمبر، مولانا واضح رشید حسنی نمبر، مولانا حمزہ حسنی نمبر اور مفتی محمد ظہور ندوی نمبر کو جامع انداز میں پیش کرنے کی کوشش میں ان کا اہم حصہ ہے۔

مولانا محمود صاحب کے تحریک دیوبند و مظاہر اور تحریک علی گڑھ کے موجودہ اہم اصحاب سے گہرے روابط تھے، انھوں نے ہر جگہ ندوہ کی ترجمانی کی اور اس کا تعارف کرایا، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی مدظلہ اور ندوۃ العلماء سے دیگر لوگوں کو جوڑنے کی فکر و سعی کی، اور ندوہ کے متعلق لوگوں میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا اور تبلیغی دعوت کے موجودہ ذمہ داران و امیر دعوت مولانا محمد سعد صاحب کاندھلوی، علماء واصحاب کاندھلہ، علمائے مظاہر، مشائخ عصر اور ندوۃ العلماء لکھنؤ و تکیہ کلاں رائے بریلی میں مولانا ہی رابطے کی کڑی تھے، آپ وہاں کے علماء اور مشائخ سے اچھا باہمی ربط پیدا کرنے میں مؤثر کردار اور پہلو رکھتے تھے، شاہ وصی اللہ الٰہ آبادی کے سلسلے اور خانقاہ تھانہ بھون و رائے پور کے سلسلے کے ایک بہترین ترجمان تھے، افسوس کہ یہ خوبیاں ان کے ساتھ رخصت ہو گئیں۔

ان کی ایک صفت یہ تھی کہ شاگردوں اور دینی مدارس کے طلبہ کو لکھنے پڑھنے کے کاموں میں لگاتے اور تحریر کے میدان میں آگے بڑھنے کا حوصلہ بڑھاتے تھے، ان کے شاگردوں میں محرر حروف ذاتی طور پر کئی سے واقف ہے جنہوں نے مولانا کی راہنمائی اور ان کی تربیت کے نتیجہ میں قلم پکڑنا سیکھا اور اب وہ کئی کئی کتابوں کے مصنف ہیں، مولانا کو اپنے اہل تعلق اور شاگردوں کی ترقی سے خوشی ہوتی تھی اور لوگوں کے مابین برملا اس کا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔ مولانا میرے استاذ تو نہیں تھے مگر استاد کے درجہ میں تھے، وہ راقم سطور کے لئے نہایت قابل احترام تھے کیوں کہ وہ سادات میں تھے جن کے خاندان کا فیض یہ ہے کہ برصغیر میں اس کی بدولت ایمان کی باد بہاری چلی، اور میرا صوبہ بھی اس فیض سے محروم نہیں۔ نیز اس لئے بھی ان کے چھوٹے بھائی مولانا مفتی سید مسعود حسنی ندوی میرے مشفق و محسن استاذ ہیں، جو

دارالعلوم کے عالی درجات میں درس وتدریس کے ساتھ دارالافتاء والاحکام ندوۃ العلماء لکھنؤ میں افتانویسی کی خدمت انجام دیتے ہیں، الحمدللہ محرر سطور کوان کی شفقتیں اور محبتیں طالب علمی کے زمانہ ہی سے حاصل ہیں، وہ مجھ جیسے کم سواد وتہی دامن کی ہمیشہ حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، اللہ سے دعا ہے کہ استاد محترم کو صحت وعافیت کے ساتھ عمر دراز عطافرمائے اوران کا فیض عام وجاری فرمائے۔

مولانا محمود حسنیؒ طالب علمانہ عہد سے ہی مشائخ واساتذہ بالخصوص حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ، مولانا واضح رشید حسنی، مولانا عبداللہ حسنی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی سرپرستی ونگرانی میں تحریر وانشاء کی صلاحیتوں کوجلا بخش کر لکھنے پڑھنے کے کاموں میں سرگرم رہے، انہوں نے دارالعلوم کے مہمان خانہ میں رہ کر تعمیر حیات کی ذمہ داری کے ساتھ اپنے خاندان کے بزرگوں کی کتابیں مرتب کیں، تصنیف وتالیف میں مصروف رہے اور مقالات کی تدوین میں وقت گزارا، ان کا محبوب مشغلہ بزرگوں کا تذکرہ اوراسلامی شخصیات کی سیرت وکارناموں کا بیان اوران کوتحریری شکل میں مدون کرنا تھا، ان کی تصنیفات اسی سلسلے کا امتداد وپھیلاؤ ہیں، بادشاہوں میں سلطان ٹیپو شہید کی سیرت وخدمات کومرتب کرکے پیش کیا، علماء میں انہوں نے مولانا عبدالباری ندوی کی سیرت وکاموں پرایک کتاب لکھ کر نئی نسل اور تعلیم یافتوں کو بتایا کہ عصر جدید کے الحاد وفلسفے کا مقابلہ علمی اور منطقی و معقولی انداز میں اس طریقہ پر کیا جائے کہ خود فلسفہ اسلام کی روشنی میں داخل ہوجائے۔ بزرگوں میں حضرت شاہ ابرار الحق ہردوئی اور مولانا سید محمد ثانی حسنی کی زندگی، فکراور عمل لکھ کر نسل نوکوان بزرگوں کی زندگی کواپنانے کی دعوت دی اور تبلیغی جماعت کے امیر مولانا زبیرالحسن کاندھلوی کی دینی خدمات وزندگی پرایک جامع

کتاب لکھی، جس میں ان کی جامع دینی دعوت کی کارگزاری آگئی ہے اور دعوت کے کام میں لگنے والوں کے لئے رہبر کتاب بن گئی۔ شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوری کی سیرت وخدمات پر اپنے تحریری سرمایہ کو ایک ضخیم کتاب میں شائع کروایا، جس میں شیخ کی محدثانہ شان اور علم وفن میں کامل عبور بلکہ امامت ظاہر ہوتی ہے، اہل علم خاص طور پر فن حدیث سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ تحفہ در بے بہا ہے۔ مولانا عبدالباری فکردے ندوی پر ایک کتاب ترتیب دے کر ان کی دینی ودعوتی کاموں کو اجاگر کیا اور نسلِ نو کو دعوت واصلاح، تعلیم وتربیت اور تعمیر ایمان وعمل کے میدان میں ان کی مذکورہ خوبیوں کو اختیار کرنے کی قلم سے دعوت دی۔

ماضی قریب کے ایک عالم وداعی مولانا عبداللہ حسنی ندوی کی سیرت وفکر کا جائزہ لیا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فقیہ الدعاۃ وداعیۃ الفقہاء ہیں، ہندوستان کے طول وعرض میں ان کی دعوتی سرگرمیوں سے حیرت انگیز خاموش انقلاب آرہا تھا، مگر حکمت الٰہی راز سربستہ ہے جس سے کوئی انسان واقف نہیں، وہ اپنے مالک حقیقی سے جاملے، تو مولانا کی عظیم شخصیت وخدمات اور علمی ودعوتی کاموں پر مولانا محمود حسنی ندوی نے ایک کتاب ''سیرت داعی اسلام'' مرتب کردی، یہ مولانا کی سیرت وافکار پر ایک ہمہ پہلو کتاب ہے جس زمانہ میں مولانا اس کی تالیف وتدوین میں مصروف تھے تو راقم کو یاد کیا اور کہا کہ ''مولانا عبداللہ حسنیؒ کا منی پور کا ایک اہم سفر ہوا تھا، تم وہاں کے فضلاء سے سفر کی روداد حاصل کرو اور جلد از جلد منی پور کا سفرنامہ لکھ کر لاؤ، زیر تدوین کتاب میں اس کی شمولیت ضروری ہے۔'' راقم نے اس حکم کو اپنے لیے سعادت سمجھا اور سفر کی مختصر روداد لکھ کر مولانا کی خدمت میں پیش کردی، مولانا کی شفقت کہ میری تحریر کتاب میں شامل ہوئی، جس میں سفر کی روداد کے ساتھ وہاں کے دینی ماحول کی

عکاسی اور مسلمانوں کا تاریخی پس منظر بھی بتایا گیا ہے۔

جب راقم کی مرتب کردہ ایک کتاب منظر عام پر آئی تو مولانا نے بہت ہی خوشی کا اظہار کیا اور میری حوصلہ افزائی کی، خاتون منزل لکھنؤ میں ان کے چھوٹے بھائی استاد محترم مفتی سید مسعود حسنی ندوی کی خدمت میں حاضر ہوا، تو مولانا سے بھی ملاقات ہوگئی، یہاں مولانا نے پھر کتاب چھپنے پر مبارک باد دی اور پیدل گھر سے مکتبہ اسلام لے گئے جہاں دیر تک بیٹھ کر گفتگو فرماتے رہے پھر امین آباد کی ایک دوکان پر لے گئے، بہت کچھ اصرار کر کے کھلایا، رکشہ والے کو خود بلایا، بٹھایا اور ساتھ ہی باصرار کرایہ بھی دیا، اس دوران میں بہت کچھ رہنمائی بھی فرماتے رہے اور دوران گفتگو میں فرمایا کہ ''مولانا شبلی وسلیمان کے اسلوب کو اپنانے کی محنت کرنی چاہیے اور فکر علی (حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ) کی اساس پر شخصیت کی تعمیر وتشکیل کی فکر کرنا چاہیے۔''

ایک صدی سے مولانا کا خاندان ندوہ ودارالعلوم کا قلب وقالب ہے، جس کی وجہ سے جس قدر اس کی تاریخ سے واقفیت کا موقع ملا، وہ کسی دانا سے پوشیدہ نہیں، تحریک ندوۃ العلماء اور اس کے دارالعلوم کی تاریخ برصغیر ہند وپاک کے قیمتی سرمایہ کی داستان ماضی ہی نہیں بلکہ عہد ماضی کی سرگشت سے تعمیر عہد استقبال کا خاکہ اور خواب ہے، اب تک اس کی دو جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں ایک مولانا محمد اسحاق خان جلیس ندوی کے قلم کا فیض ہے جب کہ دوسری جلد ان کی وفات کے بعد ڈاکٹر شمس تبریز خان نے لکھ کر اسلامیان ہند کے سامنے پیش کردی۔ تیسری جلد کی ترتیب وتدوین کے لئے مولانا نذرالحفیظ ازہری ندوی مامور ہوئے، انہوں نے کام شروع کردیا تھا مگر قضا نے مہلت نہ دی، ان کی وفات کے بعد تاریخ ندوہ لکھنے کی ذمہ داری ندوۃ العلماء کی مجلس نظامت نے مولانا محمود حسنی ندوی کو سپرد کی مگر اس کی تکمیل سے قبل

اپنے حقیقی مالک کے حضور حاضر ہو گئے۔ ہمیں امید ہے کہ محبوب ملت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کی سرپرستی میں جلد ہی یہ ادھورا کام پورا ہو جائے گا اور ملت کو اسلامی ہند کو اس عظیم دینی اور علمی مرکز کی تاریخ سے روشناس ہونے کا موقع میسر آئے گا جس میں موجودہ حضرت ناظم صاحب مدظلہ العالی جن کی ذات بابرکت سے بالواسطہ اور بلا واسطہ مسلم تہذیبی و علمی تاریخ کا تسلسل اور دینی تاریخ وابستہ ہے کے عہد تک کی ہمہ جہت و ہمہ گیر ترقی و تعمیر کا عکس جمیل ہوگا۔

مولانا محمود حسنی ندویؒ کے قابل قدر اور لائق تحسین کام 'تاریخ دعوت و اصلاح' کی تحریر و ترتیب ہے، اس سلسلہ کی دو جلدیں ان کی زندگی میں طبع ہو کر شائع ہو چکی ہیں، پانچ حصوں میں اس کو مکمل کرنا چاہتے تھے، انھوں نے اس کا پورا خاکہ تیار کر لیا تھا، تیسری جلد کی تیاری میں مصروف تھے، چوتھی اور پانچویں جلدوں کی فکر تھی اور یہ خواہش بھی تھی کہ کتاب کا یہ مکمل سلسلہ ان کی زندگی میں شائع ہو، مگر ''تم ہی سو گئے داستان کہتے کہتے''۔

لکھنا مولانا محمود حسنی کی طبیعت ثانیہ بن گیا تھا، وہ ہر وقت کسی کتاب کی تحریر و تسوید یا تدوین و ترتیب میں منہمک ہی نظر آئے، ان کی پہلی کاوش ''سلاسل اربعہ'' ہے، جس میں امام وقت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے سلسلے کی قدسی صفات ہستیوں کے شجرات طیبہ ہیں، ساتھ ہی حضرتؒ کے ارشادات و ہدایات اور افادات ہیں، جس میں مرتب نے سلاسل اربعہ کی خصوصیات و تعلیمات اور ان کی تمثیل اور چار نسبتوں کا رنگ، اور الفاظ بیعت ذکر کیا ہے، یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے مگر وقیع اور جامع ہے، اور بڑی خوبی اور سلیقہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔

مولانا محمود حسنی کی ابتدائی کاوشوں میں ''فرشتہ صفت انسان'' کی حواشی کے

ساتھ تدوین وترتیب ہے، اس میں حضرت ڈاکٹر سید عبدالعلی کا تذکرہ نہایت اختصار سے مولانا عبدالباری ندوی نے لکھا، ڈاکٹر صاحب کی شخصیت متوازن اور عصری ودینی علوم کے جامع تھی اور فکر ندوہ کی عملی تصویر وپیکر مجسم تھے، مولانا محمود حسنی نے اس رسالہ کو جامع انداز میں مرتب کیا، حضرت مولاناؒ کی تحریر، حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کی تقریظ وتعارف اور مرتب کے جابجا حواشی وتعلیقات سے رسالہ کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی مرحوم (دہلی) کے مکتوب کا ایک حصہ آگے میں درج ہے جس کا تعلق رسالہ ومرتب سے ہے، موصوف لکھتے ہیں:

”رسالہ پاکر بڑی خوشی ہوئی اور اسے پڑھ کر اور خوشی ہوئی، مبارک باد، صفحہ ۲۶ تک جو مضامین شامل ہیں اور جن میں حضرت مولانا مدظلہ اور مولانا سید محمد رابع صاحب کی قابل قدر تحریریں بھی ہیں، ان سے رسالے کی قدر وقیمت خاصی بڑھ گئی ہے، اور مرحومین مولانا عبدالباری صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے بارے میں مفید معلومات بھی فراہم ہوگئی ہیں، آپ کے شوق، توجہ اور محنت سے ۸۰ صفحے کا یہ رسالہ ایک ایسی علمی خدمت ہے جو ڈاکٹر صاحب پر ایک کتاب کی بنیاد بن سکتی ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، مناسب سمجھیں تو ہمت کیجئے، مواد تو کافی آپ کے پاس ہوگا، خصوصاً مکتوبات کا۔

آپ کے حاشیے بھی بہت مفید اور معلومات افزا ہیں، کئی باتیں مجھے نئی معلوم ہوئین، دراصل ایسے مضامین پر اگر حواشی نہ ہوں تو قارئین اور خصوصاً نئی نسل کے لئے مضمون کی افادیت کم ہوجاتی ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی کو شادمانیوں سے بھر دے کہ آپ نے یہ بہت اچھا کام کیا۔“

بہرحال مولانا محمود حسنیؒ لکھنے پڑھنے کے آدمی تھے، علم وجستجو میں منہمک رہتے

تھے، اسی لئے وہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے، ان کی تالیفی وتدوینی کاوشوں کی تعداد دو درجنوں سے زائد ہے۔ ان کی تحریر وانشا سے دلچسپی اس حد تک تھی کہ اخیر عمر میں شدید مرض کے ایام میں ”ہدیۂ درود وسلام“ کے نام سے ایک قیمتی سوغات تیار کردی، بیماری کے دن لکھنؤ کے ایک اسپتال میں امید وبیم میں رہے، مگر افسوس کہ وہ ایک لمبی بیماری اور تکلیف کے بعد جمعہ کے مبارک دن، اگست کی بارہ تاریخ اور صبح کے ساڑھے نو بجے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، اللہ سے دعا ہے کہ ان کے ساتھ خصوصی معاملہ کرے، ان کی نیکیوں کو شرف قبولیت عطا کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!

مولانا کی ہمہ جہت تحریری وتالیفی اور دینی وعلمی اور احسانی خدمات کو جب دیکھتے ہیں تو مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کی بات یاد آتی ہے کہ

”عزیزی مولوی محمود حسن صاحب سلمہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی آغوش تربیت میں پلے ہیں، قرآن مجید کی معجزاتی تعبیر میں ”وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ“ کا مصداق یہ عزیز محمود حسن سلمہ ہیں' جو حضرت کے حقیقی بھانجے مولانا محمد الرابع کے بڑے مرحوم بھائی مولانا محمد الثانی کے نواسے ہیں، دادیہال بھی اسی خاندان کی شاخ ہے اور نانیہال کی ثروت بھی ان کو بھرپور ملی۔“

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

محمد ارمغان بدایونی ندوی
(رفیق دارِعرفات، تکیہ کلاں-رائے بریلی)

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ جامع صفات شخصیت تھے، سیر وسوانح کے مہر مبیں، علم وفن کی آبرو، تصوف وسلوک کے نیر تاباں، اسلاف کی عظمت رفتہ کے امین وپاسدار، چمنستان حسنی کے گل سر سبد، دار العلوم ندوۃ العلماء کے قابل فخر فرزند، اکابر ملت کے منظور نظر، مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کے دست وبازو، تصنیف وتالیف کے شہ سوار اور قلم کے دھنی، درس وتدریس کے عاشق، نسل نو کے معمار، ملنسار، خوددار، باوقار، بندہ پرور اور بندہ نواز!

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ نے اپنی مختصر مدت حیات میں بڑے اہم کارنامے انجام دیے، مگر اخفائے حال ان کا ایسا امتیازی وصف تھا جس نے ان کو ہمیشہ نام ونمود کے شائبہ سے بھی دور رکھا، ان کی حیثیت بنیاد کی سی تھی جو نظر نہیں آتی، مگر پوری عمارت اسی پر منحصر ہوتی ہے، اللہ نے انہیں اخلاص کی دولت سے خوب نوازا تھا، یہی وجہ تھی کہ ان کا ہر کام مقبول ونافع ہوتا، دار العلوم ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد مدرسہ

ضیاء العلوم رائے بریلی میں وہ درس وتدریس سے وابستہ ہو گئے، لیکن انہوں نے محض رسمی تدریس پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ طلبہ کی علمی سطح کو بلند کرنا، ان کی فکری رہنمائی کرنا اور ان کی بہترین تربیت کرنا مولانا کی زندگی کا ایک اہم مقصد بن گیا تھا، وہ چلتے پھرتے طلبہ پر نگاہ رکھتے، ان کی قابل اصلاح باتوں کو نوٹ کرتے اور انہیں تنبیہ کرتے، اگر کسی طالب علم سے انہیں مستقبل میں زیادہ خیر کی امید ہوتی تو اس پر خصوصی توجہ دیتے، بزرگوں سے ملنے کا مشورہ دیتے، خود ہاتھ پکڑ کر حضرت مولانا سے ملاقات کراتے، کتابوں کے مطالعہ کا شوق دلاتے، پھر آہستہ آہستہ مضمون نویسی پر آمادہ کرتے اور کھلے دل سے اس کی ہمت افزائی کرتے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی وفات کے بعد وہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کی خدمت کے واسطہ ندوہ منتقل ہو گئے، جہاں وہ تعمیر حیات کے معاون مدیر اور پھر نائب مدیر بن گئے، لیکن ان کے ندوہ کا قیام بھی صرف اپنی مفوضہ ذمہ داریاں انجام دینے کی حد تک نہ تھا، بلکہ اس عالمی دانش گاہ میں ان کی نگاہ انتخاب ذہین وفطین طلبہ پر رہتی، حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے والے زائرین پر رہتی اور وہ اپنی نگاہ بصیرت سے لمحوں میں یہ اندازہ کر لیتے کہ کون شخص مستقبل میں امت کے لیے نافع ہو سکتا ہے اور کس نوعیت سے نفع پہنچا سکتا ہے، لہٰذا اگر کسی کا مزاج تصنیف وتالیف سے ہم آہنگ ہوتا تو اس کی رہنمائی فرماتے، اگر کوئی خطابت کا شیدائی معلوم ہوتا تو اسی میدان میں اس کو لگانے کی کوشش کرتے، اگر کوئی دعوتی اور تحریکی مزاج کا ہوتا تو اسی کے مطابق اس کی رہنمائی کرتے، اگر کوئی تصوف وسلوک کا طالب ہوتا تو اس کی بھی رہنمائی کرتے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ندوۃ العلماء حاضر ہونے والے اور حضرت مولانا دامت برکاتہم سے تعلق رکھنے والے تقریباً سبھی

لوگ نہ صرف مولاناؒ سے واقف تھے بلکہ ان کے ممنون کرم بھی تھے۔

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کا شمار ان کی زندگی میں نہ چوٹی کے اکابر ملت میں ہوا اور نہ ہی تصوف وسلوک کے اساطین میں، نہ وہ بڑی بڑی درس گاہوں کے ناظم وسرپرست تھے اور نہ ہی کسی تحریک کے عہدہ دار، نہ وہ بلند پایہ رسمی خطیب تھے اور نہ ہی کسی تنظیم یا جماعت کے ترجمان، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت تصوف وسلوک کے طالبین، اداروں، تحریکوں، تنظیموں، جماعتوں، خطیبوں اور مصنفوں کو غذا فراہم کرنے والی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک ایسے معزز اور قابل فخر خانوادہ کے فرزند تھے جس کے اندر ہر دور میں مصلحین ومرشدین پیدا ہوتے رہے ہیں، اگر وہ چاہتے تو یقیناً اپنی کم عمری کے باوجود اکابر ملت کی فہرست میں سرفہرست ہوتے۔ تصوف وسلوک کے راز ہائے سربستہ ان کے گھر کی نعمت تھی اور وہ اس کی گہرائیوں وپنہائیوں کے ماہر غواص تھے، لیکن انہوں نے کبھی بھی اس کا اظہار نہ کیا۔ بڑی بڑی درس گاہوں اور جامعات کے ذمہ داران ان کے ساتھ کچھ دیر بیٹھنا برکت سمجھتے تھے اور عقیدت مندانہ ان سے نیاز حاصل کرتے تھے، مگر انہوں نے اپنے بڑوں کے سامنے خود کو کبھی اس لائق نہ سمجھا کہ وہ مدارس وجامعات کی سرپرستی فرمائیں۔

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ عزیمت کی منھ بولتی تصویر تھے، ''قربانی'' کا لفظ جو کثرت استعمال سے بے معنی سا ہو گیا ہے، مولانا اس لفظ کے حقیقی مصداق تھے، مال وزر، عہدہ ومنصب اور جاہ وثروت کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا، عالی شان بنگلے، بیش قیمت موٹریں اور ترقی یافتہ وسائل کی سہولت اختیار کرنا ان کے لیے ناممکن نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود ہمیشہ ان پر تواضع غالب رہی، دنیا کی محبت سے ان کا دل خالی رہا اور عزیمت پر عمل کے جذبہ میں اضافہ ہی ہوتا گیا، حتی کہ بیماری کے بالکل

آخری ایام میں بھی انہوں نے اپنی مشغولیات سے منھ نہ موڑا اور بستر مرگ پر ''میرے بے زبان اساتذہ'' کے عنوان سے تقریباً ۸۰؍صفحات پر مشتمل ایک رسالہ قلم بند کردیا، جوان کے آغاز عمر سے لے کر اخیر عمر تک کے مطالعاتی سفر کا نچوڑ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمود حسنی ندویؒ کی پوری حیات اس شعر کی حقیقی آئینہ دار تھی

ہمیں دنیا سے کیا مطلب مدرسہ ہے وطن اپنا
مریں گے ہم کتابوں پر ورق ہوگا کفن اپنا

سچی بات یہ ہے کہ لکھنا پڑھنا ہی مولانا کی زندگی کا واحد مشغلہ بن گیا تھا، سفر وحضر ہو، خوشی کا موقع ہو یا غم کا، مہمانوں کا ہجوم ہو یا جلسے اور سیمینار ہوں، غرض ہر وقت علمی مشغولیات اور علمی باتیں ہی ان کی دلچسپی کا موضوع ہوتیں، ان کی نجی مجلسوں میں کاروبار اور دنیاداری کی باتیں نہ ہوتیں، سیاسی حالات پر تبادلہ خیال نہ ہوتا، بلکہ ان کی ہر مجلس میں بزرگوں کا تذکرہ ہوتا، اسلاف کے کارناموں کا بیان ہوتا اور قدیم سے قدیم مستند تاریخی روایات سے استشہاد ہوتا، جس کو سن کر بعض اوقات آدمی محو حیرت رہ جائے، چند ساعت ان کے پاس بیٹھ کر محسوس ہوتا تھا کہ کئی صفحات کے عرق ریزی سے مطالعہ کا فائدہ ان کی ایک مجلس سے ہوگیا، انہیں نہ کسی سے ذاتی دشمنی تھی، نہ بغض اور نہ کسی سے کوئی شکایت، اگر وہ کسی سے ناراض بھی ہوتے تو اس کا بنیادی سبب یہی ہوتا کہ فلاں شخص قوم وملت کے لیے بڑے نفع کا ہے، مگر وہ اپنی صلاحیتوں کو درست جگہ نہیں لگاتا۔

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ پر فکر آخرت کا بڑا غلبہ تھا، اگر کبھی کسی سے کوئی شکایت یا ناراضی ہوجاتی تو فوراً معاملہ صاف کرلیتے اور فرماتے: موت کا کوئی بھروسہ نہیں ہے، ہر ایک کو اپنی قبر میں سونا ہے، ہم بلاوجہ کسی سے کیوں دل میں میل رکھیں۔ اسی طرح اگر کوئی نیک کام کرنے کا موقع ہوتا یا کچھ لکھنے پڑھنے کی بات ہوتی تو ان کی

عادت تھی کہ جس لمحہ بات ہوتی اسی وقت اس کو انجام دیتے، بعد کے لیے مؤخر کرنے کے کبھی روادار نہ رہے، وہ اکثر کہتے کہ موت کا کوئی پتہ نہیں، کب بلاوا آجائے، اس لیے جو وقت ہے اس کو غنیمت جان کر زیادہ سے زیادہ کام کرلو۔ اگر کوئی رقم ان کے پاس آجاتی تو اس کو اس طرح تقسیم کرنے کے لیے فکرمند ہوتے جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ ان کے سر پر رکھ دیا گیا ہو، اس میں بھی ان کا نقطہ نظر یہی ہوتا کہ خدا جانے کب اللہ کے حضور حاضر ہونا پڑ جائے اور ایسا نہ ہو کہ کسی کا کوئی حق ہمارے اوپر باقی رہ جائے۔ الغرض فکر آخرت کا انہیں اس قدر استحضار تھا کہ انہوں نے اپنی ذات کو کبھی بھی کچھ سمجھا ہی نہیں اور نہ ہی کبھی خود کو مقدم کرنے کی کوشش کی، بلکہ ہمیشہ اخلاص، تصحیح نیت اور تزکیہ نفس کی سعی پیہم میں لگے رہے۔

مولانا کے انتقال سے ٹھیک ایک ہفتہ قبل جمعہ کے دن عیادت کے لیے اس گنہگار کی حاضری ہوئی، مولانا آئی سی یو میں ایڈمٹ تھے اور سخت علیل تھے، صرف سیال مادہ غذا کے بطور پیٹ میں جانا مشکل تھا، تاہم زبان پر کوئی حرف شکایت نہ تھا، چہرے کی سلوٹوں سے کسی بھی طرح کی پریشانی کے آثار ہویدا نہ تھے، بلکہ بہت سکون واطمینان سے بیڈ پر لیٹے تھے، جب شدت تکلیف سے کراہنے کی آواز نکلتی تو ''اللہ اللہ'' کے ساتھ نکلتی، اس دن طبیعت میں کچھ بہتری معلوم ہوتی تھی، مگر اگلے ہی دن مرض نے شدت اختیار کرلی، یہاں تک کہ وینٹی لیٹر کی نوبت آگئی اور چند ہی دنوں بعد آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی، تھوڑی ہی دیر میں وفات کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی اور اہل تعلق کے حلقہ میں غم وماتم کی صف بچھ گئی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے نیک اعمال قبول فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل دے۔ آمین!

نقوشِ تاباں

محمد نفیس خاں ندوی
(رفیق دارِ عرفات، تکیہ کلاں-رائے بریلی)

انسان کی عظمت وبلندی اوراس کی محبوبیت کی تین علامتیں بیان گئی ہیں؛ کردار کی بلندی وپاکیزگی کہ وہ مستحق تقلیداور قابل اعتراف ہو۔تحریر کی دلکشی ورعنائی کہ وہ شوق مطالعہ کومہمیز کرے اورعلم وعمل کی فراوانی کہ ابر رحمت بن کر زندگیوں پر چھا جائے۔جوعظیم ہستیاں اس معیار پرکھری اترتی ہیں ان میں ایک روشن نام مولانامحمود حسن حسنی ندویؒ کا بھی ہے۔

مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ ایک ہمہ رنگ و ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے،اگرکوئی ان کی ہشت پہل شخصیت کوایک فقرہ میں بیان کرنا چاہےتو ناگاہ اس کی نظرقوس وقزح کے نظارے میں کھوجائے گی؛ مذہب واخلاق،تاریخ وتصوف،اورادو سلوک اورسیرت وسوانح کے متوازن خمیر سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی تھی۔انھوں نے قرطاس ابیض پر اپنی جودت طبع ، ذہانت وفطانت اور دینی وتاریخی ذوق سے ایسے نقش ونگار بنائے جوجاوداں ہوگئے، یہی وجہ ہے کہ ان کے شخصی محاسن اور علمی

وادبی خدمات کو نہ صرف زندگی میں سراہا گیا بلکہ موت کے بعد بھی خراج تحسین کا سلسلہ جاری ہے۔

مولانا مرحوم کا اولین چشمۂ فیض خود ان کا خاندان ہے جو دورِ شاہ جہانی کے بزرگ قطب الاقطاب حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ کی جانب منسوب ہے، جس کے بعض افراد سلاطین کے درباروں میں تو بعض فقر وتصوف کی خانقاہوں میں ممتاز تھے، بعض درس وتدریس کی چٹائیوں پر اور بعض تصنیف وتالیف کی کی مسندوں پر جلوہ آرا تھے، اس خاندان کی علمی ودعوتی سرگرمیاں صدیوں سے قدر واعتبار کی نگاہوں سے دیکھی جاتی رہی ہیں اور آج بھی یہاں کے کہنہ مشق علماء ودانشوران اور جواں سال اصحابِ دانش وبینش کی علمی کاوشیں دنیا بھر میں لوگوں کو فائدہ پہنچا رہی ہیں، مولانا اسی خانوادۂ علم وعمل کے چشم وچراغ تھے۔ خاندان کی ادب پرور فضا، علماء وصلحاء کے علمی وروحانی مشاغل، اور باطنی علوم کا مطالعہ ایسے عوامل تھے جنھوں نے مولانا کی جوہر خداداد کو نکھارنے اور سنوارنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

روایتی مکتب پھر خاندانی مدرسہ ضیاء العلوم میں ابتدائی تعلیمی مراحل پورے ہوئے بعد ازاں دار العلوم ندوۃ العلماء سے علوم شرعیہ کی تکمیل کی اور علوم حدیث میں اختصاص پیدا کیا۔

قلم وقرطاس سے ان کا رشتہ بہت قدیم ومضبوط اور خاندانی تھا، سرزمین ہند کی مردم ساز شخصیت مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی گود میں وہ پلے بڑھے تھے، ان کی کیمیا اثر صحبت اور بے مثال تربیت نے جہاں ان کی قلمی صلاحیتوں کو جلا بخشی، وہیں ان کے زرخیز ذہن کی فکری آبیاری بھی کی، چنانچہ دوران تعلیم ہی مولانا نے اپنا تحریری سفر بھی شروع کر دیا تھا، پابندی سے ڈائریاں لکھتے اور ہر چھوٹی

بڑی، ضروری غیر ضروری باتیں محفوظ کر لیتے، ممکن ہے اس وقت یہ ڈائریاں ناقابل التفات سمجھی جاتی رہی ہوں، لیکن اہل قرابت جانتے ہیں کہ بعد کے دنوں میں نہ جانے کتنے اہل قلم نے انہیں ڈائریوں سے خام مواد حاصل کیا ہے! مولانا تحفے میں بھی ہم شاگردوں کو ڈائری ہی دیا کرتے تھے، اور اس کے اہتمام کی تلقین کرتے تھے۔ کہا کرتے کہ ڈائری پابندی سے لکھا کرو، بڑے بڑے اہل قلم نے اپنا تحریری سفر اسی طرح شروع کیا ہے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد جب آپ نے میدان عمل میں قدم رکھا تو قلم بردار تھے، مختلف رسائل جرائد میں مضامین شائع ہونے لگے تھے، اور ایک منجھے ہوئے مضمون نگار کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے۔

مولانا کو لکھنے کے لیے کسی اہتمام کی ضررت نہیں ہوتی بلکہ باتیں بھی کرتے جاتے اور لکھتے بھی جاتے، چائے کی پیالی ہاتھ میں ہوتی، چسکی پہ چسکی لیتے اور لکھتے جاتے، کبھی بیچ میں کچھ عرض بھی کر دیتے، جو لکھتے وہ حاضرین بھی کو سناتے جاتے، اس طرح ایک ہی مجلس میں کئی کئی کام ایک ساتھ ہوتے۔

نثر لکھنا ان کے لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا آبشار کے لیے بہنا، بے تکان اور بے تکلف لکھتے، اور ہمیشہ قلم برداشتہ لکھتے، نہ جگہ کی پابندی نہ وقت کی قید، نہ کوئی دفتر نہ میز کرسی، چلتے پھرتے بھی لکھتے، بس وٹرین میں بھی لکھتے، دن کے کسی بھی پہر، رات کے کسی بھی لمحہ وہ لکھنے پڑھنے کے لیے مستعد رہتے، یہی ان کا مشغلہ تھا اور یہی ان کی طبیعت تھی، ذہن نہایت صاف تھا، اول ہی وہلہ میں بے کج و پیچ حقیقت کی منزل مقصود تک پہنچ جاتے، تیر نظر مسائل و مشکلات کے حل میں ہمیشہ نشانہ پر بیٹھتا تھا، دماغ اتنا سلجھا تھا کہ کتنا ہی پیچیدہ مسئلہ ہو اس کی اصل تہہ تک پہنچ جاتے، اگر مناظرہ پر اتر آتے تو کیسی ہی غلط بات ہو اس کی ایسی عمدہ عمدہ دلیلیں پیش کرتے سامنے والا

ساکت ہوجاتا اور یقین کرلیتا کہ یہی مولانا کی اصلی رائے ہے مگر کچھ ہی وقف بات اس کو اصلیت سمجھا دیتے۔

حافظہ بلا کا ملا تھا، طویل طویل مضامین چند منٹوں میں لکھ ڈالتے، وفات سے چند ماہ قبل جب بیماری میں شدت تھی، معذوری بڑھ گئی تھی، پیروں میں اس قدر ورم تھا کہ ازخود حرکت دینا بھی ممکن نہ تھا، جب مایوسیاں بڑھنے لگتی ہیں اور انسان مختلف اندیشوں میں گرفتار ہوجاتا ہے، انھوں نے بستر مرض پر ہی کئی رسالے مرتب کردیے اور تقریباً سو صفحات میں اپنی تعلیمی سرگزشت کو کاغذ پر منتقل کردیا۔ زندگی بھر ہزاروں صفحات لکھ ڈالے، رضوان، پیام عرفات، تعمیر حیات، ملک و بیرون ملک کے دسیوں رسائل و جرائد کی فائلیں گواہ ہیں کہ ان کے قلم نے مختلف موضوعات پر بھر پور علمی وفکری غذا فراہم کی ہے۔

قدرت نے انھیں ایک خاص دماغی سانچہ میں ڈھالا تھا، وہ ایک نہ تھکنے والی روح اور جہد مسلسل والا جسم تھے، ان کے یہاں آمد ہی آمد تھی آورد کا نام نہیں، انھوں نے بہتیرے موضوعات پر لکھا اور خوب لکھا: اصلاحی مضامین، فکری مضامین، وفیات، اخباری رپورٹیں، ریڈیائی تقریریں، تعارف وتبصرے، سفرنامے غرض کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا، البتہ ان کا خاص ذوق تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کا تھا، وہ صاحب اسلوب سوانح نگار و تذکرہ نگار تھے، ان کا قلم نہایت محتاط، مرنج و مرنج، اور طرز ادا نہایت صاف و سہل اور رواں تھا، انداز تحریر زندگی کے حقائق سے مربوط تھا، شگفتگی ترتیب کلمات سے پیدا کرتے لیکن اس طرح کہ عبارت آرائی کا گمان نہ ہو اور لہجہ کی صداقت مجروح نہ ہونے پائے۔ ان کی سوانح نگاری میں متانت کے علاوہ وضاحت اور منطقی زور تھا، استدلال کو قوی تر بنانے کے لیے وہ تفصیل سے گریز نہیں کرتے، کوشش یہی

ہوتی ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں طول کا احساس بھی ہوسکتا ہے لیکن جب مقصد کی وکالت کرنا ہو تو طول سے بچنا ممکن نہیں۔

زبان وادب کے کسی نقاد سے اگر پوچھا جائے کہ سوانح نگاری کا بہترین اسلوب کیا ہے تو شاید یہی جواب دے کہ ایسا طرز تحریر کہ پڑھنے کے بعد قاری یہ کہنے لگے کہ ایسا تو میں بھی لکھ سکتا ہوں، لیکن جب وہ لکھنے کی کوشش کرے تو لکھ نہ سکے۔ مولانا کے اسلوب پر یہی بات صادق آتی ہے، ان کا اسلوب اتنا سادہ اور آسان ہے کہ پڑھنے والا سوچنے لگتا ہے کہ ایسی سوانح عمری تو میں بھی لکھ سکتا ہوں لیکن لاکھ کوشش کے بعد بھی وہ کامیاب نہیں ہو پاتا۔

مبالغہ آرائی کا الزام نہ آئے تو کہوں کہ الفاظ واقعی ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے، تعبیرات نوک قلم پر منتظر رہتیں، واقعات دماغ کی سلوٹوں پر نقش رہتے اور حوالے نگاہوں کے سامنے بکھرے پڑے ہوتے، ادبی چاشنی ان کی ہر تحریر پر چھا جاتی ہے، چاہے اس چاشنی کی تہہ کتنی ہی ہلکی کیوں نہ ہو۔ ان کا سنبھلا ہوا انداز بیان، شستہ اردو کا اچھا نمونہ ہے۔

زبان وقلم میں تھوڑی بھی چاشنی اور دو چند مضامین کی مقبولیت کے بعد انسان کسی حد تک بے مہار اور فکری انحراف کا شکار ہو ہی جاتا ہے؛ مذہبی روایات، مسلکی اعتدال اور اپنی تہذیب وثقافت سے منہ موڑ کر لوگ روشن خیالی کے نام پر بے جا تنقید و تنقیص، استہزاء وتمسخر اور کسی حد تک مسلمات پر اعتراضات کی ترویج واشاعت ہی کو اپنی کامیابی سمجھنے لگتے ہیں، لیکن مولانا کی جتنی بھی تحریریں اٹھا کر پڑھ لیجئے اسلامی افکار وخیالات اور ندوی نظریات کے دائرے ہی میں گلکاریاں کرتی نظر آئیں گی۔

مولانا کی امتیازی صفت ان کا تاریخی ذوق تھا، ماضی کے واقعات، انساب

وسنین انھیں ازبر یاد تھیں، ملاقاتوں کا ہر لمحہ اور ہر ملاقات کی باتیں ان حافظہ میں رہتیں، دیکھے ہوئے چہرے یادداشت سے محو نہ ہوتے، ہر کتاب و ہر خطاب ان کے ذہن میں منتقل ہوجاتا، خانوادہ علم اللہی میں ایک خوبی یہ بھی ہے یہاں شادی بیاہ کے رشتے خاندان ہی میں ہوتے ہیں، اس اہتمام کی وجہ سے بسا اقات رشتوں کی نسبتیں ایسی گنجلک ہوجاتی ہیں کہ عام انسان کنفیوز ہوجائے، لیکن مولانا سے ملنے کے بعد یہ گتھیاں آسانی سے سلجھ جاتی تھیں۔

کچھ یہی حال یہاں کے شہرِ خموشاں کا بھی ہے، نہ جانے کتنے اولیاءاللہ کی آخری آرامگاہیں یہاں موجود ہیں، لیکن نہ کوئی مقبرہ ہے نہ کوئی مزار ہے، نہ لوحِ تربت، نہ قبہ و گنبد، بالکل سادہ سی کچی قبریں یا مٹی کا ڈھیر، بس ندی کا کنارہ جس کی سرکتی ہوئی بالوی مٹی، اس پر مستزاد ایک زمانہ تک سیلاب کا سلسلہ، کتنی قبروں کی مٹیاں بہہ چکیں، ظاہری علامتیں بھی مٹ چکیں، لیکن خاندانی بزرگوں نے مکانوں اور مکینوں کو اپنی یادداشت میں سنبھالے رکھا، مولانا مرحوم اس عظیم ورثہ کے امین و پاسباں تھے۔

مولانا محمود صاحبؒ کے قلم نے کئی عظیم ہستیوں کی سوانح عمریاں مرتب کی ہیں، متکلم اسلام حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ، محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقیؒ، امیر تبلیغ حضرت مولانا زبیر الحسن کاندھلویؒ، صحافی اسلام حضرت مولانا محمد الحسنیؒ، عارف باللہ حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ، داعی اسلام حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ، یقیناً ہندوستان کی اسلامی تاریخ ان عظیم ہستیوں کی حیات و خدمات کے بغیر نامکمل ہے، اور مستقبل کا مؤرخ جب بھی اس موضوع پر قلم اٹھائے گا وہ خود کو ان کتابوں سے کبھی بے نیاز نہیں کر سکے گا۔

اہل علم واہل فن نے مولانا کی سوانح نگاری، واقعات کی تصویر کشی، انسانی

نفسیات سے گہری واقفیت، شخصیت کی کلید دریافت کرلینے کی قابلیت اور قلم کی بے جان تصویروں میں جان ڈال دینے کی صلاحیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور مولانا کو ایک کامیاب تذکرہ نگار کی حیثیت سے قبول کیا۔

تاریخ اسلام مولانا کی دلچسپی کا موضوع تھا، جدید وقدیم کے اکثر مآخذ مولانا کے مطالعہ میں تھے، کئی سال تک یہ موضوع ان کے زیر تدریس بھی تھا، اسی وقت سے کہا کرتے تھے کہ تاریخ اسلام کے نام پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں اس میں اسلام کی غلط تصویر پیش کی گئی ہے، ان کتابوں کو تاریخ اسلام کے بجائے تاریخ مسلم حکمراں کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

مولانا نے دیکھا کہ تاریخی صفحات میں جواہر آبدار موجود ہیں اگرچہ گردآلود ہوکر نگاہوں سے پوشیدہ ہوگئے ہیں، انھیں سامنے لانے اور اسلام کی صحیح تاریخ مرتب کرنے کی ضرورت ہے، مولانا نے اس کی بیڑہ اٹھایا اور ''تاریخ اصلاح وتربیت'' کے عنوان سے تقریباً پانچ جلدوں کا ایک خاکہ مرتب کرلیا، سات سال قبل پہلی جلد چھپ کر منظر عام پر آئی، اور اپنے موضوع پر ایک لاجواب تصنیف ہونے کا تمغہ حاصل کیا، اصحاب علم وذوق نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اگلی جلد کی فرمائش بھی شروع کردی۔ ایک طرف دوسرے موضوعات سامنے آتے گئے، مشغولیات بڑھتی گئی، ترجیحات بدلتی رہیں اور دوسری طرف اہل تعلق کا مطالبہ بھی بڑھتا رہا، بالآخر اس کام کو ترجیح دی اور تقریباً دوسال قبل اس سلسلہ کی دوسری جلد بھی طبع ہوگئی، اور تیسری جلد ترتیب وکمپوزنگ کا مرحلہ میں داخل ہوگئی، چوتھی جلد کی تسوید کا بھی کچھ مرحلہ پورا ہوچکا تھا کہ وقت موعود آپہنچا اور مکمل تاریخ اسلام کا کام ایک بار پھر امت کے اہل قلم پر قرض رہ گیا۔

مولانا محمود صاحبؒ نے صرف علمی وفنی کمالات پر قناعت واکتفا نہیں کیا بلکہ علم وفن کے پہلو بہ پہلو ایمان واحسان کے ذریعہ اپنی باطنی دنیا بھی آباد کی، اپنے اوقات عزیز کو اللہ کے ذکر سے آباد کیا اور اس طرح دین ودنیا کی حسنات کو جمع کرنے کی بھی کوشش کی، گھر کے دینی وروحانی ماحول نے مولانا کی جذباتی وفکری رہنمائی کی، جن گودوں میں مولانا پروان چڑھے وہ ایسے ایمانی چشمے تھے جن سے اخلاص وللّٰہیت ،تقوی وطہارت، دعائے سحر ومناجات نیم شب کے نغمے پھوٹتے تھے۔ قال اللہ و قال الرسول کی صداؤں میں بچپن کے ایام گذرے، بزرگوں کی دعاؤں اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی صحبت کیا اثر نے گہرے اثرات مرتب کیے،سن شعور سے پہلے ہی حضرت مولانا کے دامن تربیت سے وابستہ ہوئے،سفر وحضر کی صحبت اٹھائی،علوم عالی ومعرفت ربانی سے فیض اٹھایا، جوانی کے ایام قلب وروح کی پاکیزگی کے ساتھ بسر کیے،حضرت مولانا کی ہدایات کو حرز جاں بنایا اور اور عمر بھر ان پر عمل پیرا رہے،''سلاسلہ اربعہ'' کی ترتیب وپیشکش ان کی سلوک ومعرفت سے گہری وابستگی اور تاریخی ذوق کی بہترین مثال ہے۔

حضرت مولاناؒ کی وفات کے بعد ان کے جانشین محبوب ملت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کے دامنِ فیوض وبرکات سے وابستہ ہوئے، اور اپنی زندگی کے سبھی فیصلوں میں ان کی رائے کے پابند ہوگئے،سفر وحضر میں ایک علمی معاون بلکہ ایک خادم کی حیثیت سے ہمیشہ ساتھ رہے، انہیں کی رہنمائی میں سلوک کے سبھی مراحل طے کیے اور خلافت واجازت بھی سرفراز ہوئے۔

جن حضرات کو رمضان المبارک کے ایام دائرہ شاہ علم اللہ میں گذارنے کا موقع ملا ہو وہ گواہی دیں گے کہ مولانا مرحوم کے ذکر جہری سے مسجد کا کونہ کونہ گونجا کرتا تھا، اللہ

نے ان کے اندر ایسی جاذبیت رکھی تھی کہ تصوف وسلوک کا انکاری بھی ان کی ''ضربیں'' سنتا تو بے ساختہ ان کے پہلو میں آکر بیٹھ جاتا اور اس کی زبان سے بھی ''لا الہ الا اللہ'' کے نغمے پھوٹنے لگتے، اثبات ونفی کی ضربیں دلوں کو مہمیز کرتیں، روح کے تاروں میں ایک جنبش سی آجاتی، پھر ایک کیف، ایک سرور اور ایک حلاوت سی محسوس ہوتی، کچھ ہی دیر میں پوری مسجد میں ایک سناٹا سا چھا جاتا، ایک پرنور سماں بندھ جاتا اور پھر مولانا کے ہاتھ بارگاہ خداوندی میں اٹھتے اور دعاؤں کا سلسلہ شروع ہوتا، ہر ہر دعا پر آمین آمین کی صداؤں سے پورا ماحول روحانی ہوجاتا، تیز تیز ہچکیوں اور تر تر داڑھیوں سے صاف محسوس ہوتا کہ ''الا اللہ'' کی ضربوں نے دل ودماغ کے سبھی تار مرتعش کردیے ،قلب وروح کی بے قراری کو کچھ سکون نصیب ہوا، اور ذکر کی حلاوت نے پورے وجود کو پاکیزہ کردیا۔ ؎

اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روییے کس کے لیے کس کس کا ماتم کیجیے

مولانا محمود صاحبؒ کی ہمہ جہت شخصیت کا تنوع حیرت انگیز تھا، وہ جتنے بڑے سوانح نگار تھے اتنے ہی بڑے مضمون نگار، اتنے ہی بڑے صحافی، اتنے ہی بڑے ماہر سنین اور اتنے ہی بڑے ماہر سلوک تھے، ان سب حیثیتوں پر مستزاد ان کی شخصیت کا وہ جمال تھا جو ہر ملنے والے پر اپنا پَرتو ڈال کر مسحور کر لیتا تھا، ان کے دوستوں اور اہل تعلق کا حلقہ کافی وسیع تھا، اس میں لکھنؤ کے وہ اہل ادب بھی تھے جو شام اودھ کے عاشق اور زبان وفن کے مرد میدان تھے، وہ بانکے بھی تھے جو فنون حرب وضرب میں طاق تھے، وہ مرقع ہائے عبرت بھی تھے جو سابق خاندان شاہی کے چشم وچراغ یا علمی وادبی خانوادوں کی یادگار تھے۔ اخباروں کے مریدوں اسکولوں اور کالجوں کے استاد،

افسانہ نویس اور نقد نگار، ترجمے کے ماہر اور نثار، مرثیہ خواں اور مرثیہ گو، سماجی کارکن اور سیاست کے علمبردار، تاجر اور نوکر بھی تھے، اس مختلف النوع اور رنگا رنگ مجمع میں مولانا کی مخصوص جگہ تھی اور مولانا کے یہاں ان کی مخصوص پذیرائی، ان میں سے کسی مجمع میں بھی وہ نہ تو اس طرح گھل مل جاتے کہ اس کا تشکیلی حصہ بن جائیں، اور نہ بیگانہ وار تماشائی کی طرح کسی نامعلوم گوشہ میں ہی بیٹھے رہتے، ہر جگہ اپنی سنجیدہ انفرادیت کو سنبھالے رہتے، لیکن دوسروں پر انفرادیت کو وارد نہ کرتے، اہل علم اور بزرگوں کا خود بھی احترام کرتے اور برابر والوں کو اور شاگردوں کو حد سے بڑھنے کی اجازت نہ دیتے، اپنے چھوٹوں کی بات بھی خموشی سے سنتے، علمی وفکری مباحث میں اپنی بات پورے زور وشور سے کہتے، دوسروں کی سنتے، جواب الجواب دیتے لیکن سب جانتے تھے کہ مولانا نہ حد سے آگے جائیں گے اور نہ جانے دیں گے، وہ جاذب قلب ونظر شخصیت کے مالک تھے، جس محفل میں ہوتے، اس کی روح بن جاتے، عام طور پر یہ اصطلاح مشاعروں کے لیے خاص ہے کہ فلاں شاعر نے تو واقعی مشاعرہ لوٹ لیا، لیکن میں نے اکثر موقعوں پر مولانا کو تن تنہا محفل کو لوٹتے ہوئے دیکھا ہے۔

ان کی شخصیت کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ وہ دوسروں کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے، خوردوں سے ملنے میں، ان کا اکرام کرنے اور ان کے کارناموں کی قدر شناسی میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے تھے، ان کی تصنیفات میں جابجا شاگردوں اور خوردوں کے حوالے اور ان کے شکریے موجود ہیں۔

دوستوں کے دوست دل وجان سے، مگر کسی کے دشمن نہ وہ تھے اور نہ کوئی ان کا دشمن تھا، شرافت اور نیک نفسی ان کا اخلاقی وصف تھا، چہرے سے ہمدردی اور شفقت نمایاں تھی، دل کو ان کی طرف کشش ہوتی تھی، پاس بیٹھنے سے محسوس ہوتا کہ کوئی چیز ہم

پر اثر کر رہی ہے۔ وہ ہمیشہ زمین سے جڑے رہے ہیں، مسائل کی گتھیوں میں نہیں الجھتے تھے بلکہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کا حل نکالنے کا ہنر جانتے تھے۔ درگزر کا یہ عالم تھا کہ ان سے کوئی بدمعاملگی یا بدسلوکی بھی کرتا تو تعلقات میں کبھی کوئی فرق نہ آتا تھا، جب ملتے تو اسی شفقت وعنایت سے پیش آتے اور کیا مجال کہ اس کی بدسلوکی یا بد معاملگی کا ذکر زبان پر آنے دیتے، کسی دوسرے سے بھی کبھی اس کا تذکرہ نہ کرتے۔

انسان شناسی ان کی ایک بڑی خوبی تھی، وہ بہت جلد سمجھ جاتے تھے کہ متعارف کس خوبی یا خرابی کا مالک ہے، انھوں نے متعدد کام کے افراد دریافت کیے اور ان سے مختلف الانواع کام لیے، لائق انسانوں کا حصول کتنا مشکل ہے اس کو اہل دانش اچھی طرح سمجھتے ہیں، اور اس بھی زیادہ مشکل ان سے کام لینا اور پھر کھلے دل سے اس کا اعتراف اور ہمت افزائی کرنا!

یہ فضل وکمال، مطالعہ ووسعت نظر تو الگ چیزیں ہیں مولانا کی زندگی کا اصلی جوہر ان کے اخلاق تھے، سرتاپا انکسار سرتاپا تواضع، حددرجہ فروتن مگر اسی کے ساتھ حد درجہ بے نیاز، غنی نفس، بلند حوصلہ، اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا لحاظ رکھنے والے مطیع وفرمانبردار، مگر اسی کے ساتھ خدا کے سوا ہر بڑائی وہر کبریائی سے بےخوف ونڈر!

مولانا بہت کچھ تھے مگر سب سے بڑھ یہ کہ وہ اپنے ہر دوست، ہر ہم عصر، ہر رفیق کے محبوب وحبیب تھے، ان کا ہر ملنے والا یہی سمجھتا تھا کہ وہ اسی سے سب سے زیادہ محبت کررتے ہیں، ان کی ہستی محبت کا آئینہ خانہ تھی، ہر آئینۂ دل میں وہی ہر طرف چلتے پھرتے نظر آتے تھے، لہٰذا انہیں کئی بار ہی نہیں، کئی زاویوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

مولانا محمود حسنیؒ کا نام سنتے ہی علوم ومعارف، تصوف سلوک اور قلم وقرطاس کا

ایک حسین پیکر نظروں کے سامنے آجاتا ہے، فضل وکمال کا ایک گلستانِ پر بہار ذہن میں لہرانے لگتا ہے، ان کی بوقلموں شخصیت کے گوناگوں گوشوں پر بہتوں نے لکھا ہے، کسی نے ان کی تاریخ دانی کو موضوعِ گفتگو ٹھہرایا، کسی نے ان کے سوانح نگاری کی تفصیلات بیان کیں، کسی نے ان کی وادیِ صحافت کی پیمائش کرنے کا فریضہ انجام دیا، کسی نے ان کی علوم حدیث وفن تصوف سے لطف اندوز ہونے کی کشش کی ہے، اور کسی نے ان کے اخلاق حمیدہ وصفات محمودہ پر اظہار خیال کیا، لیکن ایک اہم پہلو جو ان کی شخصیت کا تعمیری عنصر ہے وہ تشنہ رہ گیا یعنی ان کی تدریسی وتربیتی خصوصیات!

مولانا ایک مصنف، ایک مؤرخ، ایک سالک اور ایک واعظ کے ساتھ بلکہ اس سے پہلے ایک کامیاب مدرس وایک کامیاب مربی تھے، ان کا تدریسی دورانیہ تقریبا دس سال پر محیط ہے، اس طویل عرصہ میں ان کے شاگردوں کی تعداد سیکڑوں میں ضرور ہوگی، دراصل شاگردی بھی کئی طرح کی ہوتی ہے، ایک تو درس لینے کی عادت کا نام شاگردی رکھا گیا ہے، کچھ کتابیں پڑھ لیں، کچھ کتابیں سمجھ لیں، امتحان تک ساتھ رہا، پھر نہ واسطہ کتاب سے اور نہ رسم وراہ استاد سے، یہ شاگردی رسمی بھی ہوتی ہے اور چند سالوں تک ہی قائم رہتی ہے۔ دوسری شاگردی درس کتاب سے لے کر درس زندگی تک، مادہ خام سے لے کر کچھ بننے اور سنورنے تک، علمی موشگافیوں سے لے کر عملی بوقلمونیوں تک، محاسبہ نفس لے کر احتساب کائنات تک' نہ شاگرد بے نیاز، نہ استاد غافل!

مولانا کے خوش نصیب شاگردوں کی طویل فہرست میں راقم سطور کا بھی نام شامل ہے، یوں تو رسمی شاگردی پانچ سال تک مسلسل حاصل رہی، لیکن دوسری شاگردی کی مدت طویل ہے؛ تقریبا تیس سال کی شاگردی! مولانا سے جتنا قرب بڑھتا گیا ان کی شخصیت اسی قدر برافگندہ نقاب ہوتی گئی، وہ ہشت پہل شخص تھے اور

ان کی شخصیت کا ہر پہلو اپنی جانب متوجہ کرتا تھا، طبیعت کی نرمی و سختی، مزاج کا جمال و جلال، تدریس کی جدت وندرت، تربیت کے انوکھے والبیلے انداز اور شخصیت سازی کا اختراعی اسلوب، ہر رنگ و ہر آن میں ان کو دیکھنے اور ہر ہر پہلو سے سیکھنے کا موقع ملا۔ پہلی بار ایسا بے نفس و بے لوث انسان دیکھا جو غیبت نہیں کرتا، چغلی نہیں کرتا، کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا، بلکہ دوسروں کے متعلق منفی خیال بھی نہیں رکھتا، جو زندگی کو امانت سمجھتا ہے اور ہر ہر لمحہ کو مفید بنانے کی فکر میں رہتا ہے اور ایسے لوگوں کی صحبت اٹھانا پسند کرتا ہے جن کے پاس فکر کی سلامتی، اخلاق کی بلندی اور علمی رنگارنگی ہو۔

میری طالب علمی کے زمانے کی مختلف یادیں خانۂ خیال میں گردش کر رہی ہیں، ان کی ممتاز شخصیت اور منفرد شبیہ کی انمول تصویر دماغ کی سطح پر ابھر رہی ہے؛ حضرت الاستاذ گندمی رنگ، متوسط القامت بدن، پر وقار و بارعب چہرہ، گھنی وسیاہ داڑھی، قدرے کشادہ پیشانی، مناسب ناک، شستہ وشایستہ وشگفتہ طرز گفتگو کے حامل، اپنے خدوخال وشخصیت کے اعتبار سے دل کش وجاذب نظر تھے۔

مولانا کے تدریس کی دو بنیادی خصوصیات تھیں: ایک نصابی کتاب کی تحلیل وتفہیم ساتھ ساتھ موضوع سے مناسبت پیدا کرانے کی کوشش، اور دوسری درجہ کے اوقات کے بعد بھی تعلیمی وتربیتی ربط اور مسلسل علمی وفکری رہنمائی۔

تحقیقی مزاج پیدا کرنے کا عجب ہی گُر تھا، عربی کے الفاظ ومعانی کے لیے کہتے کہ اردو کے بجائے عربی لغات دیکھو، کوئی تاریخی سبق ہوتا تو اصل مآخذ دیکھنے کا حکم دیتے، خود بھی مراجع کی کتابیں لاتے اور طلباء سے بھی منگواتے، پابندی سے لائبریری پہنچتے اور ہم طلباء کو مراجعت میں مشغول کر دیتے، موضوع کی مناسبت سے دیگر کتابیں بھی تھماتے، ایک ایک سبق پر کئی کئی جہتوں سے گفتگو کرتے، کہتے کہ اس

سے تمھارے اندر تحقیق کا مزاج پیدا ہوگا، مثال کے طور پر ''القراۃ الراشدۃ'' (ثالث) میں ایک سبق ''بین والد جندي و ولد فقیه'' کے عنوان سے تھا، تحقیق ومراجعت کرائی تو یہ سبق تاریخی معیار پر پورا نہیں اترا۔ جب ''تہذیب الاخلاق'' کا درس ہوتا تو احادیث کے ترجمے وتشریح پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اصل مآخذ اور شروحات بھی سامنے رکھتے، مختلف جہتوں سے حدیث پر بحث کرتے، روایت کا مرجع اور الفاظ کے اختلافات بھی بتاتے، کبھی کبھی حدیث رجال پر بھی گفتگو کرتے۔ تاریخ اسلام کے اسباق میں مستند تاریخی کتابوں کا مطالعہ کراتے، دارالمصنفین کی مطبوعات کو خاص اہمیت دیتے، مستند اور صحیح الفکر مصنفین کو پڑھنے کی ترغیب دلاتے، خلاصہ کلام یہ کہ طلباء میں علمی ذوق پیدا کرانے کی ہر ممکن کوشش کرتے اور عملی رہنمائی کرتے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اس وقت حیات تھے، ہم طلباء کو مولاناؒ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی تلقین کرتے، کبھی بلند و تشجیعی الفاظ میں تعارف بھی کراتے جس سے طالب علم ایک انرجی محسوس کرتا۔ حضرت مولاناؒ کی عظیم شخصیت کو ان کی کتابوں سے زیادہ مولاناؒ کی باتوں کے ذریعہ سمجھنے کا موقع ملا۔ حضرت مولاناؒ کی ذات گرامی اصحاب علوم واصحاب قلوب کا مرجع تھی، قدآور علمی وفنی شخصیات اور اہل قلوب کی آمد ورفت رہا کرتی تھی، مولانا ہم طلباء کی ان سے ملاقاتیں کرواتے، دعائیں دلاتے، نصیحت کراتے اور کہتے کہ ان ملاقاتوں سے علمی وروحانی فائدہ ہوگا اور مرعوبیت نہیں رہے گی۔

تدریس کی طرح امتحان کے پرچے بھی مولانا اسی معیار سے بناتے اور جانچتے تھے، جو طلباء ذہین ہوتے اور ان کے درمیان مسابقہ ہوتا' ان کا پیاں الگ کر لیتے،

پھر باریکی سے ان کاپیوں کو جانچتے، ایک ایک شوشہ کی غلطی بھی نشان زد کرتے، تفصیلی جواب میں دیگر اساتذہ کی بھی رائے لیتے اس کے بعد ہی نمبر دیتے، اس طرح کسی بھی طالب علم کو کوئی شکایت نہ ہوتی۔

مولانا جس بلندی سے پڑھاتے اور جس سطح کے سوالات بناتے وہ درجہ کے معیار سے بہت اونچے ہوتے تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سالانہ امتحان تھا، مولانا لکھنؤ میں تھے، تہذیب الاخلاق کا پرچہ تھا، سارے سوالات عربی میں تھے، پرچہ کی سطح بہت بلند تھی، مثال کے طور پر ایک سوال کے اجزاء میں ایک جزء یہ بھی تھا: ”من رواه وأين رواه؟“ یقیناً حدیث کی پہلی کتاب میں یہ سوال معیار سے بلند بلکہ بہت بلند تھا، انتظامیہ نے مولانا کو فوراً متنبہ کیا اور پرچہ ہی بدلنے کو کہا، مولانا نے صرف یہی جواب دیا کہ امتحان ہوجانے دیجیے پھر دیکھ لیں گے۔ جب کاپیاں جانچی گئیں تو معلوم ہوا کہ طلباء نے سبھی سوالات حل کیے ہیں۔ مولانا نے ذمہ داروں کو کاپیاں دکھائیں اور کہا کہ طلباء کے معیار اور ان کی صلاحیت کو سامنے رکھ کر ہی سال بھر محنت کرائی ہے۔

مولانا کی وجہ سے طلباء میں مضمون نگاری و مقالہ نویسی کا عام رجحان تھا، جو بھی مولانا سے ملتا اس میں لکھنے کا شوق ضرور انگڑائی لیتا، مولانا ہمیں عناوین دیتے اور پھر ہماری الٹی سیدھی تحریروں کی تصحیح بھی کرتے، اصلاح کا عجیب وغریب ملکہ تھا، کوشش کرتے کہ طلباء کی تحریروں میں زیادہ تبدیلی نہ آئے، کبھی کبھی بڑی بھونڈی غلطیاں ہوتیں، ان کی بھی اصلاح کرتے لیکن سب کے سامنے نہ ان کا تذکرہ کرتے اور نہ ان کی طرف اشارہ کرتے، نہ کسی کو شرمندہ کرتے اور نہ کسی پر احسان جتاتے، بڑی شفقت اور غایت مہر ومحبت کا معاملہ کرتے، البتہ فکری غلطی پر ضرور تنبیہ کرتے اور فوراً

پوچھتے کہ آج کل کس کتاب کا مطالعہ کررہے ہو؟ غلطی اگر بڑی ہوتی تو مستقل اس کی ذہن سازی کرتے۔ دارالمطالعہ میں طلباء کو ہر کتاب پڑھنے کی اجازت نہیں تھی، سطح کا لحاظ ضروری تھا، مولانا اس سلسلہ میں بہت حساس تھے۔

وہ طلباء پر نئے نئے تجربے بھی کرتے تھے اور ان کی صلاحیتوں کو مہمیز کرتے، مثلاً راقم جب ندوہ میں زیر تعلیم تھا، مجلس تحقیقات میں ان سے ملاقات ہوئی، مولانا نے ایک عنوان دیا اور کہا کہ ابھی مضمون لکھو، میں نے بہت سے حیلے کیے بہانے بنائے اور وہاں سے نکل جانے کی کوششیں کیں، مولانا بھانپ گئے، اور مجلس کے ہال میں مجھے قلم کاغذ تھما کر بٹھا دیا، باہر سے کنڈی لگالی اور کہا کہ جب مضمون پورا ہوجائے تو آواز دے دینا، تھوڑی دیر میں چائے بھی بھجوادی، اب کوئی اور چارہ نہ تھا بالآخر مضمون پورا ہوا اور مولانا نے بہت حوصلہ بڑھایا۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے حیات وخدمات پر ایک عالمی سیمینار جامعہ سید احمد شہیدؒ (کٹولی) میں منعقد ہوا تھا، مولانا کے سپرد بہت ساری ذمہ داریاں تھیں، لیکن حسب عادت مقالہ نگاروں اور خطیبوں کی اہم اہم باتیں مولانا چھوٹی بڑی پرچیوں میں لکھ لیا کرتے تھے، سیمینار کے بعد مولانا کا غالباً ممبئی کا سفر تھا، چارباغ اسٹیشن تک میں بھی ساتھ تھا، مولانا سیٹ پر بیٹھ گئے اور اپنا بیگ دیکھنے لگے، اس میں سیمینار کی ساری پرچیاں مل گئیں، مولانا نے وہ سب میرے حوالہ کیں اور کہا کہ واپس آنے تک سیمینار کی رپورٹ تیار کر کے رکھنا، میں نے کہا کہ مولانا یہ کیسے ہوسکتا ہے، سیمینار میں شرکت تو دور کی بات ہے میں آج تک کٹولی بھی نہیں گیا، مولانا نے کوئی عذر قبول نہیں کیا، آخرش ان منتشر اوراق کی بنیاد پر میں نے ایک رپورٹ تیار کی جو بعد میں مولانا کی اصلاح کے بعد ''بانگ حرا'' کے خصوصی اشاعت میں شامل ہوئی۔

مولانا نے ایک موضوع ''اسلام اور انسانی حقوق'' پر لکھنے کے لیے دیا، وقت بہت کم تھا، میں کہتا رہا کہ اتنے کم وقت میں مقالہ تیار کرنا بہت مشکل ہے، مراجع بھی دستیاب نہیں، مطالعہ کی مہلت بھی نہیں۔ مولانا نے کہا کہ اس موضوع پر ہم نے تم کو بہت کچھ بتایا ہے، فلاں فلاں کتاب میں تم نے اس موضوع پر جو پڑھا ہے وہ سب یاد کرو، انہیں باتوں کو مرتب کر کے لکھنا ہے، یہ کہتے ہوئے مجھے قلم کاغذ تھما کر بٹھا دیا ،اور خود لائبریری سے مراجع کی کتابیں لا کر میرے سامنے رکھ دیں اور کہا اب کوئی عذر نہیں ،کل تک مقالہ تیار ہو جائے، مولانا مسلسل نگرانی کرتے رہے، اس طرح دوسرے ہی دن مقالہ تیار ہو گیا، مولانا نے مقالہ پسند کیا، اس میں اصلاحات دیں، دعاؤں سے خوب نوازا اور اہل تعلق سے اس کا تذکرہ بھی کیا۔

مولانا کہا کرتے تھے کہ لکھنے سے پہلے موضوع کا مطالعہ ضروری ہے، جتنا مطالعہ فروعی اور سرسری ہوگا عبارت اتنی ہی ناقص اور بے جوڑ ہوگی، خیال جتنا آئینہ ہوگا عبارت اتنی ہی خوبصورت ہوگی، مواد کی صحت پر جتنا خیال ہوگا تحریر میں اتنی ہی وضاحت اور قطعیت بھی ہوگی، قلم برداشتہ لکھنا کمال نہیں بلکہ ناپ تول کے جانچ پرکھ کے لکھنا کمال ہے، چنانچہ ہم طلباء کو کیا پڑھنا ہے اور کس مصنف کو پڑھنا ہے مولانا اس کی پوری نگرانی رکھتے تھے۔

مولانا سے جب بھی ملاقات ہوتی' نہایت مفید ہوتی، ادھر ادھر کی باتیں بہت کم کرتے، کوئی علمی نکتہ بتاتے، کسی کتاب کا تعارف کراتے، کسی موضوع پر نقد و تبصرہ کرتے، ملکی و قومی مسائل پر گفتگو کرتے، وہ اپنا نقطۂ نظر بڑی وضاحت سے پیش کرتے، دلیلیں دیتے، جوابات دیتے، لیکن دوسرے کی بات سننے کو بھی تیار رہتے، اپنی رائے کبھی نہیں تھوپتے۔

جب کبھی میں کہتا کہ مولانا آج کل اخلاص پیدا ہونا تو بہت مشکل ہے، پھر اتنا کچھ لکھنے پڑھنے سے کیا حاصل جب اخلاص ہی نہ ہو؟ تو مسکراتے اور کہتے ان سب چکروں میں نہ پڑو، شیطان اسی طرح پٹی پڑھاتا ہے، اپنا کام کرتے رہو، انشاء اللہ اسی طرح کام کرتے کرتے اخلاص پیدا ہو جائے گا، اگر انتظار کرو گے تو صحت اور صلاحیت دونوں ضائع ہوتے رہیں گے۔

مولانا کے سامنے اگر کوئی غیبت کرتا یا ناروا تبصرہ کرتا تو کہتے کہ ہمیں اپنی فکر کرنی چاہیے، کوئی کسی کی قبر میں نہیں سوئے گا ہم سب کو اپنی اپنی قبر میں سونا ہے۔

دیکھنے میں محسوس ہوتا کہ مولانا پر کسی کی اچھی بری بات کا کچھ زیادہ اثر نہیں پڑتا، بعض منھ لگے کچھ بے ادبی اور گستاخی بھی کر جاتے، ہر سمجھدار اس کو محسوس کر لیتا لیکن مولانا صرف مسکرا دیتے اور نظر انداز کر دیتے۔ جس طرح بڑی سے بڑی مسرت پر وہ غیر متاثر نظر آتے اسی طرح سخت سا سخت رنج و غم بھی ان کو افسردہ و مضمحل نہیں بنا پاتا، معلوم ہوتا تھا کہ ان کے جسم میں اعصاب کے بجائے فولاد کی تاریں ہیں جن پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا لیکن جنھیں ان کی طبیعت کا اندازہ تھا وہ سمجھ لیتے تھے کہ اس وقت کیسا طوفان مسرت یا سیلاب غم ان کے اندر جوش زن ہے جسے وہ ضبط کیے ہوئے ہیں لیکن یہ ضبط اس وقت ٹوٹ جاتا جب کوئی ادنی سی بھی گستاخی اکابر امت اور خاص کر اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں ہوتی۔

مولانا مرحوم کی صحت و تندرستی ایک زمانہ سے خراب تھی، ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ موت سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں، کئی بار وہ سخت بیمار ہوئے بلکہ موت کی دہلیز تک پہنچ کر واپس آئے لیکن ان کے مردانہ عزائم اور دلیرانہ جوش میں کبھی کوئی لغزش پیدا نہیں ہوئی، اپنے تعلیمی و تصنیفی مشاغل سے انھوں نے کوئی سمجھوتا نہیں

کیا، اور اپنی صحت و توانائی یا راحت و آسائش کی طرف فرض کی حد تک بھی توجہ نہیں دی۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ وقت ضائع نہ کرو، کچھ کرنے کا یہی وقت ہے، اب عمریں لمبی نہیں ہوتیں، اللہ نے انہیں مختصر عمروں میں برکت رکھی ہے۔

عمر کے آخری دو سال مسلسل علاج و معالجہ میں گذرے، مرض میں شدت اور جسم میں کمزوری بڑھتی گئی، اٹھنے بیٹھنے میں بھی سہارے کی ضرورت پڑنے لگی، علاج کے ہر ممکن طریقے اختیار کیے گئے، گردوں میں سخت انفیکشن تھا، معاملہ ڈائیلیسس تک جا پہنچا، پھر بھی بات نہ بن سکی اور نوبت وینٹیلیٹر کی آ گئی، اہل تعلق مسلسل دعاؤں میں مشغول رہے، وفات سے ایک دو دن قبل بہتری کے آثار نظر آنے لگے تھے، وینٹیلیٹر بھی ہٹا دیا گیا، لیکن خدا کی مرضی غالب آئی، عارضہ قلب لاحق ہوا اور پیہم رواں، ہردم جواں زندگی کو قرار دائمی نصیب ہوا۔ انا اللہ و انا الیہ راجعون۔

اس دن آسمان پر سیاہ بادلوں کے ٹکڑے اڑتے نظر آ رہے تھے، ہوا میں خنکی تھی، کچھ رم جھم بھی ہوئی، متعلقین کی آمد کا سلسلہ جاری تھا، کون کس سے تعزیت کرے، ہر کوئی تو سوگوار تھا، سب اپنا اپنا تعلق بیاں کرتے رہے، اللہ اکبر کی صدا گونجی اور ایک جم غفیر نے جنازہ کی نماز ادا کی، اور پھر بھیگی پلکوں، تڑپتے دلوں، لرزتے قدموں اور سسکتے جذبات کے ساتھ ان کو آغوشِ قبر کے حوالہ کر دیا۔

ایسے تو ہر دن کسی نہ کسی کے مرنے کی خبر سینہ چیرے دے رہی ہے، مگر کچھ ایسے لوگ جن کی شفقت و محبت ہم پر سایہ فگن رہی ہو وہ دور ہو جائیں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے

ع آسماں تری لحد پہ شبنم افشانی کرے

مرض کی شدت میں اہل تعلق کو یہ ڈر تھا اور غلط نہیں تھا کہ ان کے ذہن میں اتنا کچھ محفوظ ہے کہ اس کا سمیٹنا مشکل ہے، ڈھلتی ہوئی صحت، کمزور پڑتے اعضاء،

گھٹتی ہوئی طاقت اور کام کرنیکی صلاحیت، فطرت کے عطیاتِ پیری انھیں جوانی میں ہی حاصل ہو گئے تھے، یہ خواہشوں کے پھیلانے کا نہیں بلکہ کام کو سمیٹنے کا وقت تھا، اتنا مولانا کو بھی معلوم تھا کہ اب آفتاب حیات غروب ہوا چاہتا ہے؛ لیکن سوال یہ تھا کہ یہ کام سمیٹے کیسے جائیں، معاونِ کار کہاں سے ڈھونڈے جائیں، لیکن مولانا ہمت والے انسان تھے، جب تک ہاتھ میں جنبش میں تھی قلم مسلسل رواں رہا، بستر مرگ پر لیٹے لیٹے سیکڑوں صفحات لکھ ڈالے اور کئی رسائل مرتب کر دیے۔

تمام عمر قلم و قرطاس میں کٹی، سالہا سال لکھا اور سالہا سال پڑھا، اس اعتبار سے وہ ایک تہائی صدی کے ادب تاریخ کی کہانی تھے، ان کی باتوں سے جی اکتا تا ہی نہیں تھا، کیا کیا باتیں تھیں جو ان کے سینہ میں نہیں تھیں! کتنی ہی باتیں ان کے قلم سے صفحہ پر آ گئیں، کتنی ہی لوگوں کے حافظہ میں بے تحریری پڑی ہیں اور کتنی ہی نا گفتنی ہونے کے باعث محفلوں میں گھومتی پھرتی ہیں، جس موضوع پر بولتے موتی رولتے، اکثر گفتنی و نا گفتنی وہ اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔

آہ! بہت کچھ کہنا تھا، بہت کچھ لکھنا تھا لیکن کیا کیا جائے کہ ہمارے سینوں میں جو وسعت ہے وہ کاغذ کے صفحات کہاں! ہمارے جذبات میں جو گہرائی ہے وہ الفاظ کی بندشوں میں کہاں! ہائے! مرزا سوداؔ نے کس وقت کہا تھا ؎

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں؟
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں؟

تعزیت نامے

مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ کے انتقال پر متعدد اہل علم وفضل نے تعزیتی خطوط ارسال کیے۔ یہ خطوط حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم (ناظم ندوۃ العلماء-لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) کے نام لکھے گئے ہیں۔ مولانا مرحوم رشتہ میں حضرت مولانا دامت برکاتہم کے نواسہ تھے۔ ذیل میں چند اہم خطوط کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ (ادارہ)

’’مولانا مرحوم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے صحبت یافتہ تھے۔ انہوں نے مختلف علمی خدمات انجام دیں۔ ’’تعمیر حیات‘‘ ماہنامہ ’’رضوان‘‘ اور ’’پیام عرفات‘‘ جیسے علمی مجلّے انکے علمی ذوق کا ثبوت ہیں۔ تاریخ، تصوف اور سیرت نگاری ان کا خاص میدان تھا۔ خاص طور پر خانوادۂ علم اللہ کے بزرگوں کی تاریخ کے وہ امین تھے۔ سفر وحضر میں انہیں آپ کی رفاقت حاصل تھی۔ ان کی رحلت علمی دنیا کا ایک عظیم خسارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور اس خلا کو جوان کی وفات سے پیدا ہوا ہے اُسے پر فرمائے۔ آمین!‘‘

والسلام

(مولانا) سید جلال الدین عمریؒ

(سابق صدر شریعہ کونسل جماعت اسلامی ہند)

’’اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو بہت سی بلند خصوصیات اور امتیازی اوصاف سے سرفراز فرمایا تھا، جو عصر حاضر کے علماء کرام کی جماعت میں ان کو ایک نمایاں و بلند مقام عطا کرتی ہیں۔ مولانا ذاتی اعتبار سے اللہ کے دین کے خادم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو گوناگوں خوبیوں سے نوازا تھا جن کی قوم کو ضرورت تھی، لیکن اللہ تعالیٰ ہی اپنی مصلحتوں کو بہتر جانتے ہیں، میں دعا گو ہوں کہ حق تعالیٰ انکے درجات بلند فرمائے۔‘‘

(مولانا حکیم) محمد عبداللہ مغیثی

(مہتمم جامعہ گلزار حسینیہ، اجراڑہ- میرٹھ)

’’مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کی وفات ایک بڑا سانحہ ہے، وہ علم و تحقیق کے میدان کے ابھرتے ہوئے روشن ستارے تھے، رائے بریلی کے مشہور اور علم و معرفت میں ممتاز حسنی خاندان کے ایک اہم فرد تھے، اپنی خوش اخلاقی اور انکساری کی وجہ سے اپنے بڑوں کے وہ محبوب تھے اور چھوٹوں کے بھی، مخدوم گرامی سید العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی بھی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے، انہوں نے ندوہ سے فراغت کے بعد مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی میں کامیابی کے ساتھ تدریس کی خدمت انجام دی، مگر ان کا اصل میدان تصنیف و تالیف تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو تذکرہ نگاری کا خاص ذوق عطا فرمایا تھا، صوفیاء اور مشائخ کے حالات ان کا خاص موضوع تھا، وہ ماہنامہ ’’رضوان‘‘ لکھنؤ اور ’’پیام عرفات‘‘ رائے بریلی کی مجلس ادارت میں شامل تھے، احسان و تصوف سے ان کو بڑی مناسبت تھی، ان کی وفات علمی و تصنیفی دنیا کے لیے یقیناً بڑا حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے، ان کے درجات کو بلند کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین!‘‘

والسلام

(مولانا) خالد سیف اللہ رحمانی

(جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

''عزیز القدر مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی اپنے نانا مولانا سید محمد ثانی حسنی کی طرح بہت خاموشی اور بے ریائی کے ساتھ دین کی بڑی خدمات انجام دیتے رہے، انہیں اپنے اجداد کی جانب سے تاریخ نویسی کا ذوق خصوصیت کے ساتھ عطا ہوا تھا، ان کے قلم سے نکلنے والی تقریباً ایک درجن کتابیں اس کا بین ثبوت ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی کو اپنے فضل وکرم سے نوازے، جنت الفردوس کو ان کا مسکن بنائے اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل کی دولت عطا فرمائے۔ آمین!''

والسلام

ڈاکٹر محمد منظور عالم

(چیئرمین انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز)

''جناب مولانا محمود حسنی ندوی کا سانحہ ارتحال ہم سب کے لیے گہرے دکھ اور صدمہ کی بات ہے، اپنی مختصر سی زندگی میں مولانا موصوف نے جس قدر وقیع علمی ودینی خدمات انجام دی ہیں، وہ قابل قدر اور بے مثال ہیں۔ ایسے علم وادب کے گوہر آب دار اور باکمال شخصیت کا وصال دینی، علمی وروحانی حلقہ کے لیے عظیم خسارہ ہے۔ لیکن مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ، ربِّ قدیر کے فیصلہ پر صبر وتسلیم۔ اس دکھ کی گھڑی میں خاکسار کی طرف سے جملہ اہل خانہ بالخصوص حضرت والا کی خدمت عالیہ میں تعزیت مسنونہ پیش ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل خانہ کو صبر جمیل مرحمت فرمائے اور مولانا مرحوم کے مراتب میں ابداً ودائماً ترقی فرماتا رہے۔''

والسلام

(مولانا) محمود اسعد مدنی

(صدر جمعیۃ علماء ہند)

’’عزیز مکرم مولانا محمود حسن حسنی کی وفات کا علم ہو کر جس قدر رنج وقلق ہوا، وہ ایک طبعی اور فطری امر ہے۔ اللہ جل شانہ جناب والا کو ان تمام ذہنی وفکری صدمات پر اجر جزیل کے ساتھ صبر جمیل عطا فرمائے۔ بے شک ایک مختصر سے عرصہ میں جناب کو متعدد الم ناک حوادث سے گذرنا پڑا لیکن

’’جذبہ تسلیم ورضا کو چارۂ ——— در کفِ شیر نرِخوں خوارۂ‘‘

اللہ جل شانہ حضرت والا کو ہمت وقوت عطا فرمائے۔ آمین!‘‘

والسلام

(مولانا) محمد شاہد صاحب

(ناظم مدرسہ مظاہر علوم-سہارنپور)

’’مولانا مرحوم کی گفتگو اور تحریروں میں ایک خاص قسم کی روحانیت محسوس ہوتی تھی، مرحوم جب بھی ملے بہت ہی خوش اخلاقی اور شرافت نسبی سے ملے۔ ملنسار، خلیق، علم دوست، کتاب دوست اور سنجیدگی ومتانت رکھنے والے کم عمر بزرگ تھے، انہوں نے تحریری خدمات کی ماشاء اللہ لائن لگا دی ہے۔ اکابر علماء مظاہر سے انہیں ذہنی وابستگی تھی، اسی لیے ان کی تحریر کردہ اکثر کتابیں علماء مظاہر پر مشتمل ہیں۔‘‘

(مولانا) محمد سعیدی صاحب

(ناظم ومتولی مظاہر علوم وقف-سہارنپور)

’’مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ بہت ساری خوبیوں کے مالک تھے، بالخصوص آپ کا ہر وقت مسکراتا چہرہ، بات چیت کی نرمی اور تواضع وعاجزی، حسنی خاندان کی جیتی جاگتی تصویر تھی، آپ کو سوانح نگاری کے حوالہ سے بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، مرحوم اپنی ہر نئی کتاب اہتمام کے ساتھ احقر کو ہدیۃً پیش فرماتے تھے اور آنحضرت اور ندوہ

کے حالات سے اکثر انہی کی وساطت سے معلومات حاصل کر لیتا تھا۔خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ مغفرت فرمائے۔''

والسلام

(مولانا مفتی)احمد دیولا

(بانی ومہتمم جامعہ علوم القرآن- جمبوسر)

''اطلاع ملی کہ آپ کے بھانجے مولانا محمود حسنی کی وفات ہوگئی ہے،اس اطلاع سے بڑا افسوس اور رنج ہوا،''تعمیر حیات''میں ان کا نام بار بار پڑھتا تھا۔اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے۔آمین یارب العالمین!''

والسلام

پروفیسر احتشام احمد ندوی

(علی گڑھ)

''خاندان حسنی کا علمی چشم و چراغ عزیزی مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی صاحب داغ مفارقت دے گئے۔ ہمارے لیے یہ حادثہ ذاتی حادثہ کی طرح ہے، کیونکہ وہ ہمارے بچوں کے استاذ تھے اور یہاں سے دلی تعلق ومحبت رکھتے تھے اور یہاں سے نکلنے والے مجلہ''فیضان کریم'' کی مجلس ادارت میں سرفہرست تھے،اللہ مولانا مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے، پسماندگان واہل تعلق کو صبر وسکون سے نوازے۔آمین!''

دعاؤں کا خواست گار

(پیر جی حافظ)حسین احمد قادری مجددی

(رئیس مدرسہ اسلامیہ قرآنیہ فیض العلوم،خانقاہ بوڑیہ)

’’اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو متعدد کمالات اور اوصاف سے نوازا تھا، خاندانی شرافت ونجابت اور علم وادب سے وابستگی ان کے خون میں شامل تھی، یقیناً انکی جدائی سے آپ ایک بہترین اور قابل رفیق سفر سے محروم ہو گئے ہیں، اللہ ہمارے برادر مکرم کی کامل مغفرت فرمائے اور آپ سمیت تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔‘‘

نیاز مند وشریک غم

(مولانا) راشد الحق سمیع

(مدیر اعلیٰ ماہنامہ الحق)

’’مولانا محمود حسن حسنی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی خبر سن کر بڑا صدمہ ہوا۔ موصوف بڑے ہی ذی علم اور صاحب قلم شخص تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں پڑھنے لکھنے کا خاص ذوق عطا فرمایا تھا، خصوصاً بزرگان دین اور سلف صالحین کی سیرت وسوانح پر آپ نے بڑا کام کیا ہے۔ والد ماجدؒ سے بھی موصوف کا بڑا گہرا تعلق تھا، والد محترم آپ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ آپ کی وفات سے یقیناً پڑھنے لکھنے والے حلقہ میں ایک بڑا خلا پیدا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ اس خلا کو پر فرمائے، پس ماندگان کو صبر دے اور ان کی مغفرت فرما کر اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!‘‘

والسلام

(مولانا) احمد ولی فیصل رحمانی

(امیر شریعت بہار، اڈیشہ وجھارکھنڈ)

’’آپ کے عزیز بھانجے برادر مکرم مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ دار فانی سے رخصت ہو گئے، اللہ رب العزت انہیں اپنی رحمت ومغفرت سے نوازے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!

میں جب بھی لکھنؤ قیام کے دوران آنجناب سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لیے ندوہ کے مہمان خانہ میں حاضر ہوا تو چاہے کوئی اور ہو یا نہ ہو، مرحوم کو آپ کے قریب موجود پایا۔ ان کے ہمیشہ ہمیش کے لیے رخصت ہو جانے کے سانحہ کا جو شدید اثر آپ کے دل و دماغ پر ہوگا، ہم دور رہ کر اس کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں، رب کریم آپ کو اور گھر والوں کو صبر کی قوت عنایت فرمائے۔ آمین!

وہ اس ناچیز سے بڑی محبت کرتے تھے، ''تاریخ اصلاح و تربیت'' (جلد اول) اپنے دستخط کے ساتھ ہدیۃً عنایت کی تھی۔ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آنجناب کی وقیع تصنیف ''رہبر انسانیت'' آپ سے دستخط کرا کے مجھے پیش کیا تھا۔ اس کے علاوہ مولانا عبدالباری ندوی پر ان کی کتاب ''حیات عبدالباری'' سے بھی استفادہ کر رہا ہوں۔ اللہ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین!''

محتاج دعا

(مولانا) ظفر الاسلام اصلاحی

(اسلام منزل، اقرأ کالونی - علی گڑھ)

''خانوادۂ حسنی کے ایک مخلص و متدین جواں سال عالم دین مولانا محمود حسنی ندوی کا انتقال یقیناً خانوادۂ حسنی کے لیے غم و اندوہ اور رنج و افسوس کا باعث ہے، ان کے انتقال پر ملال پر یقیناً حضرت والا پر بہت گہرا اثر ہوا ہوگا، کیونکہ حضرت والا کے رفیق سفر اور خدمت گار اور خادم خاص تھے۔ مرحوم و مغفور جوانی کے اندر ہی بڑے متقی و پرہیزگار تھے۔ اچھے مقرر اور اچھے انشاء پرداز بھی تھے۔ اتنی کم عمری میں ماشاء اللہ

انھوں نے کافی دینی خدمات انجام دی ہیں۔ اللہ جنت نصیب فرمائے۔ آمین!''

والسلام

(مولانا) عبدالقادر ڈانگی

(ناظم مدرسہ عربیہ تعلیم القرآن- بھٹکل)

''خانوادۂ حسنی کے چشم و چراغ مولانا محمود حسن حسنیؒ کی وفات حسرت آیات بلاشبہ ملت اسلامیہ کے لیے عمومی طور پر اور اہل ندوہ اوران کے تلامذہ کے لیے خصوصی طور پر ایک بہت بڑا خسارہ ہے۔ مرحوم بہت پر اثر شخصیت کے مالک اور ایک علم دوست تھے، کبھی بھی آپ کو علمی مشغلہ سے خالی نہیں دیکھا گیا، جب بھی آپ سے ملاقات ہوئی تو کوئی نہ کوئی کتاب آپ کے زیر تصنیف یا زیر ترتیب ضرور ہوتی، آپ نے اپنے چشمہ علم سے بہت سے طلبہ اور عوام الناس کو سیراب کیا اور جب تک آپ کا یہ علمی ذخیرہ موجود رہے گا، لوگ آپ کے اس چشمہ علم سے فیضیاب ہوتے رہیں گے۔ آپ تصوف کا بھی کافی ذوق رکھتے تھے، بہت متواضع، خاکسار، ملنسار اور تربیتی مزاج کے حامل تھے، احقر کو جب بھی ملاقات کا موقع ملا، بڑی محبتوں سے پیش آئے۔''

والسلام

(مولانا) محمد یاسین مظاہری کاکوسی

(دارالعلوم جامعہ نذیریہ، کاکوسی- گجرات)

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Volume: 14 ✥ Nov - Dec 2022 ✥ Issue: 11-12

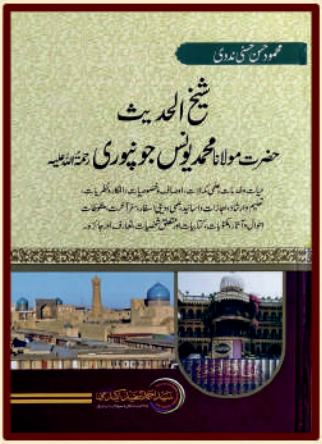

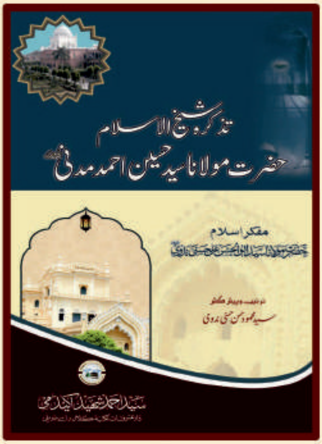

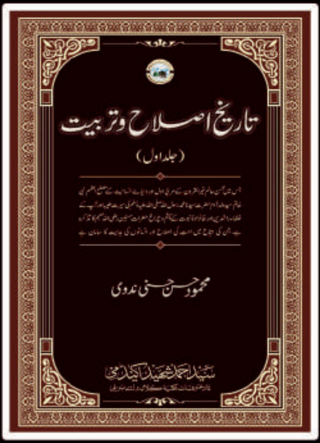

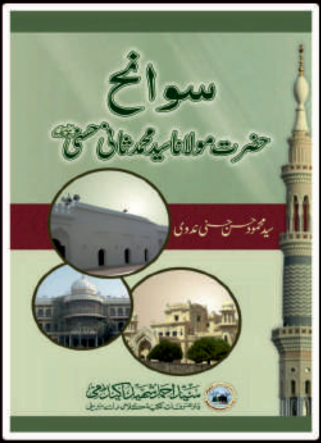

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9792646858
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)

Special Issue: Rs. 350/-